

تذکرہ شاہ ولی اللہ

پہلی

حضرت مولانا سید مناظر حسن گیلانی

نویسنہ پبلشرز

اردو بازار، لاہور

تَذْکِرَہ

حضرت شاہ ولی اللہ

حضرت مجدد اعظم کی زندگی اور اُن کے
فکر و نظر کی تشریح و توضیح

مؤلف

علامہ مناظر احسن گیلانی مرحوم

ناشر

نوید پبلشرز - اردو بازار، لاہور

جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ ہیں

نام کتاب :	تذکرہ حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ
مصنف :	علامہ سید مناظر احسن گیلانی
تعداد :	۵۰۰
اشاعت :	اگست ۲۰۰۳ء
ناشر :	نوید پبلشرز، اردو بازار لاہور

اسٹاکسٹ و تقسیم کار

مکتبہ سید احمد شہید

۱۰۔ الکریم مارکیٹ، اردو بازار، لاہور

فون: ۷۲۲۸۲۷۲-۷۲۲۳۸۶۲-۷۲۲۸۱۹۶

فہرست

صفحہ نمبر	عنوانات
۲۳	ہرچڑھاؤ کے بعد اُتار
۲۴	الف ثانی کے تجدیدی کارنامے کی انتہا
۲۵	قادی عالمگیری کی تدوین و تالیف میں عالمگیر کی شرکت
۲۶	عالمگیری کارناموں میں مجددی اشارات کا دخل
۲۷	عروج کے بعد نزول
۲۸	شاہ عبدالعزیز کے خونی آنسو یا نالہ ہائے نیم شبی
۳۰	دلی کے خونی فتنے اور شاہ ولی اللہ کی استقامت
۳۲	عالمگیر کے بعد فتنوں کا آغاز
۳۴	سکھ تحریک اور مرہٹہ تحریک
۳۵	پنجاب کی جدید تحریک خاکسار اور قدیم سکھ تحریک میں وجوہ مماثلت
۳۶	تذکرہ حضرت شاہ ولی اللہ
۳۷	سکھ تحریک کی سیاسی کروٹ اور اس کے فروغ کے اسباب
۳۷	مسلمانوں پر لرزہ خیز مظالم
۳۸	ایک ہندو مصنف کی شہادت
۳۸	زندہ جانوروں کے ہوئے
۳۹	انسانوں کے ہوئے
۳۹	سکھوں کا جذبہ قربانی
۳۹	باطل کے لئے مرجانے اور حق پر جان دینے کا فرق
۴۳	سکھ تحریک اور مرہٹہ تحریک کا ایک خاص فرق
۴۵	ہندوؤں کی موجودہ سیاسی سرگرمیوں کا رخ اور ان کا مقصد

کیا ہندوستان کی تقسیم سے ہمارے مرض کا علاج ہو سکتا ہے

۴۵

۴۷

مرہٹہ گردی

۴۷

دلی پر مرہٹوں کی تاخت اور دوسری اسلامی بستیوں کی بربادی

۴۸

عید قربان کے دن مسلمانوں کی قربانیاں

۴۸

حضرت شاہ صاحبؒ کا ایک تاریخی خواب

۵۱

شاہ صاحب کے اس خواب کی تعبیر، پانی پت کی مشہور تاریخی جنگ

۵۱

خواب اور بیداری کے واقعات کا انطباق

۵۲

لال قلعہ پر مرہٹوں کا قبضہ

۵۴

تنگ ظرف مرہٹوں کی لوٹ مار کی ذلیل نوعیت

۵۷

شاہ صاحب کے خواب کا دوسرا جزو اور ہندوستان پر غازی احمد شاہ ابدالی کا حملہ اور

مرہٹہ طاقت کی شکست

۶۲

شاہ ابدالی کا بے نظیر ایثار اور اس کا راز

۶۳

نقمت اور نعمت کے بعد بھی مسلمانوں کی غفلت اور خدا فراموشی

۶۴

شاہ ولی اللہ کی چیخ پکار اور خطرہ کا مسلسل الارم

۶۴

مسلمانوں کے مختلف طبقات کو شاہ صاحب کا پیغام اور مفصل پروگرام

۶۵

سلاطین اسلام سے خطاب

۶۶

امراء و ارکان دولت سے خطاب

۶۶

فوجی سپاہیوں سے خطاب

۶۷

اہل صنعت و حرفت سے خطاب

۶۸

مشائخ کی اولاد یعنی پیرزادوں سے خطاب

۶۹

غلط کار علماء سے خطاب

۷۰

دین میں تنگی پیدا کرنے والے واعظوں اور کج نشین زاہدوں سے خطاب

۷۱	عام امت مسلمہ سے جامع خطاب
۷۳	ہندی مسلمانوں کا جمود یا مرنے کا تہیہ
۷۴	قد رقی قانون کے مطابق اس خواب غفلت کی سزا اور انگریزی اقتدار کا آغاز
۷۴	سراج الدہلہ کی فوج پر کارتوسی بندوقوں کے ساتھ لارڈ کلائیو کا پہلا شب خون
۷۵	سراج الدہلہ کے لشکر میں ابتری اور قیامت کا نمونہ
۷۵	میر جعفر وغیرہ کی غداری اور جنگ پلاسی میں انگریزوں کی فتح
۷۶	سراج الدہلہ کا لرزہ خیز قتل، اپنے پایہء تخت مرشد آباد کے بازاروں میں سراج الدہلہ کی لاش
۷۶	بنگال، بہار، اڑیسہ کی دیوانی، کمپنی بہادر کے نام
۷۷	فرنگی ٹھیکیداروں کی نزاکت دماغی
۷۸	آخر عمر میں شاہ ولی اللہ کی دردناک وصیت
۷۹	۱۱۴۳ھ میں حالات کی نزاکت کے باوجود شاہ صاحب کے سفر حجاز کا اصل راز
۸۰	شاہ صاحب نے ہندوستان کو بالکل خیر باد کہہ کر حجاز میں اقامت نہ کی تھی
۸۱	شاہ صاحب کی ایک محیر العقول توقع
۸۲	شاہ صاحب اور نظریہ وطنیت
۸۳	حجازی تہذیب اور مسلمان
۸۵	اہل عجم کے فیشن اختیار کرنے والوں سے شاہ صاحب کی بے زاری
۸۶	شاہ صاحب نے ہندوستان کو کیوں نہیں چھوڑا؟
۸۶	درحقیقت کشمکش حیات سے کسی طرح پیچھا چھوٹ نہیں سکتا
۸۸	ہندوستان میں قیام اور مستقبل کا کام
۹۰	شاہ صاحب کے ہم عصر علماء و مشائخ کی کمزوریاں
۹۲	صوفیوں کی افسوسناک حالت

۹۴	”نمود و انمود“ کا فتنہ
۹۷	نجوم کے شعبہ دے اور کہانت کے کرشمے
۱۰۱	ام الفتن یعنی خانہ جنگی
۱۰۴	سادات بارہ کا فتنہ
۱۰۴	اس فتنہ کی اصل جڑ شیعہ سی اختلاف تھا
۱۰۵	ہندوستان میں شیعہ کے قدم
۱۰۶	اسلامی عقائد کے متعلق ایک عام غلط فہمی
۱۰۷	شہزادہ فرخ سیر کا بیدردانہ قتل
۱۰۸	شاہ عبدالرحیم کا ایک عجیب خواب
۱۰۹	رفع الدرجات اور رفع الدولہ کی تخت نشینی اور ان کے بعد محمد شاہ کا دور دورہ
۱۱۳	شاہ ولی اللہ کے درس حدیث کے لئے محمد شاہ کی طرف سے مکان کا عطیہ
۱۱۳	دلی المسمی دارالعلوم کی عمارت غدر میں بربادی ہوئی
۱۱۵	حافظ رحمت خاں وادی بریلی اور نجب الدولہ کی خدمت علم دین
۱۱۷، ۱۱۷	شاہ صاحب کے اصل کام کا آغاز اور دلی پر خونی نادر کی یلغار
۱۱۷	سیاسی شکست کا لازمہ و مافی غلامی
۱۱۹	علماء پر منطق و فلسفہ کے تسلط کی تاریخ، میر باقر داماد کا کچھ تعارف
۱۲۱	میر باقر کے ایک شاگرد ”صدر شیرازی“
۱۲۲	میرزا زاہد ہروی اور علم فقہ میں ان کی کمزوری
۱۲۳	معقولات میں مرزا صاحب کا غلبہ
۱۲۴	نادری حملے کے بعد ایرانی علوم و نظریات کا ہندوستانی علماء پر اثر
۱۲۵	نادر شاہ کا بے پناہ رعب
۱۲۵	شاہجہاں کی پوتی، نادر شاہ کے لڑکے کے نکاح میں

۱۲۶	ہندوستان میں روہیلہ پٹھانوں کا سیلاب
۱۳۰	یہاں تک کہ تاریخی مباحث کا مقصد اور حاصل
۱۳۱	فتنوں کے اس دور میں شاہ ولی اللہؒ کی آمد
۱۳۲	شاہ صاحبؒ کے والد شاہ عبدالرحیم کی شخصیت
۱۳۷	شاہ ولی اللہؒ کی ولادت سے پہلے شاہ عبدالرحیم کو ان کے کمالات کی بشارت
۱۳۸	کل ۶۱ سال کی عمر میں شاہ صاحب کا محیر العقول کام
۱۵۱	شاہ صاحب کے دادا کی تاریخی شجاعت
۱۵۹	سیاست اور اسلام کا واقعی تعلق، شاہ صاحب کی نظر میں
۱۶۲	شاہ صاحب کی جامعیت
۱۶۳	شاہ عبدالعزیزؒ کی جامعیت
۱۶۵	شاہ صاحب کی امتیازی شان اور آپ کے خاص کارنامے
۱۶۵	فقہی اختلاف میں نقطہ عدل
۱۶۹	صوفیائے عصر اور تصوف کی اصلاح
۱۷۰	شیعہ سنی نزاع کے متعلق شاہ صاحب کا کام
۱۷۱	یونانی فلسفہ کی بجائے ایمانی فلسفہ
۱۷۲	مغربی الحاد کے زہر کا تریاق اور امروزہ شبہات کا پیشگی جواب
۱۷۳	قرآن و حدیث کے تراجم کی بنیاد
۱۷۷	شاہ صاحب کے اش شش جہتی کارناموں پر اجمالی نظر
۱۷۹	شاہ صاحب کے طرز انشاء میں زبان نبوت کی جھلک
۱۸۰	شاہ صاحب کے سارے کام کی کل مدت
۱۸۱	شاہ صاحب کی عمر کے بارے میں اختلاف
۱۸۲	شاہ صاحب کی تاریخی ولادت اور وفات

۱۸۵	شاہ صاحب کی ان محیر العقول خدمات کا اصل راز
۱۸۷	شاہ صاحب کے اس خواب کی تشریح اور تعبیر
۱۸۷	شاہ صاحب کی زندگی پر حضرات حسنینؑ کی زندگیوں کا انطباق
۱۸۹	شاہ صاحب کے خاندان پر کر بلائی مصائب
۱۹۳	شاہ صاحب کے تجدیدی کارناموں میں فیض روح القدس کا دخل
۱۹۴	سفر حجاز کے بعد شاہ صاحب کی زندگی کا خاص دور
۱۹۶	ولی اللہی فیوض کی وسعت اور نوعیت
۱۹۶	ایک یمنی محدث کی شہادت، علامہ رشید رضا مصری کا بیان
۲۰۱	متن قرآن کے درس کے متعلق شاہ صاحب کی ہدایت
۲۰۲	شاہ صاحب کے باقیات، صالحات
۲۰۲	وفات سے پہلے چاروں صاحبزادوں کی خلافت
۲۰۳	چاروں صاحبزادوں کے باہمی تعلقات
۲۰۴	چاروں صاحبزادوں کی وفات میں عکسی ترتیب
۲۰۵	شاہ ولی اللہ کے مدرسہ کا حال اور غدر میں اُس کی بربادی
۲۰۶	ولی اللہی دارالعلوم پر مدرسہ رائے بہادر لالہ کشن داس کا تختہ

مولانا مناظر احسن گیلانی

حضرت مولانا گیلانی بندہ پر مولیٰ کے کرم خاص کی نشانی، پیدائش کے اعتبار سے قصبائی، مگر شہرت کے لحاظ سے عالمی، قد و قامت کے مختصر مگر فکر و نظر کے ناپید کنار سمندر، علم و بصیرت کے یگانہ مگر عام امور زندگی سے بیگانہ دماغ کے زیرک مگر دل کے دیوانے، ہوشیاری و مستی کا سنگم! میدانِ تقریر کے شہسوار اور تحریر کے سید القلم۔

مولانا گیلانی کی ابتدائی تعلیم اپنے گھر ہی پر ہوئی، پھر تقریباً نو برس تک ٹونک میں امام معقولات مولانا حکیم برکات احمد صاحب سے تلمذ کا شرف پایا، اس کے بعد منقولات کی تکمیل کے لئے دیوبند پہنچے اور شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ اور مولانا انور شاہ کشمیری جیسے اساتذہ کے کامیاب ترین شاگرد رہ کر سند فراغ حاصل کی، اس کے فوراً بعد اسی درس گاہ کے استاد بنا دیئے گئے اور رسالہ القاسم کی ادارت بھی مولانا ہی کے سپرد ہوئی۔

دو برس دیوبند میں رہے ہوں گے کہ جامعہ عثمانیہ حیدرآباد (دکن) کی طلب و اصرار پر ۱۹۲۰ء میں شعبہ دینیات کے لکچرار کی حیثیت سے یہاں پہنچے اور ترقی کرتے کرتے صدر شعبہ کی حیثیت میں ۱۹۲۹ء میں ریٹائر ہو گئے۔ ریاست حیدرآباد کے سقوط اور حالات کی ابتری نے مولانا کو دل گرفتہ کر دیا تھا۔ اس لئے لاچار وہ اپنے وطن گیلان لوٹ گئے اور اسی عزلت میں ۵ جون ۱۹۵۶ء والی شب کو مولانا اس دارالحسن سے ہمیشہ کے لئے چھٹکارا پا لیا۔ رحمۃ اللہ علیہ رحمۃً واسعۃً۔

حضرت گیلانی کی موت ایک کرامت بن کر آئی، مولانا کے بھائی مکارم احسن صاحب کا بیان ہے کہ مرض الموت میں اکثر یہ فرمایا کرتے تھے کہ ”جنت میں کوئی بوڑھا نہ جائے گا، بلکہ ہر شخص جوان ہو کر جائے گا۔ چنانچہ جیسے جیسے مولانا کا وقت آخر قریب آتا گیا ان میں جوش و مسرت کی کیفیت بڑھتی ہی چلی گئی یہاں تک کہ جس رات آخرت کو کوچ کرنے والے تھے اس رات تو فرط مسرت سے بے قابو ہو ہو جا رہے تھے اور اسی عالم فرح میں بظاہر سو بھی گئے مگر جب صبح ان کو دیکھا گیا تو وہ رخصت ہو چکے تھے اور حیرت کی بات یہ تھی کہ بوڑھے راہی

۱۔ مولانا کا مولد قصبہ گیلانی (ضلع پٹنہ، بہار) جس کی نسبت سے گیلانوی لکھنا زیادہ صحیح ہے مگر مولانا رحمۃ اللہ خود کو محض

گیلانی ہی لکھتے تھے، مولانا کا سنہ پیدائش ۱۸۹۳ء ہے

۲۔ صدق جدید ۲۱ ستمبر ۱۹۵۶ء

کے چہرہ پر گوشت تر و تازہ اس کی سفید ڈاڑھی بالکل سیاہ اور اس کا جسم نرا از گداز تھا، کسی کی ایک آنکھ نے دیکھا ہوتا تو دھوکہ کا گمان بھی ہوتا مگر قصبہ کے مسلمانوں نے اس ”خلد آشیانی“ کی یہ جوانی دیکھی اور اس دید میں کیف روحانی پایا۔ سبحان اللہ و بحمدہ کیا۔ حیات آفریں موت پائی۔

ع ”مرگ کہ ز اہداں بہ دعا آرزو کنند“

مولانا گیلانی کے قلمی افادات کا آغاز ان کی طالب علمی ہی کے زمانہ سے ہوا اور اس کا انجام موت پر! اس ۴۰ سالہ عرصہ میں مولانا نے مختلف علوم و فنون پر متعدد کتابیں اور سینکڑوں مضامین لکھے اور ہر تحریر میں اپنے ذہن کی اُتچ، فہم و فراست کی بلندی، مطالعہ کی وسعت، نظر کے عمق اور قوت اجتہاد کے زور کے پائیدار نقوش چھوڑے، مولانا کی سب سے پہلی کتاب ابوذر غفاریؓ کو دیکھ کر حکیم الامت مولانا اشرف تھانویؒ نے فرمایا تھا کہ اس کتاب کا مصنف آگے چل کر محقق نکلے گا، چنانچہ یہی ہوا اور بعد کو علمائے عصر نے اس کی تصدیق کی۔

مولانا کے جملہ مضامین اور تالیفات کا احاطہ تو یہاں مشکل ہے البتہ چند معرکہ الآرا

تصنیفات کے نام یہ ہیں:-

النبی الخاتم، الدین القیم، تدوین قرآن، تدوین حدیث، تدوین فقہ (غیر مطبوعہ) اسلامی معاشیات، حضرت امام ابو حنیفہ کی سیاسی زندگی، تذکرہ شاہ ولی اللہ، نظام تعلیم و تربیت، مقالات احسانی، تفسیر سورہ کہف (غیر مطبوعہ) وغیرہ!

حضرت گیلانی کی علمی منزلت اور ان کی تحریر کے زور اور اس کی حلاوت کا تو ایک عالم قائل ہے۔ مگر اس کے باطنی سبب یعنی مولانا کے عرفانی مرتبہ سے کم لوگ آشنا ہیں، حضرت گیلانی ایک سچے درویش تھے۔ قادریہ اور چشتیہ سلسلوں میں ان کو حضرت حبیب العیدروس بغدادی ثم حیدر آبادی اور حضرت مولانا محمد حسین صاحب حیدر آبادی سے خلافت حاصل تھی، وہ عشق نبوی اور حب الہی سے ہمیشہ سرشار رہتے تھے، ان کو حضرت شیخ محی الدین ابن عربی قدس سرہ کے مسلک و مشرب سے خاص مناسبت تھی اور اس کے وہ خاص ترجمان بھی تھے اور جو مناسبت خاص حضرت گیلانی کو ازراہ تصوف شیخ اکبر قدس سرہ سے تھی۔ ویسی ہی مناسبت تامہ علمی و فکری راہ سے حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ سے تھی جس کے ثبوت میں یہ تذکرہ شاہ ولی اللہ بہت کافی ہے اور اہل نظر کے سامنے پیش ہے۔ ”عمیاں را چہ بیاں“۔

خاکپائے بزرگاں غلام محمد

حضرت شاہ ولی اللہ

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی المتوفی ۱۱۷۶ھ ان چند اصحاب فکر علماء میں سے ہیں، جنہوں نے بارہویں صدی ہجری میں دنیائے اسلام کی جو فکری اور ذہنی کیفیت تھی، اس کا گہرا مطالعہ کیا تھا اور اس وقت کے حالات سیاسی کو بھپورے غور و تعمق سے دیکھا تھا۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ شاہ صاحب نے افراد اور جماعتوں کی حیات کے لئے ایک قابل غور و فکر نقشہ دین اسلام کی سرمدی اور لاہوتی روشنی میں مرتب فرمایا اور نہ صرف مرتب فرمایا، بلکہ اسے پوری جرأت و ہوشمندی کے ساتھ دنیا کے سامنے پیش بھی کیا، ظاہر ہے کہ ہر گوشہ سے اس کی مخالفت ہونا ہی تھی، ہوئی اور خوب ہوئی۔ شاہ صاحب کو اس کی وجہ سے بہت سی تکالیف سے گزرنا پڑا۔ حق تو یہ ہے کہ بلا مخالفت کے صداقت نمایاں کہاں ہوتی ہے۔

اہل حق پر مخالفتوں کے پہاڑ ٹوٹا ہی کرتے ہیں۔ شاہ صاحب پر بھی ٹوٹتے رہے لیکن یہ اپنے کام میں لگے رہے۔ اور ایسے لگے رہے کہ بعد کی آنے والی نسلوں نے ان کے پیغام کو رہنما تسلیم کر ہی لیا۔ اور شاہ ولی اللہ کو آج ہماری ذہنی و فکری دنیا میں وہ مقام حاصل ہے جو برصغیر کے کسی دوسرے عالم کو حاصل نہیں۔

شاہ صاحب کون تھے، کیا کارنامے انجام دیئے، کن کن حالات سے گزرے اور اس وقت کی سیاسی و ذہنی فضا کیسی تھی، افکار میں اور اعمال میں، بلکہ نیزوں اور تلواروں میں، توپوں اور بندوقوں میں کیا ٹکراؤ ہوئے، کیوں ہوئے؟ اور اس کے نتائج کیا نکلے، شاہ صاحب کا اصل پیغام کیا تھا، اور اس کی خصوصیات کیا ہیں؟ یہ اور اس قسم کے سوالات عہد حاضر کے ایک ماہر عالم اور محقق مولانا مناظر حسن صاحب گیلانی مرحوم کے قلم سے پوری تفصیلات کے ساتھ دل نشین انداز میں دیکھئے، یہ کتاب مولانا مرحوم کی تصانیف میں ایک خاص انداز و اہمیت کی حامل ہے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

یہ مسئلہ بڑی تفصیل و وسط کا طالب ہے کہ یورپ کی موجودہ بے دینی خود اس کے اس دین کی پیداوار ہے جس کی بنیاد عقیدہ ”ولدیت“ پر قائم تھی۔ پروٹسٹنٹ فرقہ کی تحریک گو ابتداء میں صرف کلیسیاء کے جبر و تسلط کے رد عمل کی شکل میں ظاہر ہوئی لیکن بتدریج بڑھتے ہوئے یہی تحریک مطلقاً مذہب اور دین کی بنیادوں پر ضرب بن گئی۔ کلیسا مذہب کی جس تشریح کو واجب

۱۔ سورہ کہف جس کے متعلق صحیح حدیثوں میں آیا ہے کہ دجالی فتنے سے جو محفوظ رہنا چاہتا ہے اس کو چاہئے کہ اس سورہ کی ابتدائی یا آخری آیتوں کی تلاوت کرے سورہ کی ابتداء میں عیسائیوں کے اس عقیدہ کا کہ خدا کیلئے یہ ولد (بیٹا) ثابت کرتے ہیں اس کا تذکرہ کرنے کے بعد نسل انسانی کے سب سے بڑے ہی خواہ رحمۃ اللعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کر کے یہ ارشاد ہوا ہے کہ جن آثار ”یعنی نتائج کو چھوڑ کر عقیدہ ولدیت والے دنیا سے جائیں گے اور تمہاری بات یعنی قرآنی تعلیم نہ مانیں گے اس واقعہ پر کیا تم اپنے آپ کو ہلاک کر دو گے“ حاصل یہ ہے ان قرآنی الفاظ کا یعنی ”فلعلک باخع نفسك وعلی آثارهم ان لم یؤمنوا بهذا الحدیث اسفا“ میرے نزدیک آثار جنہیں عقیدہ ولدیت والے دنیا میں چھوڑنے والے تھے، یہی وہ تراشے ہیں جنہیں یورپ اور یورپ کے زیر اثر ساری دنیا پیش کر رہی ہے، ہوا یہ کہ بجائے مخلوق کے حضرت مسیح علیہ السلام کو جب خدا کا بیٹا ٹھہرایا گیا تو قاعدہ ہے کہ انسان کا بیٹا انسان ہی ہوتا ہے، گھوڑے سے گھوڑا پیدا ہوتا ہے، خدا کے بیٹے کو بھی ناگزیر تھا کہ خدا ہی مانا جائے اور اس میں وہ ساری صفات تسلیم کئے جائیں جو خدا کی خصوصیات ہیں خدائی صفات کے ساتھ انسانی شکل میں مسیح کا وجود عیسائیوں کے لئے باعث فتنہ بن گیا۔ خدا سے بھی بنی آدم نے اس دلچسپی کا اظہار نہیں کیا تھا، جتنی دلچسپی عیسائیوں کو مسیح علیہ السلام کی ذات سے ہوئی۔ پھر مسیح کے نام سے پوپ کا عہدہ جب قائم ہوا اور پوپ کی راہ سے کلیسا کا نظام عیسائیوں پر مسلط ہوا، اس نے عیسائیوں کی جان و مال، عزت و آبرو کے ساتھ وہ کھیل کھیلے جس کی دردناک داستان سے پوپ کی تاریخ بھری ہوئی ہے، آخر صدیوں کی مصیبت برداشت کرنے کے بعد پروٹسٹنٹ تحریک کی شکل میں کلیسائی اقتدار کا رد عمل ہوا۔ ابتداء میں گو مذہب کی کلیسائی شکل کے خلاف یہ رد عمل تھا لیکن بات بڑھتی چلی گئی۔ اور آخر میں مطلقاً مذہب اور دین کے رد عمل کے قالب میں یہ تحریک ڈھل گئی۔ مذہب کے انکار کا لازمی نتیجہ تھا کہ انسان، انسان باقی نہ رہے اور ایک ترقی یافتہ حیوان سے زیادہ اس کی وقعت باقی نہ رہے۔ انسانیت کے متعلق حیوانات کے اسی خیال نے ان امور کی آبیاری کی۔ جن میں یورپ و امریکہ کے باشندے مبتلا ہیں۔ میرے خیال میں ”علی آثارہم“ میں آثار کے لفظ سے ان ہی چیزوں کی طرف قرآن نے اشارہ کیا ہے ان باتوں کی پوری تفصیل ہماری کتاب سورہ کہف کی تفسیر میں مل سکتی ہے۔

التسلیم والتعمیل قرار دیتا تھا۔ شروع میں تو اس احتجاجی تحریک کو اسی سے اختلاف تھا۔ اگرچہ یہ اختلاف بھی معمولی اختلاف نہ تھا۔ بڑی بڑی خوں ریزیاں اس آویزش کی بدولت صدیوں یورپ میں ہوئی ہیں۔ جو عوام اور کلیسا کے درمیان قائم ہو گئی تھی، وہی زمانہ تھا جب یورپ کی قومیں کھولی گئیں اور دنیا کے مختلف علاقوں میں بحری راستوں سے ان کا داخلہ شروع ہوا۔ شروع میں گوان کی حیثیت زیادہ تر سودا گروں اور بحری تاجروں کی تھی۔ لیکن دوسرے ارادے بھی ان کے سینوں میں پوشیدہ تھے، اسی لئے علاوہ تجارت کے مختلف قسم کے دوسرے کاروبار کا سلسلہ بھی ان ممالک میں جاری کر دیتے تھے۔ جہاں گھس پڑنے کا ان کو موقع مل جاتا تھا۔ کاروبار کے اس دوسرے سلسلہ میں ایک اہم سلسلہ اپنے عقائد اور خیالات کی اشاعت کا بھی ان کے سامنے تھا۔ اسی سے اندازہ کیجئے کہ مغل دربار کے امیر دانشمند خاں جن کی وفات آج سے تقریباً تین سو سال پہلے ۱۰۸۱ ہجری میں ہوئی یہ شاہجہاں اور عالمگیر دونوں بادشاہوں کے زمانے میں بڑے بڑے عہدوں پر سرفراز رہے۔ علاوہ سیاسی مہارت کے علم و فضل میں بھی ان کا پایہ بہت بلند تھا۔ ملا عبدالحکیم سیالکوٹی اور دانشمند خاں میں بعض علمی مسائل پر شاہجہاں کے سامنے بادشاہ کے اشارے سے مناظرے بھی ہوئے۔ بہر حال کہنا یہ ہے کہ ماثر الامراء میں ان کے حالات کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

گوئند کہ خان مذکور در انجام عمر بعلم اہل فرنگ مائل گردید و اکثرے از احکام تحریفات آن جماعت تکراری نمود (ج ۲/ص ۳۲) ﴿

”کہتے ہیں کہ خان موصوف یعنی دانشمند خاں آخر عمر میں اہل فرنگ کے علم کی طرف مائل ہو گئے تھے اور اہل فرنگ کے تحریفات (یعنی مذہب کے متعلق جو خیالات تھے) ان کو دہراتے رہتے تھے۔“

جس سے معلوم ہوتا ہے کہ شاہجہاں بادشاہ کے زمانے ہی سے ہندوستان کے باشندوں پر مغربی خیالات و عقائد کا اثر پڑنا شروع ہو گیا تھا۔ یورپ میں اس وقت کلیسا کے خلاف جو کچھ ہو رہا تھا ناممکن تھا کہ اس ملک سے آنے والے لوگ اس کا تذکرہ ان لوگوں سے نہ کرتے، جن سے ان کا ملنا جلنا ہوتا تھا۔ خانی خاں نے فرنگیوں کا تذکرہ کرتے ہوئے اپنی تاریخ

میں لکھا ہے کہ ایک طبقہ تو ان لوگوں کا ہے جو حضرت مسیح اور مریم کی مورتیاں لکڑی وغیرہ سے بنا کر پوجتے ہیں۔ خانی خاں کے الفاظ یہ ہیں:-

”معبد خانہ آتہا برخلاف بت خانہ ہنود بحسب ظاہر در کمال صفائی کہ شمعہائے کافوری در آنجامی سوزند بنظر آمدہ صورت حضرت و مریم را علیٰ نہینا علیہا الصلوات والسلام باعتبار و فاسد خود بہ چندیں صورت از چوب و رنگ و روغن بزینت تمام ساخته اند“ (ج ۲/ص ۴۲۹)

”ان عیسائیوں کی عبادت گاہ ہندوؤں کی عبادت گاہوں کے برخلاف بڑی صاف ستھری رکھی جاتی ہے اور کافوری شمع دن کو بھی جلتے ہوئے میں نے دیکھا۔ حضرت عیسیٰ اور مریم کی صورت لکڑی سے بنا کر اور رنگ و روغن کر کے سجا کر انتہائی زینت کے ساتھ رکھتے ہیں۔“

خانی خاں نے اسی کے بعد لکھا ہے کہ

”امادر کلیسائے انگریز کہ آتہا نیز نصرانی اتد صورت بطریق اصنام نمی باشد“ (ص ۴۶۹)

”لیکن انگریز کے گرجوں میں مورتیاں اور تصویریں بطور بتوں کے نہیں ہوتیں حالانکہ نصرانی ہی ہیں۔“

آگے اس کے بھی خانی خاں نے تصریح کی ہے:

”محرر اوراق مکرر وراں مکاں و بنا در دار و گشتہ و با علمہائے آتہا صحبت داشتہ مذاکرہ نمود۔“ (ج ۲/ص ۴۶۹)

”محرر اوراق (یعنی خود مصنف) بسا اوقات ان کی عبادت گاہوں اور ان بندرگاہوں میں جہاں ان کے گرجے ہیں، پہنچا ہے اور ان لوگوں کے علماء سے ملنے جلنے کا موقع

اس موقع پر میکزی نے اپنی مشہور کتاب ”اعلاقیات“ اٹھکس میں جو یہ لکھا ہے سننے کے قابل ہے۔ لکھتا ہے ”کہ خدائے مسیح اور مریم کی تصویریں کیسی ہی اعلیٰ درجہ کی بنا کر ہمارے سامنے کیوں نہ پیش کی جائیں مگر ہمارا سر عبودیت ان کے سامنے نہیں جھک سکتا۔“ ص ۳۹۰ یہ مشہور فلسفی ریکل کا قول ہے لیکن یہ کیفیت یورپ کے بت پرستوں میں کس کی آواز نے پیدا کی؟

بھی اس کو ملتا رہا۔ ان کے علماء سے بحث و مباحثہ بھی کرتا رہا ہے۔

یہ چند سرسری شہادتیں ہیں جن سے میں ثابت کرنا چاہتا ہوں کہ سیاسی اقتدار و تسلط سے پہلے اور بہت پہلے جس وقت اس کا سان و گمان بھی نہ تھا کہ سودا گروں کا یہ گروہ مشرقی ممالک پر بادشاہی کرنے کے لئے بلایا گیا ہے۔ یعنی مغل حکومت جب اپنی قوت و اقتدار کے عہد شباب میں تھی۔ اسی زمانے میں یورپ کے عقائد و خیالات کا اثر مشرق کے باشندوں پر پڑنے لگا تھا۔ خصوصاً جہاں بندرگاہیں تھیں یا تجارتی کوٹھیاں یورپ والوں کی قائم تھیں۔ وہاں جن لوگوں کی آمد و رفت تھی، ان کے نہ متاثر ہونے کی کوئی وجہ بھی نہیں ہو سکتی تھی۔ اور بھی لوگ جب اپنے اپنے اوطان واپس ہوتے تھے دوسروں تک بھی ان خیالات کو وہ پہنچاتے تھے۔

ماننے والے اس کو مانیں یا نہ مانیں لیکن ان کا انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ایران کے شیعوں میں خصوصاً اور عام شیعوں میں عموماً ”اخباریہ“ کے نام سے جس تحریک کا آغاز دسویں صدی ہجری کے اختتام اور گیارہویں کے شروع میں ملا محمد امین کے ہاتھوں ہوا اور صاحب نجوم السماء نے جن کے متعلق یہ الفاظ لکھے ہیں کہ:-

”اوست اول کے کہ دروازہ طعن پر مجتہدین کشاد و فرقہ ناجیہ امامیہ اثنا عشریہ رابد و قسم منقسم ساخت۔ یکے اخباری و دیگر مجتہدی“ (ص ۱۴)

”ملا محمد امین پہلے آدمی ہیں جنہوں نے مجتہدین پر طعن کا دروازہ کھولا اور فرقہ ناجیہ امامیہ اثنا عشریہ یعنی شیعوں کو دو حصوں میں منقسم کر دیا۔ ایک اخباری (جو ملا امین کے پیرو تھے) اور دوسرے مجتہدی (یعنی مجتہدین کو ماننے والے)۔“

ہم اس تحریک کے متعلق نہیں کہہ سکتے کہ کلیسا اور پروٹسٹنٹ فرقہ کی باہمی آویزش سے جو مسائل یورپ میں پیدا ہوئے تھے اور مغربی سودا گروں کی راہ سے مشرقی ممالک میں ان کے چرچے پہنچ رہے تھے۔ ان سے ایران کی یہ اخباری تحریک کوئی تعلق نہیں رکھتی اور ایران تو ایران، خود ہندوستان کا مشہور تجارتی شہر برہان پور جو مغلوں کے عہد میں ہندوستان کا گویا لنکا شائر یا مانچسٹر ہونے کی حیثیت، صنعت پارچہ باری میں رکھتا تھا۔ اور بکثرت اسی تعلق سے یورپ کے تاجروں کی آمد و رفت کا یہ آماج گاہ بنا ہوا تھا۔ ہم دیکھتے ہیں کہ عہد جہانگیری کے ایک

عالم قاضی نصیر الدین خلف سراج الدین جن کی وفات ۱۰۸۱ھ میں ہوئی ہے۔ ان کے متعلق بھی تاریخ نے یہ یادداشت چھوڑی ہے کہ:-

”قاضی ہر قسم حدیث راتر جیح می داؤد انکار قیاس می نمود“ (تاریخ برہانپور)
 ”قاضی نصیر الدین ہر قسم کی حدیثوں کو ترجیح دیتے تھے اور قیاس کا انکار کرتے تھے۔“

ظاہر ہے کہ مجتہدین پر زبان لعن و طعن دراز کرنا اور اخبار یعنی براہ راست حدیثوں سے نتائج نکال کر ان ہی پر عمل کے لئے لوگوں کو آمادہ کرنا، جو شیخ امین ایرانی کی تحریک تھی، یا قاضی نصیر کا قیاس سے منکر ہو جانا اور حدیثوں سے مسائل کے پیدا کرنے کا دعویٰ کرنا اس میں اور رومن کی تھولک (یعنی کلیسا کے ماننے والے عیسائیوں) میں اور پروٹسٹنٹ فرقہ میں جو جھگڑا تھا، دونوں میں اس کے سوا اور کیا فرق ہے؟ کہ یورپ میں جو کچھ ہو رہا تھا اس کا تعلق عیسائی مذہب سے تھا اور ایرانی ہندوستان میں اس جھگڑے کا تعلق اسلام سے تھا۔ پروٹسٹنٹ عقیدے کے ماننے والے بھی تو کہتے تھے کہ ہم کلیسا کے ان اجتہادی نتائج کے ماننے پر مجبور نہیں ہیں۔ جو تورات و انجیل سے علماء کلیسا نے پیدا کئے ہیں بلکہ براہ راست ہر عیسائی کو حق حاصل ہے کہ وہ خود تورات اور انجیل کو سمجھے اور خود آزادانہ نتائج پیدا کرے۔ الغرض قصہ ایک ہی تھا۔ قصہ کا تعلق

۱۔ قاضی نصیر الدین اور ان کے خسر شیخ علم اللہ میں اسی تقلید و عدم تقلید کے مسئلہ میں بڑے جھگڑے ہوئے، لکھا ہے کہ خان خاناں، قاضی نصیر الدین کا حامی تھا اسی لئے کوئی گزند ان کو نہیں پہنچا۔ بعد کو جب خان خاناں کی کمان اتر گئی اور جہانگیر نے حکم دیا کہ قاضی نصیر اور شیخ علم اللہ دونوں کو دہلی روانہ کر دیا جائے، تب دونوں صاحب برہانپور سے بھاگ گئے قاضی نصیر مکہ معظمہ چلے گئے، پانچ سال کے بعد واپس ہندوستان لوٹ رہے تھے کہ ان کے جہاز کو فرنگ کے جہازوں نے پکڑ لیا۔ عجیب بات یہ نقل کی ہے کہ قاضی نصیر کے علم و فضل سے واقف ہونے کے بعد فرنگی قاضی صاحب کو ”نزد بادشاہ خود بروند“ واللہ اعلم اس ”بادشاہ“ کے لفظ سے کیا مراد ہے۔ کیا ان کو یورپ لے گئے بظاہر یہ فرنگی، پرنگالی معلوم ہوتے ہیں جنہوں نے بحیرہ ہند اور بحیرہ عرب کو اس زمانے میں اپنی تاخت و تاراج کا نشانہ بنا رکھا تھا۔ آگے اسی کتاب میں ہے کہ قاضی نصیر جب فرانگیوں کے بادشاہ کے پاس پہنچے تو آداب شاہی بجا نہ لائے۔ پوچھا گیا تو جواب دیا کہ ہم سے یہ باتیں نہیں ہو سکتیں۔ فرنگی بادشاہ نے ان کو چھوڑ دیا۔ رہا ہو کر یہ بیجا پور آئے، ابراہیم عادل کا زمانہ تھا۔ کئی میل آگے بڑھ کر اس نے استقبال کیا۔ پھر یہ شاہجہاں کے پاس پیش ہوئے جو برہانپور میں صوبیدار ہونے کی حیثیت سے آیا تھا۔ شاہجہاں نے جہانگیر کے پاس بھیج دیا۔ جہانگیر نے بھی ان کو احترام کے ساتھ رکھا اور چند دن بعد وطن برہانپور واپس کر دیا۔ وہیں ۱۰۸۱ھ میں وفات پائی۔ (ص ۱۵۳ تاریخ برہانپور)

مغرب میں عیسائی مذہب سے تھا اور مشرق میں اسلام سے تھا۔ اسی بنیاد پر میں تو نہیں سمجھتا کہ عرب کی اس تحریک کے متعلق جو نجدی عالم شیخ محمد بن عبدالوہاب کی طرف منسوب ہو کر وہابی تحریک کے نام سے مشہور ہوئی ہے اس کے متعلق طامس پیٹرک نے جو یہ لکھا ہے:-

وہابیت کو بسا اوقات اسلام کا پروٹسٹنٹ فرقہ بتایا جاتا ہے۔ اگرچہ فرقہ یہ ہے کہ عیسائی پروٹسٹنٹ مقدس الہامی کتابوں کی اعلیٰ حیثیت تسلیم کرتے ہوئے روایتی تعلیمات کو مسترد کرنا بھی ضروری خیال کرتے ہیں۔

اس کے برعکس وہابیت قرآن کے ساتھ ساتھ حدیثوں میں بھی زور دیتی ہے۔ اس کے انکار کرنے کی کوئی معقول وجہ ہو سکتی ہے۔ بلکہ ”اگرچہ“ کے بعد مصنف مذکور نے جو کچھ لکھا ہے۔ اس میں وہ ”روایتوں“ اور ”حدیثوں“ کے فرق کو سمجھ نہیں سکا ہے حدیث کی حیثیت ہمارے ہاں علماء کی روایتوں کی نہیں ہے۔ بلکہ وہ تو براہ راست پیغمبر اسلام کے ملفوظات، اعمال و افعال وغیرہ کے مجموعہ کا نام ہے۔“

روایت کے لفظ سے حدیث کا غلط ترجمہ یورپ میں جو پھیل گیا ہے۔ یہ مغالطہ اسی غلط ترجمہ کا نتیجہ ہے۔

بہر کیف شیخ عبدالوہاب نجدی کے متعلق جب ہمیں معلوم ہے کہ ایک زمانے تک ان کا قیام مشرق و مغرب کی کڑی ملائے والی مشہور تاریخی بندرگاہ بصرہ میں رہا ہے اور بقول ان کے ایک عقیدت مند کے:-

”بصرہ میں یہ جذبہ (یعنی جذبہ وہابیت) اور تیز ہو گیا۔“ (ص ۲۵) اور اسی تیزی کا نتیجہ یہ ہوا کہ بصرے میں ”ان کو طرح طرح کی تکلیفیں جھیلنی پڑیں اور آخر بصرہ انہیں چھوڑنا پڑا۔“ (ص ۲۵ کتاب محمد بن عبدالوہاب)

بہر حال کچھ بھی ہو واقعات اس کے شاہد ہیں کہ سیاسی اقتدار حاصل کرنے سے پہلے اور بہت پہلے مشرق پر بتدریج مغرب اپنا ذاتی تسلط قائم کرتا چلا جا رہا تھا اور مسلمانوں میں مختلف

بصرہ آج ہی نہیں زمانہ سے اپنے محل وقوع کی خصوصیات کی وجہ سے مختلف مذہبی فرقوں کے خروج کا مرکز بنا رہا ہے۔ اسلام کی ابتدائی صدیوں میں عموماً اسلامی فرقے بصرہ ہی میں پیدا ہوئے جس کے اسباب طویل ہیں۔ کسی دوسری کتاب میں ان اسباب کی تفصیل کی جائے گی۔

قسم کی مذہبی بے چیدیاں پچھلی چند صدیوں میں جو رونما ہوئیں ان میں بہت کچھ دخل اسی ذہنی تسلط کی تدریجی ترقی کو ہے، جیسے جیسے سیاسی اقتدار کی قوت میں اضافہ ہوتا چلا جاتا تھا۔ اسی نسبت سے ذہنی تسلط کے پنجوں کی گرفت بھی مضبوط سے مضبوط تر ہوتی چلی جاتی تھی۔ گویا یوں سمجھنا چاہئے کہ یورپ کی تلوار، یورپ کے قلم اور زبان کے پیچھے پیچھے مشرقی ممالک میں آئی ہے اور کسی نہ کسی حیثیت سے سارے اسلامی ممالک یورپ کے ان ذہنی تغیرات و انقلابات سے متاثر ہوتے چلے جاتے تھے۔ اس وقت خطرہ پیدا ہو گیا تھا کہ اگر ان مغربی خیالات کی اثر اندازیوں کی رفتار کا یہی حال رہا تو ایک طرف سلبی نتیجہ تو اس کا یہ ہوگا کہ سینکڑوں بلکہ ہزاروں سال سے بھی زیادہ زمانہ میں دنیا کے مختلف حصوں میں مسلمانوں کے بہترین دماغوں نے اسلام کو سمجھ کر مختلف پہلوؤں سے اس کی تشریح و تعبیر کی ہے جن سے کتب خانوں کے..... کتب خانے بھرے ہوئے ہیں۔ آن واحد میں سب ملیا میٹ ہو کر رہ جائیں گے۔

ابو حنیفہ، شافعی، مالک، احمد بن حنبل اور ان بزرگوں کے ماننے والے علماء نے فقہ کی تدوین و تربیت میں جو نکاحیاں کی ہیں سب کان لم یکن ہو کر رہ جائیں گی اور فقہ ہی کیا مسلمانوں کا تصوف، مسلمانوں کا کلام اور ان کے سوا ان ہی علوم کے معاون فنون جنہیں خون جگر پلا پلا کر مسلمانوں کے اہل علم نے پالا تھا ان کی کوئی وقعت باقی نہ رہے گی اور اس سلبی خطرے کے ساتھ دوسرا اثباتی خطرہ اس لازمی فتنے کا تھا، جس کا پھوٹ پڑنا ایسی حالت میں ناگزیر ہے۔

میرا مطلب یہ ہے کہ اسلامی دین میں دنیا کی قومیں جب ابتدائی داخل ہوئی تھیں تو ہر قوم اپنے ساتھ موروثی جراثیم لے کر داخل ہوئی۔ اسلام کی ابتدائی چند صدیاں اس لحاظ سے بڑی نازک تھیں کہ نو مسلموں کا یہ گروہ چاہتا تھا کہ اسلامی مسلمات اور اپنے موروثی خیالات میں مصالحت اور مطابقت پیدا کر کے کوئی ایسی صورت نکالی جائے کہ آبائی مالوفات سے بھی بالکل تعلق منقطع نہ ہو اور ہم مسلمان بھی باقی رہیں۔ اسلام کی ابتدائی صدیوں میں فرقہ بندیوں کی جو بھرمار نظر آتی ہے۔ منجملہ دوسرے اسباب و وجوہ کے ایک بڑا سبب اُن کا یہ بھی تھا۔ لیکن بتدریج آبائی خیالات و نظریات سے اُن کی پچھلی نسلوں کے تعلقات مضحل ہوتے چلے گئے اور ”اہل السنّت والجماعت“ کی شکل میں مسلمانوں کی اکثریت خالص اسلامی مطالبات کے باعث

کامیابی ہوگئی۔ اس کے بعد فرقہ بندیوں کے سارے قصے محض کتابوں کی تاریخ داستان بن کر رہ گئے۔ نہ فرقے باقی نہ رہے نہ ان کی کتابیں باقی رہیں یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ ابتدائی صدیوں کے فرقوں میں سب سے بڑا امنہ زور، صاحب قلم بلکہ بعض اوقات صاحب سیف بھی معتزلہ فرقہ تھا۔ لیکن معتزلہ کا یہ حال ہے کہ ان کے عقائد و خیالات کی کتاب کیا کتاب کے کسی ورق کا ملنا بھی دشوار ہے۔ جو کچھ اس فرقے کے متعلق رکھتی ہے۔ زیادہ تر وہ اہل سنت کی کتابوں ہی سے ماخوذ ہے۔ ترویج و اصلاح کے لئے لوگوں نے ان کے خیالات نقل کئے ہیں۔ یا عقائد و اعمال کے علاوہ کسی دوسرے فن مثلاً تفسیر یا لغت وغیرہ میں ایک دو پچی کھچی کتابیں معتزلہ کی رہ گئی ہیں جن میں چھپا چھپا کر کہیں کہیں اپنے عقائد بھی ان کے مصنفوں نے شریک کر دیئے ہیں۔

خیر یہ داستان تو طویل ہے کہنا یہ ہے کہ گھل گھلا کر سارے اسلامی فرقے چوتھی پانچویں صدی سے وحدت کے نقطہ پر جمع ہو گئے۔ وہی اہل السنۃ والجماعت کے نام سے آج دنیا میں مشہور ہیں۔ حیرت ہوتی ہے کہ دنیا کے مسلمان جن کی تعداد چالیس پچاس کروڑ سے ستر کروڑ تک بتائی جاتی ہے اور ایشیاء افریقہ بلکہ یورپ کے بعض علاقوں میں متفرق طور پر وہ آباد ہیں لیکن اتنی بڑی تعداد جو اتنے دور دراز ممالک میں پھیلی ہوئی ہے بجز ایک اقلیت قلیلہ..... (گویا ہزار میں شاید ایک ہونے کی نسبت رکھتے ہوں) یعنی شیعہ فرقہ کے دنیا کے یہ سارے مسلمان وہی ایک عقیدہ، ایک مسلک رکھتے ہیں جس کی تعبیر اہل السنۃ والجماعت کے عقائد و مسلک سے کی جاتی ہے۔ البتہ فروغی مسائل کے بعض پہلوؤں میں ہلکی قسم کا ایک اختلاف سنیوں میں پایا جاتا ہے یعنی وہی اختلاف جس کی وجہ سے بعض حنفی، بعض شافعی، مالکی، یا حنبلی کہلاتے ہیں۔ مختلف ممالک و اقالم کے کروڑ ہا کروڑ انسانوں میں چار ہی قسم کے یہ اختلاف بجائے خود کچھ کم محل تعجب نہیں ہیں اور سچی بات یہ ہے کہ اہل السنۃ والجماعت کے اس اختلاف کو واقعی اختلاف وہی قرار دے سکتا ہے۔ جس کی نظر حقائق واقعات پر نہ ہو۔ آخر جب ان میں ہر ایک دوسرے اماموں کا اسی قدر احترام کرتا ہے جتنا احترام اپنے امام کا دل میں رکھتا ہے۔ سب ہی کو ”رحمۃ اللہ علیہ“ کی دعا کے ساتھ بلا استثناء ہر ایک یاد کرتا ہے۔ آخرت میں قرب و ثواب کے لحاظ سے قطعاً کسی امام کو دوسرے امام پر ترجیح نہیں دی جاتی اور ائمہ ہی نہیں ان مختلف ائمہ کے مابین والے علماء و صوفیاء کے ساتھ تقریباً ہر سنی مسلمان

وہی تعلق رکھتا ہے جو تعلق اس کا اپنے امام کے ماننے والے علماء و صوفیاء سے ہوتا ہے۔ غزالی، رازی، شافعی مذہب کے علماء ہیں لیکن کیا کسی حنفی کے دل میں ان لوگوں کی عزت شافعیوں سے کم ہے۔ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ حالانکہ حنبلی مسلک رکھتے تھے۔ لیکن کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ حنفیوں میں عظمت و احترام کا جو مقام ان کو حاصل ہے، حنابلہ میں بھی ان کو تلاش کرنا مشکل ہے؟ میں نے اپنی کتاب تدوین فقہ کے ابتدائی حصہ میں اس موضوع پر تفصیلی بحث کی ہے۔ اس وقت ان چند اشاروں پر اکتفا کر کے یہ کہنا چاہتا ہوں کہ کر قہ زمین کی اتنی عظیم اکثریت میں وحدت خیال و مسلک کا یہ معجزانہ رنگ اسلام نے جو پیدا کر دیا تھا۔ اس کا خطرہ پیدا ہو گیا تھا کہ یہ شیرازہ ٹوٹ جائے گا اور وہی امت جو اس وقت بمشکل چار اماموں کے اجتہاد و استنباط پر مجتمع ہو گئی ہے۔ اسی میں ہر فرد امامت کا مقام حاصل کر کے اس ایک دین کو چالیس پچاس دین یا فرقوں میں تقسیم کر دے گا۔ آخر ائمہ اجتہاد سے بغاوت کا صور پھونکا گیا تھا۔ اس کا نتیجہ اس کے سوا اور کیا ہو سکتا تھا کہ ہر شخص کو محض اس لئے کہ وہ مسلمان ہے قرآن و حدیث کے مطالب کے تعین اور نتائج کا استنباط کا اختیار دے دیا جائے اور جیسا کہ انسانی فطرت کا تجربہ ہے۔ یعنی ہر شخص کی شکل و صورت الگ الگ ہے اسی طرح آراء و خیالات میں بھی شتر بے مہاری کے اس دور میں لوگوں کا الگ الگ ہو جانا اس کا ایک قدرتی نتیجہ ہوتا۔ مسلمانوں کو منتشر اور پراگندہ ہونے کے بعد ایک نقطہ پر جمع کرنے میں سالہا سال کی کوششوں کے بعد جو کامیابی ہوئی تھی یہ کامیابی صفر بن کر رہ جاتی۔

میرے پاس اس کا کوئی ثبوت نہیں ہے کہ حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت اورنگ زیب عالمگیر رحمۃ اللہ علیہ کی وفات کے بعد جب ہندوستان میں ہوش سنبھالا تو ان تک یورپ کے اس مخفی ذہنی تسلط اور آئندہ اس سے پیدا ہونے والے خطرات کا علم کس راہ سے پہنچا لیکن اپنی پوری زندگی جس جدوجہد میں حضرت شاہ صاحب نے صرف کی، اس کے ایک بڑے حصے کا تعلق، یہ عجیب بات ہے کہ ان ہی پیدا ہونے والے خطرات کے انسداد سے معلوم ہوتا ہے۔ شاہ ولی اللہ ایک مسلک وسط کے پالنے میں کامیاب ہوئے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں کی فقہ بھی بچ گئی، تصوف بھی تباہی سے محفوظ رہا، قدیم علم کلام کی بنیاد پر ایک ایسے جدید علم کلام کی بنیاد ان کے ہاتھوں سے قائم ہو گئی جس میں کلام کے ساتھ تصوف اور تصوف کے ساتھ علم کلام کی ایسی

معتدل آمیزش ہوئی ہے کہ اس کی بدولت مسلمانوں کا تصوف بھی زندہ ہے اور ان کے کلامی نظریات کی بھی زیادہ واضح شکلوں میں زندہ رہنے کی ضمانت پیدا ہو گئی اور اسی کے ساتھ پچھلے زمانے میں دین کے اصلی سرچشموں سے علماء اسلام کو تھوڑا بہت جو بعد پیدا ہو گیا تھا اور یہ فطری بات ہے کہ نتائج و ثمرات کی مشغولیت عموماً اصول سے دوری کا سبب بن جاتی ہے۔ لیکن شاہ ولی اللہ نے ایک ایسا محتاط متوازن قدم اٹھایا کہ نتائج و ثمرات کی مشغولیت میں کسی قسم کی افسردگی بھی پیدا نہیں ہوئی ہے اور اسلام کے اساسی سرچشموں یعنی قرآن و حدیث کے ساتھ اہل علم کے تعلقات نئے سرے سے تروتازہ ہو گئے۔ تقلید جامد کا وہ طلسم بھی ٹوٹ گیا جو تقلید کی کہنگی سے عموماً قائم ہو جاتا ہے اور آزادی رائے کے ساتھ تحقیقی تقلید کا ایک ایسا رنگ ان کے اور ان کے تلامذہ کے درس و تالیف نے پیدا کیا کہ ہر چیز اپنے اپنے طبعی مقام پر آ کر ٹھہر گئی۔

یورپ کے سیاسی اقتدار سے پہلے ہی ہندوستان میں شاہ ولی اللہ کا یہ کام مکمل ہو چکا تھا اسی کا نتیجہ یہ ہوا کہ جب اپنی سیاسی اقتدار کے ساتھ یورپ مسلمانان ہند پر مسلط ہو گیا تو گو شروع میں کچھ ہلچل ضرور پیدا ہوئی، ایک طبقہ اس ملک میں پیدا ہو گیا تھا جو متوقع خطرات کے راستوں کو صاف کرنے لگا، لیکن شاہ ولی اللہ کا مکمل نظام پہلے سے اس ملک میں موجود تھا۔ مقابلہ کرنے والے اس نظام کو لے کر اٹھ کھڑے ہوئے اور تیس چالیس سال کی کشمکش کے بعد جو ہلچل پیدا ہوئی تھی۔ وہ دب گئی البتہ اس کے بعد تعلیم کے اس جدید نظام کے تحت جسے حکومت مسلط نے اس ملک میں نافذ کر رکھا ہے جس کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ پڑھنے والوں کو یہ باور کرایا جاتا ہے کہ ان کو سب کچھ پڑھا دیا گیا ہے۔ حالانکہ قطعی طور پر ان بے چاروں کو بالکل یک طرفہ تعلیم دی جا رہی ہے وہ جس حد تک یورپ کے جدید علوم و فنون اور ان کے مسائل کے عالم بنائے جاتے ہیں۔ اس حد تک ان کو اسلام اور اسلامی حقائق و مسلمات سے جاہل بنانے کی کوشش کی جاتی ہے جدید تعلیم سے استفادہ کر کے ملک میں تعلیم یافتوں کا یہ گروہ جو پھیلا دیا گیا ہے۔ اس کا حال نہ ان عوام کا ہے جو اپنے جہل کے صحیح علم کے بعد مذہب کے علماء کے سامنے گردن جھکا دینے میں شرم محسوس نہیں کرتے تھے، وہ جانتے تھے کہ نہ جاننے والوں کا فرض ہے کہ جاننے والوں کی باتوں کے آگے سر تسلیم خم کر دیں اور نہ ان بے چاروں کو مذہب کی

تعلیم دی جاتی ہے تاکہ خود فیصلہ کر سکیں کہ ان کے مذہب کی واقعی صحیح تعلیم کیا ہے؟ وہ مذہب کے علماء سے بدگمان ہیں ان میں یہ خیال پیدا کر دیا گیا ہے کہ ملا جو ان کے مذہب کے علماء کی خراسانی اور تاتاری تعبیر ہے یہ جو کچھ بتایا ہے یہ اسلام نہیں ہے مگر اپنے جہل و نادانیت کی وجہ سے وہ اس کا بھی صحیح فیصلہ نہیں کر سکتے کہ آخر اسلام کیا بتاتا ہے۔

اس میں کچھ دخل اس بات کو بھی ہے کہ مذہب کی تعلیم اس زمانے میں جس طریقے سے علماء پارہے ہیں وہ تعلیم کا قدیم طریقہ ہے۔ ہر زمانہ کے علم کی ایک زبان ہوتی ہے اس زبان اور اس تعبیر سے نادانیت کا نتیجہ یہ ہے کہ اپنے خیالات کو وہ زمانہ کی عصری زبان اور تعبیر میں پیش کرنے سے قاصر ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ دونوں نقائص تعلیم کے دونوں نظاموں کے نقص سے پیدا ہوئے ہیں لیکن یہ نقص کوئی بڑا نقص نہیں ہے ایسی کوتاہی نہیں ہے جس کا ازالہ نہ ہو سکے تعلیم کے نظام کی دوروی کو ختم کر کے آج مذہبی تعلیم کا دامن عصری علوم و فنون کے ساتھ اگر جوڑ دیا جائے جیسے اپنی گزشتہ تیرہ صدیوں میں مسلمان برابر یہی کرتے چلے آئے تو ساری غلط فہمیاں دور ہو جائیں گی اور شاہ ولی اللہ کا کام کم از کم ان خطرات کے سد باب کے لئے کافی ہے جو ”عقیدہ ولدیت“ کے آثار سے یورپ میں پیدا ہوئے ہیں۔

آئندہ اوراق میں آپ کو حضرت شاہ ولی اللہ کی زندگی کا ایک سرسری تذکرہ اور ان کے کارناموں کا اجمالی ذکر ملے گا۔ ایک شہری مجلہ کے لئے مختصر سا مقالہ لکھا گیا تھا۔ باوجود انتہائی اختصار کے لوگوں کا خیال ہے کہ کافی پھیل گیا ہے۔ اسی لئے مستقل کتاب کی شکل میں اسی کو وہ شائع کر رہے ہیں لیکن میرے نزدیک اس کتاب کی حیثیت شاہ صاحب کی حقیقی سوانح عمری کے مقابلہ میں گویا وہی ہے جو دریا کے مقابلہ میں قطرے کی ہوتی ہے مگر چودھری محمد اقبال سلیم گاہندری صاحب کو شاہ صاحب کی ذات سے ایسی عقیدت ہے کہ وہ اس ”عجالتہ مختصرہ“ کو بھی بہت کچھ سمجھتے ہیں۔ اشاعت کی اجازت انہوں نے مجھ سے چاہی، کار خیر سے متاع بننے کی کوئی وجہ مجھے نظر نہ آئی۔

والسلام
مناظر احسن گیلانی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الْحَمْدُ لِلَّهِ وَ كَفَى وَالصَّلَاةُ وَالسَّلَامُ عَلَى عِبَادِهِ الَّذِينَ
اصْطَفَى كُلُّ يَوْمٍ هُوَ فِي شَأْنٍ ۝
(العزیز الرحیم)

ہر لحظہ جمال خود نوع دگر آرائی
شور دگر انگیزی شوق دگر افزائی (العارف الجانی)
﴿ہر چڑھاؤ کے بعد اتار﴾

یہی ہوتا رہا ہے اور ہوتا رہے گا۔ اور کیوں نہ ہو، جب کہ اس پیکرِ رحمت کی زبان
مبارک سے بھی جو جمال آرائیوں کے ارتقاء کی رفتار کا منہ جائے کمال تھا۔ (صلی اللہ علیہ وسلم)
﴿لاری الفتن تقع فی بیوتکم کوقع المطر﴾ (صحیح بخاری)
”میں فتنوں کو دیکھ رہا ہوں کہ تمہارے گھروں میں اس طرح برس رہے ہیں
جیسے بارش برتی ہے۔“

کی ”خیر القرون“ کے کان میں آواز آئی تھی اور جو سنایا گیا تھا۔ کیا ایمان والوں کو وہی دکھایا نہیں
گیا؟ ذوالنورین رضی اللہ عنہ کے آنگن سے تو اس فتنہ کا صرف بادل اٹھا تھا لیکن ابو بکرؓ ہوں یا عمرؓ،
علیؓ ہوں یا طلحہؓ، زبیرؓ ہوں یا انسانیت کے اس بہترین عہد کی کوئی اور ہستی (رضوان اللہ علیہم) ان
گھروں میں ان فتنوں کو مسلسل برستے ہوئے نہیں پایا گیا! پھر جب اس دنیا کی ریت یہی ہے کہ
نہ گل از داغ عمت سنت و بلبل در باغ

ہمہ رانعرہ زناں جامہ دراں مے داری (الحافظ الشیرازی)

اور جب اس ابتلا کی زندگی کے خیر سے شر کے عنصر کا جدا کرنا ناممکن ہے۔ تو بجائے

اپنی مرضی کے مطابق دہر کو کیوں کر کروں

مجھ کو بے حد غصہ آتا ہے مگر کس پر کروں (اکبر)

کی بے معنی تلملاہٹ رنج اور کڑھن کے..... ”اطمینان“ کے خیال سے ہٹ کر اطمینان کے

میدان میں لَبِلُوْكُمْ اَيْكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا (تاکہ ہم تمہیں جانچیں کہ اپنے اپنے کرداروں کی رُو سے کون تم میں سے اچھا ہے اور بھلا ہے) پڑھتے ہوئے ہم کیوں نہ اتر جائیں۔

اور یہاں کی ہر لحظہ کی ”شور انگیزیوں“ کو بجائے گھبرانے اور بھاگنے کے اپنی ”شوق افزائیوں“ کا ذریعہ کیوں نہ بنالیں ہر ”شور“ پر نیا ”شیون“ پیدا ہونا بھی تو انسانی زندگی کی جان ہے۔ اگر ”شر“ کے وجود ہی کو ختم کر دیا جائیگا۔ تو ”خیر“ خواہوں اور ”خیر طلبوں“ کے لئے اجر و مزدوری کا ”استحقاق“ ہی کب باقی رہے گا۔ ”الشیطان“ کے وجود کو نکلنے والوں نے کبھی یہ بھی سوچا ہے کہ اس ملعون کے ہٹ جانے کے بعد انسان کی فطرت اب مقابلہ کس کا کرے گی؟ تم سے ٹکرا کر بلاشبہ وہ جہنم میں گرتا ہے۔ لیکن تم کو تو اس کی ٹکر جنت میں پہنچاتی ہے۔ بقا ہو یا ارتقاء اس دنیا میں دونوں کا یہی قانون ہے اور صرف یہی قانون ہے۔

چڑھاؤ کے بعد اُتار اور عروج کے بعد زوال کا راز یہی ہے۔ تِلْكَ الْآيَاتُ نُدَاوِلْهَا بَيْنَ النَّاسِ ط (ان چند دنوں میں دنیاوی دولت و قوت کو ہم لوگوں میں چکر دیتے رہتے ہیں) کے ارشاد قرآنی کی یہی تفسیر ہے اور سچی بات بھی یہی ہے۔ نجد کی وادی کا قیس ہی کیوں تنہا ٹھیکہ دار بنا رہے۔ اس وادی میں اُترنے والے اُترتے رہیں گے اور ”ہر کے پنچہ زدِ نوبتِ اوست“ کی نفیری پھونکتے ہوئے فِی جَنَّةٍ عَالِيَةٍ کی بلند ٹیکری کی طرف چڑھتے ہوئے رِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ اکبر کے ”مقامِ امین“ اور ”مقصدِ صدق“ تک پہنچتے چلے جائیں گے۔

﴿الف ثانی کے تجدیدی کارنامے کی انتہاء﴾

چند دن ہوئے کہ ہندوستان کے ایک تجدیدی کارنامے کی داستان سنانے کی سعادت میسر آئی تھی۔ بتایا گیا تھا کہ اخلاص و وفا اور صدق و صفا کے سوا جس ”فقیر بے نوا“ کے پاس قوت و طاقت کا کوئی سرمایہ نہ تھا۔ وہ اپنی کشتول گردائی کی، اسی بضاعتِ مزاجہ کے ساتھ اٹھ کھڑا ہوا اور ایسا کھڑا ہوا کہ پھر اس وقت تک نہ بیٹھا جب تک کہ ملت و دین کی تجدید کی جس نہر کو وہ جاری کرنا چاہتا تھا وہ جاری نہ ہوگئی۔ وہ جاری ہوئی اور اس کے بعد بھی جاری کیا بلکہ اور بڑھتی رہی چڑھتی رہی۔ تاہم ایک صدی بھی پوری نہ گزرنے پائی تھی کہ اس کی یہی تجدید نہر ایک بحرِ بیکراں کی شکل میں ٹھاٹھیں مارتی ہوئی آفاق کے کناروں سے ٹکرانے لگی۔ جس مغل بادشاہ نے ”فقیہ“ کا ترجمہ

بزرگ شمشیر ”احمق“ مشہور کیا تھا۔ خدا کی شان دیکھو کہ اسی کے تحت پر اسی کا حقیقی پوتا اس تجدیدی معرکہ کے بعد بیٹھتا ہے اور قرآن و حدیث تو بڑی چیزیں ہیں دینی و علمی حیثیت سے جس کا درجہ نسبتاً فروتر ہے یعنی فقہ اور فقہاء جنہیں اس کے دادا نے اپنی آنکھوں سے گرایا تھا انہیں وہ اپنے سر بٹھاتا ہے۔ آخر کون نہیں جانتا کہ حضرت اورنگ زیب عالمگیر رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے عہد میں ”فتاویٰ عالمگیری“ کے مدون کرانے کی خدمت انجام دلائی تھی۔ اور یہ تو عوام میں مشہور ہے۔ ورنہ اصل واقعہ تو یہ ہے اکبر کا یہ پوتا فقہ کی اس کتاب کی تدوین میں عملی طور پر بذات خود شریک تھا۔ حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ ”انفاس العارفین“ میں راوی ہیں کہ:-

﴿فتاویٰ عالمگیری کی تدوین و تالیف میں عالمگیری کی شرکت﴾

در آں ایام عالمگیر راجع و تدوین آں اہتمام عظیم بود ملا نظام ہر روز یک صفحہ پیش

پادشاہ می خواندند (ص ۲۴)

ان دنوں میں عالمگیر کو اس کتاب کی ترتیب و تدوین میں انتہا سے زیادہ اہتمام تھا۔ ملا نظام (افسر سررشتہ تدوین) روزانہ ایک صفحہ بادشاہ کے سامنے پڑھا کرتے تھے۔

اس کے معنی بجز اس کے اور کیا ہو سکتے ہیں کہ کتاب فتاویٰ عالمگیری اورنگ زیب کے صرف حکم یا روپیہ کی امداد ہی سے مرتب نہیں ہوئی ہے۔ بلکہ اس کی تدوین و تصحیح و ترتیب میں بہ نفس نفیس خود بادشاہ بھی شریک تھا۔ علماء دن بھر مختلف کتابوں سے جزیات اور مسائل کا انتخاب کر کے جب مرتب کر چکے تو روز کاروز بادشاہ اسے سن لیتا تھا۔ کیا اس کا یہ سننا صرف بطور تبرک اور حصول ثواب کے تھا؟ شاہ صاحب نے اس کے بعد جو قصہ لکھا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر ہر لفظ کے سمجھنے کے بعد آگے بڑھتا تھا جو بات سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ اس پر بحث کرتا تھا۔ شاہ صاحب نے جو کچھ ارقام فرمایا ہے اس کا حاصل یہ ہے کہ شاہ عبدالرحیم شاہ ولی اللہ کے پدر بزرگوار نے فتاویٰ عالمگیری کے اس حصہ پر جو انکے ایک دوست ملا حامد کے سپرد تھا ایک حاشیہ لکھ دیا تھا۔ ملا نظام (جو صیغہ تدوین کے افسر اعلیٰ تھے) اور اپنے رفقاء کے کاموں کو روز بادشاہ کے سامنے پیش کیا کرتے تھے حسب دستور ملا حامد کے اس مسودہ کو سنار ہے تھے کہ شاہ عبدالرحیم والے حاشیہ پر پہنچے۔ صاحب کو تو برو میں خبر نہ ہوئی۔ عالمگیر جس توجہ سے عالمگیری کے

مسودات کو سنتا تھا اس کا اندازہ اس سے کیجئے کہ حاشیہ والے زائد فقرے کا کان میں پہنچنا تھا اور ”این عبارت چیست“ کی آواز شاہی جلال کے ساتھ ملا نظام کے کان میں گونجی۔ پھر ہوش و حواس کو درست کر کے غور کرتے ہیں۔ جب بھی مطلب خط ہی نظر آیا۔ حتیٰ کہ اس وقت کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ خفیف ہو کر معذرت خواہ ہوئے اور بولے:-

﴿این را مطالعه نہ کردہ ام، فردا تفصیل عرض خواہم کرد﴾
 ”اس مقام کا میں نے مطالعہ نہیں کیا ہے کل تفصیل سے اس کا مطلب عرض کروں گا۔“

﴿عالمگیری کارناموں میں مجددی اشارات کا دخل﴾

افسوس کہ الف ثانی کے تجدیدی کارنامہ کی تفصیل کا آئندہ پھر موقع نہ مل سکا۔ ورنہ تاریخی حقائق کی روشنی میں بتا دیا جاتا کہ عالمگیری تحریکات و مجاہدات میں حضرت مجدد رحمۃ اللہ علیہ اور آپ کی تجدیدی مساعی کو کس حد تک دخل ہے۔ کم از کم حضرت مجدد کے فرزند مولانا شاہ معصوم کے وہ مکاتیب ہی پڑھ لئے جائیں جو مطبوعہ ہیں۔ تو ان سے بھی معلوم ہو سکتا ہے۔ کہ عالمگیر کے دنیاوی مہمات حتیٰ کہ جنگی اور سیاسی کارناموں میں بھی شاہ معصوم رحمۃ اللہ علیہ کے مشوروں بلکہ حکم کو کتنا دخل ہے۔ انشاء اللہ تعالیٰ جب کبھی اس مضمون کی تکمیل کا موقع میسر آئے گا اس وقت اس مسئلہ کو بھی روشن کیا جائے گا۔ اسی بنیاد پر میں سمجھتا ہوں کہ ”فتاویٰ عالمگیری“ اور اس کی تدوین کا بادشاہ کو اتنا عظیم اہتمام بھی حضرت مجدد الف ثانی کی تجدیدی کوششوں ہی کا ایک ثمر ہے۔ غالباً فقہ اور فقہی کتابوں میں یہ خصوصیت صرف فتاویٰ عالمگیری ہی کو حاصل ہے کہ ایک سلطنت کبریٰ (گریٹ امپائر) کا سب سے بڑا مطلق العنان بادشاہ اس کی تدوین و تالیف

اور وہ سمجھ میں آتا کیا۔ اس لئے کہ واقعہ یہ پیش آیا تھا کہ ملا حامد نے ایک ہی مسئلہ کے متعلق دو کتابوں کی دو متفرق عبارتوں کو جمع کر کے عبارت میں گنجلک پیدا کر دی تھی۔ شاہ عبدالرحیم صاحب (والد حضرت شاہ ولی اللہ) کی نظر جب اس مقام پر پڑی۔ ان کتابوں کو آپ نے دیکھا اور پیچیدگی کے منشاء سے واقف ہونے کے بعد مسودہ کے حاشیہ پر یہ عبارت لکھ دی من لم یتفق فی الدین قل خلط فیہ هذا غلط و صوابہ کذا۔ یعنی دین کی سمجھ جو نہیں رکھتا۔ اس نے یہاں گڑبڑ کر دی۔ صحیح یوں ہے۔

میں خود شریک رہا۔ یوں سمجھنا چاہئے کہ جس تجدیدی عمل کی ابتداء جہانگیر سے ہوئی تھی اس کے عروج کا انتہائی کمال عالمگیر کی ذات پر ہوا۔ اور نسل ہانسل سے تخت و تاج و اورنگ و دیہم کے آغوش میں جس نے پرورش پائی ہو۔ تجدیدی عمل کے زور کو دیکھو کہ ایسے تلوار کے دھنی کے ہاتھ میں اس لئے قلم پکڑوایا گیا کہ فلسفہ و منطق اور تفسیر و حدیث وغیرہ کے متعلق بھی بلکہ نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ، بیع و شریٰ اور طلاق و نکاح کے خشک فقہی مسائل کی ترتیب میں خود شریک ہو۔ اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ دین کو اعزاز کا آخر اس سے بھی زیادہ بلند ترین مقام اور کیا مل سکتا تھا، قرآن لکھ کر اگر عالمگیر دور کا آؤ وہ مہیا کرتا تھا تو اس کی نظیر تاریخ سے مفقود نہ تھی۔ اسی دلی کے تخت پر نصیر الدین محمود بادشاہ اسی شان اور اسی التزام کے ساتھ سنا جاتا ہے کہ بیٹھا تھا۔ لیکن فقہ جیسے غیر دلچسپ، دقیق و پیچیدہ علم کے ساتھ بادشاہ کی یہ دلچسپی میرے نزدیک دینی عزت کا آخری زینہ تھا۔

﴿عروج کے بعد نزول﴾

اب اگر اس عروج کے بعد کسی نزول کی پیشین گوئی کی جاتی تو تاریخ کے اوراق اس کی شہادت ادا کر سکتے تھے۔ دنیا کے پچھلے تجربوں سے اس کی توثیق ہو سکتی تھی۔ جیسا کہ میں نے تمہید میں اشارہ کیا ہے کہ جمال کی تجلیوں کا جب کبھی ابتلائی حیات کے کسی عبوری دور میں اتنا زور بندھا ہے تو تاثر نے والوں نے اس کے بعد ”جلال“ کے مظاہرہ کا ہمیشہ انتظار کیا ہے اور دنیا جانتی ہے کہ عالمگیر کی رحلت کے بعد ہی دوسرے رخ کا آغاز شروع ہو گیا تھا۔ ”شور انگیزیوں“ کی ساکن سطح میں پھر جنبش شروع ہوئی..... اور (یع کون ہوتا ہے حریف مے مرد افکن عشق) کے غیبی نقیبوں نے صلائے عام دینا شروع کیا۔

وہی دلی جہاں کابل سے آسام اور نیپال سے ساحل سمندر تک کی زمین اور اس کے باشندوں کے تنہا مالک کو دیکھا گیا تھا کہ وہ مبسوط سرحدی، حادی قدسی، مضمرات، تارخایہ وغیرہ فقہی کتابوں کی عبارتوں کو سنتا اپنے لئے زاد آخرت قرار دے رہا تھا۔ اسلام کے کلیات اور اساسی امور ہی نے نہیں بلکہ ان کتابوں کی جزئیات بعیدہ نے بھی عزت و احترام کا درجہ حاصل کر لیا تھا۔ وہی دلی ہے، دلی کا لال قلعہ ہے، لال قلعہ بابری و تیموری نسل کے بچوں سے ابھی

خالی نہیں ہوا ہے۔ اسی دلی کا سب سے بڑا امام بلکہ سارے ہندوستان کے مسلمانوں کا مسلم الکل پیشوا اسی دلی میں بیٹھا ہوا رہتا ہے، اسلام پر روتا ہے، مسلمانوں پر روتا ہے اور ان کی کھوئی ہوئی عظمت رفتہ پر روتا ہے۔

میری مراد، شاہ ولی اللہ کے بڑے صاحبزادے حضرت شاہ عبدالعزیز قدس اللہ سرہ العزیز سے ہے۔ اپنے چچا حضرت شاہ اہل اللہ کے نام عربی میں چند خطوط آپ نے لکھے ہیں۔ غالباً کسی مصلحت سے اس زمانہ کے تاثرات اور اپنے احساسات کا اظہار عربی نظم کی صورت میں فرماتے ہیں۔ میں ان نظموں کے چند اشعار بقدر ضرورت حاصل معنی کے ساتھ یہاں نقل کرتا ہوں۔ فرماتے ہیں:-

﴿شاہ عبدالعزیز کے خونین آنسو یا نا لہائے نیم شبی﴾

جزی اللہ عنا قوم سکھ و مرہٹ عقوبۃ شرعا جلا غیر اجل اللہ،
سکھ اور مرہٹ کی قوم کو ہماری طرف سے بدلہ چکھائے، بہت برا بدلہ اور جلد چکھائے۔

وَقَدْ قَتَلُوا جَمْعًا كَثِيرًا مِنَ الْوَرِيْ ☆ وَقَدْ أَوْجَعُوا فِي أَهْلِ شَاءَ وَ جَاهِل
ان دونوں نے بہت سی اللہ کی مخلوق کو قتل کیا اور بیچارے گڈریوں جاہلوں کو بھی انہوں نے دکھ پہنچایا
لَهُمْ كُلَّ عَامٍ نَّصْبَةٌ فِي بِلَادِنَا ☆ يَخْرُضُونَ فَنِيَا بِالضَّحَى وَالْأَصَائِلِ
ہماری بستیوں اور آبادیوں پر ہر سال لوٹ مار مچاتے اور ہمارے علاقوں میں یہ دن دھاڑے اور شام کو پہنچتے ہیں

ہیں

فَهَلْ هُنَا مِنْ مَعَاذٍ لِّعَائِدِ ☆ وَهَلْ مِنْ مَغِيْثٍ يَتَّقِي اللّٰهَ عَادِلِ
پھر کیا پناہ لینے والوں کیلئے یہاں کوئی جائے پناہ ہے؟ اور ہے کوئی ایسا فریادرس جو اللہ سے ڈرتا ہو اور انصاف کر سکتا ہو
ایک اور دوسرے خط میں جو ان ہی شاہ اہل اللہ کے نام ہے۔ فرماتے ہیں:-

اِيَّامُ بَرْدَاتٍ فَالْقَلْبُ مِنْجَزَعٌ ☆ مِنْ قَوْمٍ سَكَّهَ وَانِ الْخَوْفِ مَعْقُولِ
سردیوں کا موسم آگیا اور دل پریشان ہے سکھ قوم سے اور دل کا یہ اندیشہ معقول ہے
انصاهم اللّٰهَ عَنْ هَذَا الدِّيَارِ عَنْهُمْ ☆ شَرَّالْاَعَادِي وَهُمْ مِنْ جَنَةِ غَوْلِ
خدا اس ملک سے ان کو ناپید فرمائے یہ بدترین دشمن ہیں اور خود یہ غول بیابانی ہیں

فوضت امری و امر الناس اجمعهم ☆ الى الله و ان الحفظ مامرل
میں اپنے اور لوگوں کے معاملہ کو خدا کے سپرد کرتا ہوں
ایک اور تیسرے خط کے چند اشعار یہ ہیں:-

ثم ان البلاد فاسلة ☆ عن اى اذى الغشوم و الظلام
پھر معلوم ہو کہ ملک تباہ و برباد ہے
ظالموں اور بد معاشوں کے ہاتھ سے

غير خاف عليك ما صنعت ☆ قوم سكه بجانب التوشام
آپ پر غالباً مخفی نہ ہوگا جو کچھ کیا
سکھ قوم نے توشام علاقے میں؟

خفصوا كل قرية و مضوا ☆ يفتحون الحصون و الاطام
ہر بستی کو انہوں نے پست کر دیا اور گزر گئے
قلعے اور گڑھیاں فتح کرتے پھرتے ہیں

ضيعوا امة من الارواح ☆ قتلوا امة من الاجسام
ایک گروہ کی جان انہوں نے ضائع کی
اور ایک طبقہ کے اجسام کو انہوں نے قتل کیا

نهبوا علة من الاموال ☆ او ثقوا علة من الايتام
مال اندوزی کے بھوکے ہیں
اور ہمارے کتنے یتیموں کو انہوں نے قید و بند کیا

وسقوا كل من تعرضهم ☆ من فنام الانام كاس الحمام
اسی کو پلا دیتے ہیں موت کا پیالہ
جو انسانوں کے گروہ میں سے ان کی راہ میں

آڑے آئے

زملت كل رضع عتاً ☆ ارضعت و كل ذات فطام
(آج) ہر دودھ پلانے والی
اس بچہ کو بھول چکی ہے جسے دودھ پلاتی تھی

اور ان کو بھی، جو دودھ چھوڑ چکے ہیں۔

حضرت شاہ عبدالعزیز قدس اللہ سرہ العزیز نے اپنے ان اشعار میں ہندوستان کو جن
سیاسی حالات کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔ تاریخ کی کتابیں ان کی تفصیلات سے معمور ہیں اور
آئندہ بقدر ضرورت میں ان کا ذکر بھی کروں گا۔ لیکن قصداً اس سلسلہ میں، میں نے حضرت شاہ

توشام، حصار کے ایک تعلقہ کا نام ہے۔

صاحب کی شہادت اس لئے پیش کی ہے تاکہ ایک عام غلط فہمی جو پھیلی ہوئی ہے کہ علماء و صوفیاء کو ملک کے سیاسیات سے کوئی تعلق نہ تھا اس کا ازالہ ہو سکے۔ یہ صحیح ہے کہ ہمارے اسلاف کی خصوصاً اپنی تالیفات و تصنیفات میں یہ خاص خصوصیت تھی کہ وہ جو کچھ لکھنا چاہتے تھے اسی کو لکھتے تھے۔ بیچ بیچ میں اپنے زمانہ کے سیاسی جھگڑوں کا دکھڑا لے کر نہ بیٹھ جاتے تھے اور غالباً غلط فہمی کا منشا بھی یہی ہے، آخر یہی شاہ ولی اللہ ہیں۔ بلا مبالغہ کہا جاسکتا ہے کہ آپ کے مؤلفات کے دفاتر و طو امیر ہزار ہا صفحات سے متجاوز ہیں۔ لیکن بجز ”انفاس العارفین“ کے جس میں آپ نے اپنے آباؤ اجداد کے کچھ حالات درج کئے ہیں اور اس سلسلہ میں بلا امادہ کہیں کہیں بعض سیاسی حالات کا بھی اجمالاً ذکر آگیا ہے۔ مگر اس کے سوا آپ کی کسی چھوٹی بڑی کتاب سے بمشکل اندازہ ہو سکتا ہے کہ یہ وہی کتابیں ہیں جو اس وقت لکھی گئیں۔ جب نادر شاہ اپنی بے پناہ تلوار سے چاندنی چوک کی نہروں میں بجائے جمنا کے پانی کے انسانوں کا خون بہا رہا تھا۔ فتحپوری کی مسجد زمین سے چھت تک لاشوں سے پٹی ہوئی تھی۔ قاضی کا حوض اور ولی کے عام کنوئیں صرف مردوں سے بھرے ہوئے تھے۔ سڑی ہوئی لاشوں سے پاک کرنے کے لئے دلی کے ہرنا کہ پرالاؤ جوڑا گیا تھا۔ جس میں ہندو ہو یا مسلمان سب کی میت بلا امتیاز جھونکی جا رہی تھی اور یہی ایک واقعہ کیا، مرحوم اورنگ زیب کے بعد دلی کے آسمان نے جن جانگداز روح گسل واقعات کا تماشا کیا تھا اُس سے کون واقف نہیں ہے۔

﴿دلی کے خونین فتنے اور ولی اللہ کی استقامت﴾

لیکن دیکھتے ہو! ذہن کے پکوں کی اس شان کو دیکھتے ہو بادشاہتوں پر بادشاہتیں گزرتی چلی جاتی ہیں۔ انقلاب پر انقلاب ہوتا چلا جا رہا ہے۔ قومیں، قوموں پر چڑھی جا رہی ہیں۔ فتنوں کا ہر طرف زور ہے فساد کا ہر طرف شور ہے۔ لیکن اللہ کے کچھ بندے ہیں جو سب کچھ دیکھتے ہیں۔ سب کچھ سنتے ہیں۔ سب سے متاثر ہوتے ہیں اور ہر مشکل کے حل کا ساز و سامان بھی اندر اندر تیار کرتے چلے جاتے ہیں لیکن

اے مرغِ سحر عشق ز پر وانشہ پیاموز

کاں سوختہ را جاں شد و آواز نیابد

نہ ان کی زبانوں پر آسمانوں کو ہلانے والی تقریریں ہیں، نہ آنکھوں سے ٹھوٹے آنسوؤں کا سیلاب بہایا جا رہا ہے، نہ ریز و لیو شتوں کے بم سے دشمنوں کے حصار پر گولہ باری کر کے فتح کے شادیاں بچائے جا رہے ہیں نہ مخالفوں کی بے سرو پا تجویزوں یا مشہور کئے ہوئے منصوبوں کو سن سن کر ان کا زہرہ آب ہوا جاتا ہے۔ وہی اندیشوں میں مبتلا ہو کر نہ ڈراؤنے خواب خود دیکھتے ہیں نہ دوسروں کو دکھاتے ہیں۔ نہ لایعنی بے معنی مشوروں سے مسلمانوں کو کبھی خیبر اور بولان کے دڑوں کی طرف بھگاتے ہیں۔ جس قوم کا فرض صرف آگے بڑھنا اور آگے بڑھتے ہی چلے جانا ہے۔ نہ اُن میں بزدلی اور جلن کے جذبات کی پرورش کر کے مورچوں کے چھوڑنے کا بگل بجاتے ہیں، نہ صرف پیٹ کی روٹی اور تن کے چیتھڑوں کو بچالینے کے لئے اللہ کی مسجدوں کو، بزرگوں کے مآثر کو، آباؤ اجداد کے مقابر کو، کفار کے موشیوں کے گوسالہ بنانے پر اپنے کو راضی کرتے ہیں۔ کفر کی جن نسلوں کے متعلق اُمید تھی کہ آج نہیں تو کل جہنم کی آگ سے اُن کو بچالینے میں ہم کامیاب ہوں گے۔ قیامت تک کے لئے ان پر ایمان کا دروازہ بند کر کے ہم اس لئے بھاگے جا رہے ہیں کہ جس طرح بے کتاب و بے پیغمبر زندگی گزارنے والی قوموں کے سامنے روٹی کے چند ٹکڑوں کا سوال ہے اور اسی کا حل زندگی کے سارے معتموں کا حل ہے۔ ہم بھی کوئی ایسا کونہ زمین کے کسی حصہ پر حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائیں جہاں ہمارے لقموں پر دوسری قوموں کے غزانے والے دکھائی نہ دیں۔ ہڈیوں پر اگر ہم لڑیں بھی تو آپس ہی میں لڑیں ایک لے دے کر اب ”فرشتہ صید، پیمبر شکار“، ”یزداں گیر“ کے ”شاہیں بچوں“ کو اسی سردار پیٹ کے مسئلہ پر قناعت کر لینے کا مشورہ دیا جا رہا ہے ”معاشی مشکلات“ کی افیم کھلا کر ان پر غنودگی

اور مشاہدہ کہو یا تجربہ، وہ تو تیار ہے کہ ان ”شکم پرور“، ”نان پرستوں“ کو اگر کسی جگہ کوئی عایت کا ایسا گوشہ کسی شکل میں میسر آ گیا ہے تو وہاں انہوں نے پھر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اسلام اور قرآن کی ہدایتوں کو بالکل بھلا دیا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ محمد اور قرآن اسلام اور مسلمان کے الفاظ صرف اس وقت تک استعمال کرتے ہیں جب تک روٹی کپڑے کے دوسرے دعویداروں کے مقابلہ میں ان ہی الفاظ سے چند لقموں کو اپنے پیٹ تک سرکانے میں یہ کامیاب ہو سکتے ہیں لیکن جہاں اس مقابلہ کا خوف نکلا دیکھا جاتا ہے کہ پھر ان کے مسحور دماغ اس کھیل کو عافیت کے ان گوشوں میں کھیلنا چاہتے ہیں جو ان کا مداری ان سے کھلوانا چاہتا ہے وہی پردہ کی مخالفت، وہی مخلوط تعلیم، وہی نقص دہ و بے خوار و قمار بازی، سودی کاروبار وغیرہ کا جنون ان پر سوار ہو جاتا ہے۔

طاری کی جارہی ہے۔ ان نو جوان کو کون سمجھا سکتا ہے جنہیں بجائے اپنے اسلاف کے اہل کفر کے بزرگوں پر ایمان لانے کی خود ہمارے گھر کے لوگ دعوت دے رہے ہیں۔ آج کیا وقت آیا ہے۔ اس سے پہلے جو گھڑیاں گزر چکی ہیں۔ ان کے مقابلہ میں سچ تو یہ ہے کہ ابھی کچھ نہیں ہوا ہے۔ لیکن ہمارے باپ دادوں کا شیوہ بولنے کا نہیں، کرنے کا تھا۔ محض اس لئے کہ وہ بولے نہیں۔ تم غلط سمجھتے ہو اگر سمجھتے ہو کہ ان کو ان ضرورتوں کا احساس نہ تھا، جو چیز کردار میں تلاش کی جاتی ہے۔ تم سے غلطی ہو رہی ہے کہ اسے گفتار میں ڈھونڈتے ہو۔ باتوں کی پیچیدگیاں باتوں سے حل ہو سکتی ہیں لیکن کام کی دشواریاں بجائے کام کے صرف باتوں سے حل ہوں۔ یہ اس زمانے کا دستور نہ تھا۔ ان کے کاموں کا جائزہ لینا چاہتے ہو تو بجائے باتوں کے ان کے کاموں سے ہی تمہیں اس کا اندازہ ہو سکتا ہے کہ ان کے سامنے کیا تھا اور اس کے لئے انہوں نے بقول شخصے۔

اے دل طریق رندی از محتسب بیا موز

مست دست دور حق اور کس ایں گماں ندارد

بہر حال حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق بھی چونکہ میں بجائے اُن کی باتوں کے ان کے کام ہی کے ایک پہلو کو پیش کرنا چاہتا ہوں۔ اس لئے ظاہر ہے کہ ان اقوال کی جگہ میں بھی آپ کے سامنے ان کے اعمال کا ایک سرسری خاکہ پیش کروں گا اور سچ تو یہ ہے کہ ان کے اقوال بھی پیش کرنا چاہتا ہوں۔ تو ”پردانہ سوختہ“ کی راکھ سے میں ان چیچھوں کا ریکارڈ کیسے تیار کر سکتا ہوں جو صرف ”مرغ سحر“ کے سوانح نگاروں کو مل سکتے ہیں۔ لیکن واقعہ تو یہ ہے کہ حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق آئندہ اپنے جس دعویٰ کو پیش کرنا چاہتا ہوں اگر بجائے آثاری شہادتوں کے صرف تحریری شہادتوں کا مجھ سے مطالبہ کیا جائے تو اس مطالبہ سے عہدہ برآ ہونا شاید میرے لئے آسان نہ ہو۔ اگرچہ بڑی تلاش و تحقیق سے بعض جستہ جستہ چیزیں ان کی طویل الذیل تصنیفات میں ملی ہیں اور انہیں کو میں آئندہ پیش بھی کروں گا۔ مگر حضرت مجدد کے تجدیدی کارناموں کے کمال کے بعد جس زوال سے شاہ صاحب کو سابقہ پڑا ہے۔ قبل اس کے کہ عام تاریخی مواد اس کے متعلق پیش کروں۔ میں نے براہ راست ولی اللہ گھرانے کے ایک مشہور بزرگ بلکہ براہ راست بڑے صاحب زادے کی گواہی سے اسی لئے آغاز کیا

تاکہ لوگوں کو معلوم ہو کہ میں آئندہ حضرت شاہ صاحب کی طرف جن دینی و ملی احساسات کو منسوب کروں گا وہ محض میرا اختراعی نظریہ نہیں ہے یا منطق کی اصطلاح میں دو اتفاقی قضیوں میں لزوم کے تعلق کو محض میرے حسن ظن نے نہیں پیدا کر دیا ہے۔

آخر اندازہ کرنے والے اندازہ کر سکتے ہیں کہ جس باپ کا بیٹا، بیٹا ہی نہیں بلکہ جانشین خلیفہ اور کیسا جانشین خلیفہ سمعاً و لاً و ہدیاً جو ہو، ہو اس کا ثنی تھا۔ جب وہ اپنے سیاسی ماحول سے اس طرح متاثر تھا تو یہ کتنی بڑی عبادت ہوگی کہ حضرت شاہ ولی اللہ جیسے ذکی الحس، بیدار شعور، دقیقہ رس، نکتہ منج، ژرف نگاہ باپ کے سینہ کو ان جذبات سے محض اس لئے خالی فرض کیا جائے کہ ان کی عام کتابوں میں ان احساسات کا سراغ نہیں ملتا۔ حالانکہ واقعہً یہ بھی غلط ہے۔ جیسا کہ آئندہ معلوم ہوگا۔ لیکن منجملہ اور چیزوں کے حضرت شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کے یہ چند اشعار بھی اپنے اندر اس کی قوی شہادت رکھتے ہیں کہ ”اسلامی ایوان“ میں عہد عالمگیری کے بعد جو آگ لگی تھی۔ اس میں جن جن کے کلیجے پھٹنے تھے اور جن جن کے سینے آبلوں سے معمور ہو گئے۔ اس میں حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا خاندان بھی تھا اور شاید یہی آبلے تھے جو ”اسمعیلی“ جہاد کے رنگ میں پھوٹ کر بالآخر بہہ گئے۔ اگرچہ اس ”جہاد“ کی روشنی پر پردہ ڈال دیا گیا تھا۔ لیکن خدا جزائے خیر دے برادر عزیز محترم مولانا سید ابوالحسن علی صاحب ندوی کو جنہوں نے بزور اس پردہ کو ”سیرت سید احمد شہید“ لکھ کر حال ہی میں چاک کیا ہے۔ گو میں نہیں جانتا کہ جن لوگوں نے طے کر لیا ہے کہ بزرگوں کی روشنی کو نہیں دیکھیں گے اور جو قدم بھی اٹھائیں گے وہ مغربی لیمپ یا ہندی ڈیوٹ ہی کی روشنی میں اٹھائیں گے۔ اُن کی نظر بھی اس مینار پر پڑی یا نہیں؟

یا للعجب! ”کُنْتُمْ شَہِدَاءَ عَلَی النَّاسِ“۔ سارے جہان کے انسانوں کی نگرانی جس کے سپرد کی گئی اور جن کے وجود کا ”اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ“ طرہ امتیاز تھا۔ آج وہی اپنی ہر حرکت و سکون میں غیروں کی طرف تارکتے ہیں اپنے کو بے بس پارہے ہیں۔ حالانکہ اُن کو جو مرکزی قبلہ، مرکزی نبی، مرکزی کتاب دینی گئی تھی۔ اسی سے اندازہ کرتے کہ ان سب کو ہمارے ساتھ وابستہ ہو کر جینا ہے۔ لیکن انہوں نے ان کے ”چلانے والوں“ نے تو طے کر لیا ہے کہ وہی دوسروں کی کمر پک کر جیتیں گے۔ اسکے سوا زندگی کی ساری راہیں ان پر مسدود ہو چکی ہیں۔ وَأَضَلَّ أَعْمَالَهُمْ

﴿عالمگیر کے بعد فتنوں کا آغاز﴾

خیر میں کدھر نکلا جا رہا ہوں تو بات یہ ہو رہی تھی کہ اورنگ زیبی عہد کے ہندوستان اور ہندوستان کے مسلمانوں پر کیا گزر رہی تھی۔ شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ نے تو ان واقعات کی طرف اجمالی اشارہ کیا ہے اس اجمال کی تھوڑی تفصیل پہلے کر لینا چاہتا ہوں۔

﴿سکھ تحریک اور مرہٹہ تحریک﴾

اتنا تو ان شعار سے بھی معلوم ہوا اور تقریباً سب ہی جانتے ہیں کہ عالمگیر کے بعد ہی ایک تحریک ہندوستان کے شمال مغربی خطوں میں ”سکھ تحریک“ کے نام سے اور دوسری تحریک جنوبی ہند میں ”مرہٹہ یا شیواجی“ کی تحریک کے نام سے اٹھی تھی اور ثانی الذکر تحریک کا صرف آغاز ہی نہیں بلکہ ایک حد تک اشہاد، عالمگیر ہی کے زمانہ میں ہو چکا تھا۔ اسی کے ساتھ اجمالی طور پر لوگوں کو یہ بھی معلوم ہے کہ یہ دونوں تحریکیں سیاسی تھیں۔ اور ان دونوں کا رخ اسلام اور مسلمانوں کی طرف تھا۔ لیکن اگر قرآنی لہجہ میں پوچھا جائے کہ المرہٹہ و ما ادراک المرہٹہ؟ یا السکھ و ما ادراک ما السکھ؟ تو شاید اس سوال کے جواب کی جو واقعی ہیئت ناک، زلزلہ آفلک، ہوش ربا تصویر ہے وہ شاید ہی اس زمانہ کے مسلمانوں کے سامنے ہو! چونکہ ان واقعات یا ان کے سوا بھی میں اور جن چیزوں کو پیش کر رہا ہوں ان سے خود ان واقعات کا تذکرہ مفقود نہیں ہے۔ بلکہ صرف یہ دکھانا ہے کہ حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ جن کے قلبی واردات کا حال یہ ہے کہ باوجود شاعر نہ ہونے کے جب اپنے باطنی احساسات سے مضطرب ہوتے تھے تو اس وقت بے ساختہ ان کی زبان یا قلم کی شورا نگیزیاں ان اشعار کی صورت اختیار کرتی تھیں۔

خردش درد دل شہانمی کردم چہی کردم
جہاں راز پر زیاری ہانمی کردم چہی کردم

بہ زلف تیج در تیج کسے گم کردہ ام خود را
دلے پر درد، جاں افکار، یار تند خود ارم

آخر میں آپ کا مشہور مصرعہ ہے۔ ع

”جنوں ترک منصبانمی کردم چہی کردم“

تو اس وقت جب کہ ہر معمولی سواد خاں اعظام الدولہ، مصمصام الملک خان دوراں

اور امیر الامراء بن بن کر عزت و جلال کے اوج پر چمک رہا تھا شاہ صاحب بقول خود کسی ”جنون“ میں مبتلا ہو کر سب پر لات مار کر اپنا عذر ان الفاظ میں پیش کرتے ہیں۔ ع

”جنون ترک منصبہائی کر دم چہی کردم“

جلال کی جن تجلیوں کا تماشا فرما رہے تھے۔ ان ہی کو پیش نظر رکھ کر فرماتے ہیں۔
جہاں و جاں فدائے وضع شوخ شہر آشوب

قیامت می نمائی و دم عیسیٰ و مرہم، ہم

غور کرنا چاہئے ایک ایسے وارفتہ و مست الست کے متعلق یہ خیال کرنا کہ جس طرح بہت سے لوگ جو محض اس لئے کہ لکھنا جانتے ہیں۔ کتابیں لکھتے تھے۔ اسی زمرہ میں شاہ صاحب یا شاہ صاحب کی تالیفی و تعلیمی خدمات کو شمار کرنا کم از کم میرے نزدیک ”واقعات“ کے عدم احساس ہی کا نتیجہ ہو سکتا ہے ورنہ سچ یہ ہے کہ اس گروہ کو جس کا سب سے بڑا کام صرف لکھنا ہے اس کو ان دل باختوں، سوختہ سامانوں سے کیا نسبت؟ جنہوں نے کسی بڑے کام کے لکھنے کا پیشہ اختیار کیا، ٹھیک جو حال مولانا روم کا ہے۔ جن کا کام شاعری نہ تھا۔ لیکن ایک کام کے لئے انہوں نے شاعری کا لبادہ اوڑھ لیا تھا۔ میرے نزدیک حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے تمام مساعی کا مرکزی نقطہ بھی یہی تھا۔ اور آئندہ آپ کے سامنے اسی نظریہ کی کچھ تفصیل پیش کی جائے گی۔ اسی لئے پہلے ان حالات کو پیش کرتا ہوں۔ جن میں حضرت شاہ صاحب گھر گئے تھے۔ جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ عہد عالمگیری کے بعد سب سے بڑے فتنے دو تھے۔ جن میں ایک کا مرکز پنجاب اور دوسرے کا منشاء و مولد جنوبی ہند کا وہ ساحلی علاقہ تھا جسے عموماً کوکن یا مرہٹواڑی کہتے ہیں۔ میں پہلے فتنہ سکھ کا اجمالاً ذکر کرنا چاہتا ہوں۔

﴿پنجاب کی جدید خاکسار تحریک اور قدیم سکھ تحریک میں وجوہ مماثلت﴾

یہ عجیب بات ہے کہ ٹھیک جس طرح پچھلے چند سالوں میں پنجاب ہی کی سرزمین سے ایک تحریک اٹھی جس کے آغاز میں یہ ظاہر کیا گیا کہ ”مذہب“ کے سمجھنے میں لوگوں کو جو غلطی ہوئی ہے۔ محض اس کی اصلاح مقصود ہے اور اس سلسلہ میں آج تک تیرہ سو برس سے قرآن کا جو مطلب مسلمان سمجھتے تھے وہ بالکل الٹ دیا گیا۔ بہر حال ابتداء جس طرح یہ ایک مذہبی اصلاحی تحریک تھی لیکن چند ہی دنوں میں صاحب تحریک نے آہستہ آہستہ چولا بدلنا شروع کیا ایک آہنی لہ

Marfat.com

Marfat.com

کوششوں سے سیاسی رنگ اختیار کر چکی تھی۔ اپنی مذہبی تحریک کو سیاسی رنگ دینے کے لئے گورو گوبند نے بھی وہی کیا جو پنجاب کی موجودہ تحریک میں کیا گیا یا کیا جا رہا ہے صاحب سیر المتاخرین لکھتے ہیں:-

”گورو گوبند بجائے پدر خود تیغ بہادر لاشہ منتشرانہ فرقہ خود را آہستہ آہستہ جمع نمود اسلحہ واسپ و یاق بہم رسانیدہ و ہمراہیان خود قسمت کردہ و اندک اندک دست و پائے خود را از شروع تنگ و تناز نمود“ (ص ۴۰۲)

”گورو گوبند نے باپ تیغ بہادر کی جگہ بیٹھ کر اپنے فرقہ کے پراگندہ اور منتشر افراد کو آہستہ آہستہ اکٹھا کرنا شروع کیا اور ہتھیار، گھوڑے اور دوسرے جنگی ساز و سامان بھی فراہم کئے اور اپنے رفقاء پر سب کو تقسیم کرنے لگا۔ یوں تھوڑا تھوڑا کر کے اس نے اپنے پاؤں نکالنے شروع کئے اور دوڑ دھوپ کی ابتدا کی“

بہر حال گورو گوبند کے ساتھ تو ”بموجب فرمان بادشاہ فوج داران حضور بتادیب او پرداختند“ لیکن گوبند کا جانشین جب بدنامی گورو دھوا اور اس وقت حضرت شاہ صاحب جوان ہو چکے تھے۔ اس نے مسلمانوں کے ساتھ جو کچھ کیا ان چند الفاظ سے اس کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

﴿مسلمانوں پر لرزہ خیز مظالم﴾

﴿بردہات و آبادی اہل اسلام ہر جادست ادی رسید نافذ از سکنہ ایں جاہر کرامی یافت ابقائی کرد ہر چند اطفال صغیر اسن باشند﴾

تیغ بہادر کے متعلق طباطبائی نے عجیت بات لکھی ہے کہ ”شیوہ اخذ بحیر و تعدی اختیار نمودہ در پنجاب می گردد“ لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی لکھا ہے۔ کہ حضرت مجدد صاحب کے مشہور خلیفہ حضرت حافظ شیخ آدم بنوری نے بھی ایک جماعت فراہم کی تھی اور ”تیغ بہادر از ہندواں ز رہائی گرفت اور حضرت شیخ کے متعلق لکھا ہے کہ ”حافظ آدم از مسلمانان“ طباطبائی اور ان جیسے ”بزرگوں“ کو حضرت مجدد سے جو خاص کد تھی کون کہہ سکتا ہے کہ یہ اس کا نتیجہ ہے یا واقعی سکھی تحریک کے مقابلہ میں حافظ آدم رحمۃ اللہ علیہ بھی فی الحقیقت اٹھے تھے۔ مجھے امید ہے کہ ہمارے دوست مولانا یوسف بنوری جو غالباً حضرت حافظ صاحب کے خاندان سے ہیں اس مسئلہ پر روشنی ڈالیں گے۔

”مجددیت“ کے سلسلہ میں اس سے ایک باب کا اضافہ ہوگا۔

”اہل اسلام کے گاؤں اور آبادیوں پر جہاں کہیں قابو پاتا تھا چڑھ دوڑتا اور باشندوں میں جس کسی کو پاتا باقی نہیں چھوڑتا تھا خواہ چھوٹے کسمن بچے ہی کیوں نہ ہوں!“۔

فسادت و بطش شدید و جباریت کا یہ عالم تھا کہ

﴿حشی زنہائے حاملہ را شکم دریدہ و جنین را بیرون کشد یہی کشند﴾
 ”حاملہ عورتوں کے پیٹ چاک کر کے بچہ کو باہر کر مار ڈالتے تھے۔“

یہ تو طباطبائی کا بیان ہے۔ مرزا حیرت نے ایک ہندو مصنف کی جو پنجاب میں اکسٹرا اسٹنٹ کے عہدہ پر مامور تھا حسب ذیل شہادت نقل کی ہے:-

﴿ایک ہندو مصنف کی شہادت﴾

مسلمانوں سے سکھوں کو بڑی دشمنی تھی۔ اذان یعنی بانگِ باداز بلند نہیں ہونے دیتے تھے۔ مسجدوں کو اپنے تحت میں لے کر گرنہ پڑھنا اس میں شروع کرتے اور اس کا نام مست گڑھ رکھتے تھے۔ شکار اور شراب خور ہوتے تھے۔ گھوڑے پر چڑھے ہوئے روٹی کھاتے جاتے تھے۔ دیکھنے والے کہتے ہیں کہ جہاں پہنچتے تھے۔ جو برتن مٹی کا استعمالی کسی مذہب والے خصوصاً مسلمانوں کا پڑا ان کے ہاتھ آ جاتا تھا۔ پانچ چھتر (جوتے) اس پر مار کر اس میں کھانا پکا لیتے تھے۔ (حیات طیبہ ص ۱۳۱)

مسلمانوں کے برتن کے پاک کرنے کا سکھوں نے جوتے مارنے کا عجیب طریقہ اختیار کیا تھا۔ بہر حال اگر یہ واقعات صحیح ہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ بعید از قیاس کہا جائے اس واقعہ کو جو ان ”شکار اور شراب خوروں“ کے متعلق مرزا حیرت نے درج کئے ہیں۔ کہ

﴿زندہ جانوروں کے ہونے﴾

سکھوں کا دستور ہے کہ وہ ہولے کر کے کھاتے ہیں۔ کہ وہ ہولے کر کے کھاتے ہیں۔ کہ وہ ہولے کر کے کھاتے ہیں۔ دہلی میں ہولے سوکھے بونٹوں کو گھاس پھوس کی آگ میں معہ شاخوں کے خستہ کرنے کو کہتے ہیں۔ مگر سکھ انہیں ہولے نہیں کہتے۔ وہ ایک بڑے فولادی پنجرے میں چیل، کوئے، کبوتر، تیتڑ، مینائیں، طوطے غرض مختلف قسم کے جانور بند کر کے پنجرے کو کسی درخت سے لٹکا

دیتے ہیں اور پھر نیچے آگ دے دیتے ہیں۔ وہ زندہ پرند پھڑ پھڑا کے بھن کے کوئلہ ہو جاتے ہیں۔ پھر انہیں صاف کر کے یہ نا خدا ترس کھاتے ہیں۔

خیر یہ غریب پرندوں اور جانوروں کو ہولہ بنانے کی شکل تھی آنکھوں میں اندھیرا چھا جاتا ہے۔ جب اسی کے بعد مرزا حیرت کی اس روایت پر نظر پڑتی ہے کہ:-

﴿انسانوں کے ہولے﴾

”اسی طرح بے گناہ مسلمانوں کے ہولے کئے جاتے تھے۔ اور یوں تڑپا تڑپا کے انہیں مارا جاتا تھا۔“ (ص ۱۳۰)

بہر حال قتل و غارت، خوزیزی و خوں خواری اس تحریک کی روح تھی۔ دماغوں کو اتنا مسحور کیا گیا تھا کہ جب فرخ سیر نے اپنے زمانہ میں سکھوں کی ان ظالمانہ چیرہ دستیوں کا قرار واقعی علاج کرانا چاہا اور عبدالصمد خاں تورانی صوبہ دار کشمیر اس مہم پر متعین ہوا۔ جس نے بڑی دلیری سے ہند اور اس کے ساتھیوں پر قابو حاصل کر کے سب کو گرفتار کر کے دہلی روانہ کیا، بادشاہ کے پاس ہزار ہا غریب و بے کس مسلمانوں کی فریاد و زاری کی عرضیاں پہنچی ہوئی تھیں۔ جب حکم دیا گیا کہ اب اُن سے انتقام لیا جائے تو بقول طباطبائی اس وقت کا سماں عجیب تھا۔

﴿سکھوں کا جذبہ قربانی﴾

﴿قصیدے۔ عجیب از آں جماعت مسوع شدہ کہ در کشتہ شدن یکے بر دیگرے سبقت می جست و مثبت جلا دی نمود کہ اول اورا ابکشید﴾ (ج ۲ ص ۴۰۳)

”عجیب قسم کی سخت جانی اس گروہ کے متعلق سننے میں آئی یعنی مارے جانے میں ایک دوسرے سے آگے، بڑھنے کی کوشش کرتا۔ جلا دی خوشامد کرتا کہ پہلے اُسے مار ڈالا جائے۔“

﴿باطل کے لئے مرجانے اور حق پر جان دینے کا فرق﴾

کتنی عجیب بات ہے۔ حق ہو یا باطل اس قسم کی قربانیوں اور دیدہ دلیریوں کے نظائر کی تاریخ میں کچھ کی نہیں ہے۔ لیکن پھر بھی کچھ لوگ ہیں جو ہر چیز سے قطع نظر کر کے کسی کے

تصلب و استقلال یا جذبہ قربانی کو اس کی صداقت کی دلیل بنا لیتے ہیں۔ کس لئے مرا؟ یہ نہیں دیکھتے۔ بلکہ کسی بات پر ہٹ کرتے ہوئے مرجانا بس یہی ان کے نزدیک ان کے خیال کی صحت اور اس کے مسلک کی راستی کی کافی شہادت ہے۔ حالانکہ اگر حق و باطل کا یہی معیار ہے تو سمجھ میں نہیں آتا کہ ابو جہل اور سید الشہداء حمزہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ میں یہ دیوانے کس بنیاد پر امتیاز پیدا کرتے ہیں۔ آخر ابو جہل نے قربانی کی کوئی ایسی قسم تھی جو پیش نہیں کی۔ مال لٹایا، گھر چھوڑا، در چھوڑا اور بالآخر اپنے مسلک پر اصرار کرتے ہوئے بدر پہنچ کر اسی راہ میں اپنی جان بھی دے دی پھر کیا واقعی محض اس لئے ابو جہل ہونے کے بجائے ابوالحکم قرار دیا جاسکتا ہے۔ جس نے بھی اپنے جان دے دی۔ بس اس کے بلندی رتبہ کا ان کے سامنے پھر کوئی ٹھکانہ نہیں رہتا۔ حالانکہ سچ پوچھئے تو ایک نہیں لاکھوں ہر زمانہ میں ہر مسلک میں آپ کو ایسے آدمی مل سکتے ہیں اور ملتے رہتے ہیں اور اس وقت بھی مل رہے ہیں۔ جو کسی بڑی چیز کے لئے نہیں صرف پندرہ روپے ماہوار کے لئے فوجوں میں اس لئے بھرتی ہونے پر تیار ہیں کہ جب جی چاہے ان کی گردن ان کے سروں سے اتار لی جائے۔ پھر کیا اس کے یہ معنی ہیں کہ فوج کا ہر سپاہی قربانی و ایثار، استقامت و استقلال کا پیکر مجسم اور مظہر اسم ہے؟ صرف اس لئے کہ بجائے کسی بڑے نصب العین کے عام فوجی سپاہیوں کے سامنے محض چند روپے ہوتے ہیں جن کے لئے وہ اپنی جانوں سے بھی دست بردار ہو جاتے ہیں۔ ان کی کوئی عظمت کسی دل میں نہیں پائی جاتی! یہی واقعہ ہے اور یہی فطرت کی شہادت ہے۔

بڑی جہالت ہے کہ کس لئے جان دی؟ اس سوال کی تحقیق کرنے سے پہلے لوگ غل مچا دیتے ہیں کہ فلاں نے جان دے دی۔ اب اس سے زیادہ اس کی راست بازی کی اور کیا دلیل ہو سکتی ہے۔

آج بھی تحریکوں کی صداقت و عدم صداقت کا معیار جاہلوں میں صرف یہی چیز بنی ہوئی ہے۔ کبھی کسی مسلک کی تصدیق اس لئے کی جاتی ہے کہ اس پر چلنے والے بڑے منظم ہیں، بڑے اولوالعزم ہیں۔ ہندوستان ہی نہیں ہندوستان کے باہر بھی اپنے خیال کے پرچار میں دیوانہ وار مارے مارے پھرتے ہیں۔ کبھی کہا جاتا ہے کہ آخر جو نہ کسی سے کچھ لیتے ہیں اور نہ مانگتے ہیں بلکہ اپنی جیب سے اپنی وردیاں بناتے ہیں، بیچ خریدتے ہیں۔ کرایہ یا بلا کرایہ ریل

گاڑیوں پر سفر کرتے ہیں۔ ہر بڑی سے بڑی قوت سے ٹکرا جانے پر ہر وقت تیار رہتے ہیں۔ نہ اپنی جائیدادوں کی انہیں کوئی پروا ہے۔ نہ اپنی اولاد کی فکر ”جان عزیز یہ“ ہر وقت ان کی مٹھی میں دھری ہے۔ معمولی اشاروں پر اسے باسانی پھینک دینے پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ آخر اس سے بڑھ کر ان کی سچائی اور خدا کی مرضی کے مطابق ہونے کی اور کیا دلیل تلاش کی جاتی ہے..... میں یہ نہیں کہتا کہ بجائے خود یہ صفات اچھے نہیں ہیں۔ لیکن لکڑی کا ٹٹے کے لئے جسے تیشہ دیا گیا۔ اگر بجائے لکڑی کے وہ مسجد کی دیوار کھودنے لگے تو اس میں ”تیشہ“ کی بُرائی نہیں، استعمال کرنے والے کی غلطی ہے۔ سعدیؒ نے اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا تھا:

ترا تیشہ دادم کہ ہیزم شکن
نہ گفتم کہ دیوار مسجد بکن

آپ یہ نہ دیکھئے کہ اس کے ہاتھ میں کیا ہے۔ بلکہ یہ دیکھئے کہ وہ اپنے ہتھیار کو کن چیزوں پر چلا رہا ہے۔ تنظیم، اتحاد ایثار، قربانی یہ قدرت کے اہل قوانین ہیں۔ جن کے بغیر اپنے ”نصب العین“ کی تکمیل میں بمشکل ہی کوئی کامیاب ہو سکتا ہے۔ مگر بذات خود ان کی کوئی قیمت نہیں ہے۔ اگر کسی اچھے بلند نصب العین کے لئے انہیں استعمال کیا جائے تو یہ بہترین چیزیں ہیں لیکن اگر شر و فساد، خونریزی و تباہ کاری، اضلال و تسویل نوامیس شرعیہ کی توہین، اہل حق کی تحقیر کا ذریعہ ان ہی چیزوں کو بنایا جائے تو پھر ان صفات سے زیادہ بدتر کوئی چیز نہیں ہو سکتی۔

خیر یہ تو جملہ معترضہ تھا۔ چونکہ مجھے شمال مغرب کی قدیم تحریک اور جدید تحریک میں گونہ مشابہت نظر آرہی ہے۔ اس لئے ان چند اشارات کا ذکر مناسب معلوم ہوا..... اب میں اپنے مقصد کی طرف رجوع کرتا ہوں۔

میرا مطلب یہ ہے کہ سکھوں کے جس فتنہ کا اجمالی نقشہ آپ کے سامنے پیش کیا گیا۔ آپ کو تو اس وقت یہ سنایا جا رہا ہے۔ لیکن دین کے جس دیوانے اور شمع محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کے جس پروانے کا نام ”ولی اللہ“ تھا اسے یہ سب کچھ دکھایا جا رہا تھا۔ ٹھیک جن دنوں پنجاب ہند کی ترک تازیوں سے قیامت کا نمونہ بنا ہوا تھا۔ اسلامی حکومت اس کا اور اس کے ساتھیوں کا تعاقب کرتی تھی۔ لیکن

بہند مذکور کمتر مقابل افواج پادشاہی میکشت۔ اکثر بطور چپاؤلی و قطاع

الطریق در اطراف و جوانب و دیدہ یک جانبی آسود، ہر جا قابوی یافت و قتل و غارت و تخریب مساجد و بنش قبور مسلمان قصور نمی نمود ﴿﴾ (طباطبائی ج ۲ ص ۴۰۲)

”مذکورہ بالا بنڈا بادشاہی فوج کا سامنا بہت کم کرتا تھا۔ بلکہ زیادہ تر (گوریلا وار) کے طور پر چھپ چھپا کے حملے کرتا تھا اور اطراف و جوانب میں راہزنی کرتے ہوئے پھرا کرتا ایک جگہ اپنا ٹھکانہ بنا کر نہیں رہتا تھا۔ جہاں موقع مل جاتا قتل و قتال، لوٹ مار اور مسجدوں کی بربادی، مسلمانوں کے مقابر کے اکھاڑے میں کمی نہیں کرتا۔“

بنڈا کے یہ ساتھی جس وقت دلی میں خود اپنے قتل میں منت جلا د میں سبقت کر رہے تھے۔ حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ اس وقت دلی بنی میں موجود تھے اور یہ سارے واقعات ان کے سامنے گزر رہے تھے۔ ان صفات کے زیر اثر جو تحریک اٹھائی گئی ہو، عوام کو اس کی اہمیت کا ممکن ہے صحیح اندازہ نہ ہو۔ لیکن جس نے حجۃ اللہ البالغہ اور خیر الکثیر، ازالۃ الخلفاء جیسی ولی الہی تصنیفات کا مطالعہ کیا ہے اور حضرت شاہ صاحب کی نگاہ عقابیں کا اسے تجربہ ہے، وہ سمجھ سکتا ہے کہ ان حالات کو دیکھ دیکھ کر قرآن و حدیث کے اس عاشق جانناز پر کیا گزر رہی ہوگی۔ مسلمانوں کے بھیانک انجام کی جو تصویر ان کے سامنے گھوم رہی ہوگی۔ ارباب بصیرت ہی اس کا کچھ اندازہ کر سکتے ہیں۔ ایک طرف پنجاب سے یہ آندھی اٹھی تھی اور بتدریج تیز سے تیز تر ہوتی جا رہی تھی۔ سلطنت و حکومت کی قوتیں بھی اس کے مقابلہ میں بسا اوقات اپنے کو گھٹنے ٹیکنے پر مجبور پار ہی تھیں کہ شیواجی کے دماغ نے ”دکن“ کا جو ”الاؤ“ جوڑا تھا۔ عالمگیر انا اللہ برہانہء کی کئی سالہ مسلسل کوششوں سے اگرچہ وہ کبھی کبھی دب دب جاتا تھا لیکن سچی بات یہی ہے کہ جیسا کہ اسی طباطبائی نے لکھا ہے کہ

﴿﴾ عالمگیر خود بہ نفس نفیس متوجہ دکن شد و بست و پنج سال کامل در گوشالی مرہٹہ صرف نمود۔ اما از تہادن بعض امراء رکاب کہ برائے اغراض خود انفصال ہنگامہ مرہٹہ نمی خواستند استیصال جماعتہ مرہٹہ صورت نہ گرفت ﴿﴾ (ج ۳ ص ۹۲۳)

”عالمگیر نے بذات خود دکن کی طرف رخ کیا اور پورے پچیس سال مرہٹوں کی گوشالی میں صرف کئے لیکن شاہی رکاب میں جو امراء تھے۔ ان کی سستی و کاہلی

سے جس میں ان کے اغراض پوشیدہ تھے معاملہ کا قطعی فیصلہ نہ ہونے پایا۔ یا امراء اپنے ذاتی اغراض کے تحت مرہٹوں کے ہنگاموں کو ختم کرنا ہی نہیں چاہتے تھے۔“

بلکہ اورنگ زیبی پیچھے فولا دیں کے دباؤ کے اٹھ جانے کے بعد اس قوم کو صرف دکن اور کوکن ہی نہیں بلکہ تقریباً ہندوستان کے اکثر علاقوں میں تگ و تاز، تاخت و تاراج کا کھلا میدان مل گیا، ”برگی“ جو مرہٹہ غارت گروں کا کپکپا دینے والا نام تھا، اس سے ملک کے اکثر و بیشتر صوبے پامال ہو رہے تھے۔ خود دہلی پر اکثر مرہٹوں کے حملے ہوتے تھے اور حکومت ان کے مقابلہ سے دن بدن اپنے کو عاجز پاتی چلی جا رہی تھی۔ یہ واقعات ہیں جن سے عامی و خاصی سب ہی واقف ہیں۔

﴿سکھ تحریک اور مرہٹہ تحریک کا ایک خاص فرق﴾

لیکن اس سلسلہ میں ایک چیز قابل غور ہے کہ مغربی شمالی گوشہ سے جو فتنہ اٹھا تھا، جیسا کہ بیان کیا گیا۔ ابتداء اس کی شکل ایک مذہبی اصلاحی تحریک کی تھی اور غالباً انتقامی جذبات کے تحت اس نے سیاسی کروٹ لی۔ لیکن اسی کے مقابلہ میں جس تحریک کی ابتداء جنوبی ہند سے ہوئی تھی عجیب بات ہے کہ بجائے کسی مذہبی اصلاحی تحریک کے شروع ہی سے اس کا آغاز ایک ایسی سیاسی تحریک کی شکل میں ہوا جس کا مقصد ہندوستان کو قدیم پراجین تہذیب کی طرف واپس لے جانا تھا۔ پنجاب کی تحریک کا تعلق عوام کے مذہبی خیالات کی اصلاح سے تھا اور چونکہ اس کا بانی ہندوؤں کی کسی اعلیٰ ذات سے نہیں بلکہ قوم کھتری سے تعلق رکھتا تھا۔ اس لئے ہر طبقہ کے عوام اس میں شریک ہوتے تھے۔ صاحب سیر المتاخرین کا بیان ہے کہ سکھ لوگوں کا دستور تھا کہ

”ہر چند از فرق مختلفہ باشند ہر گاہ ایں مسلک اختیار نمایند اجتناب و احتراز از ہم و گر بقاعدہ مستمرہ بضابطہ دیرینہ ہنود نمی کنند۔ اگر چہ از مابعد فرق اوشتند“ (ص ۴۰۰)

لیکن جنوبی ہند کی تحریک کے بانی چونکہ شیواجی سمجھے جاتے ہیں۔ اور ان کا نسلی تعلق اودے پور کے راناؤں سے بتایا جاتا ہے۔ اس لئے شروع سے ہندوؤں کے اعلیٰ طبقے اس میں شریک رہے۔ حتیٰ کہ آخر میں تو مرہٹہ تحریک کی جوانان بالاجی المعروف بہ پیشوا کے ہاتھ میں

آگئی تھی جو براہ راست کوکئی برہمن تھا۔

گویا آج جنوبی ہند سے جس تحریک کی ابتداء ہوتی اور بالآخر اس وقت تمام دوسرے صوبوں کی مختلف تحریکیں بھی دب دبا کر اسی میں ہضم ہو چکی ہیں۔ اس تحریک کی خصوصیت بھی وہی ہے جو پہلے کی تھی۔ علامہ غلام علی آزاد بلگرامی جن کی زندگی کا بڑا حصہ مرہٹواڑی میں گزرا ہے۔ اور اس قوم کے عادات و اطوار، مقاصد اور منصوبوں سے جتنی زیادہ واقفیت اس مورخ کو حاصل ہو سکتی تھی، دوسروں کو اس کے مواقع حاصل نہ تھے وہ یہ لکھتے ہوئے کہ:-

”حق اعلم است و کفنی بہ شہیداً کہ ایں ہمہ امور مطابق بقلم آمدہ و تعصب و تصنع اصلاً دخلے ندارد“

”اللہ تعالیٰ جانتا ہے اور گواہ ہونے کے لئے وہ کافی ہے کہ (جو کچھ لکھا جا رہا ہے) یہ سب کچھ وہی ہے۔ جو واقعات کے مطابق ہے تعصب یا بناوٹ کو اس میں قطعاً دخل نہیں ہے۔“

مرہٹہ تحریک کے نصب العین کو ان الفاظ میں ادا فرماتے ہیں:-

”مخفی نہ اند کہ فریقین مذکور تین عینے دارند کہ ہر جادست یا بند و جوہ معاش جمیع خلق را بند کردہ بہ طرف خودی کشند و زمینداری و مقدمی و عمل پٹواری گری ہم باقدیں نہ گذاشتہ۔ اساس دارشاں کار ہائے مذکور از پنج و بن برکنندہ بنیاد دخل و تصرف خود قائم کنند“

”لوگوں سے یہ بات پوشیدہ نہ رہے کہ دونوں فرقوں (مرہٹہ اور کوکئی برہمن) کی نیت یہ ہے کہ جہاں ان کو قابو حاصل ہو جائے۔ وہاں خدا کی ساری مخلوق کے ذرائع معاش کو بند کر کے اپنی طرف ان کو سمیٹ لیں۔ زمینداری و مقدمی پٹواری کا کام ان پیشوں کو بھی پرانے لوگوں کے ہاتھوں میں انہوں نے باقی نہیں چھوڑا ہے۔ جو بے چارے ان لوگوں کے وارث ہیں ان کی توجڑ نکال کر انہوں نے پھینک دی اور سب پر اپنا عمل دخل قائم کر لیا۔“

یہ ساری عبارت ان کی کتاب ”خزانہ عامرہ“ سے منقول ہے۔ طلباء ہائی نے بھی مجھے اپنی کتاب میں اس کو نقل کیا ہے۔

آخر میں ان کے ”اندرونی منصوبے“ کا ذکر ان الفاظ میں فرماتے ہیں:-

﴿می خواہند کہ مالک تمام رائے زمین بشوند﴾

”یہ لوگ یہ چاہتے ہیں کہ تمام روئے زمین کے مالک بن جائیں گے۔“

اگرچہ بے چارے میر صاحب نے اس کے بعد اپنے ایمانی خیالات کا اظہار ان

الفاظ میں فرمایا ہے کہ:-

﴿رزاق مطلق تعالیٰ شہد کہ روزی رساں ہندو مسلمان است برآست رزق

اصناف خلایق بر ہمیں زمین نوشتہ تمام این مملکت ہر یک قوم چہ طور مسلم تواند

ماند﴾

”رزاق مطلق اللہ تعالیٰ جو ہندو اور مسلمان دونوں کا روزی پہنچانے والا ہے۔

اسی نے ہر ایک روزی کا حصہ اسی سر زمین (ہند) میں مقرر فرمایا ہے۔ یہ سلطنت

کسی ایک قوم کے فائدہ کے لئے کس طرح مخصوص کی جاسکتی ہے۔“

﴿ہندوؤں کی موجودہ سیاسی سرگرمیوں کا رخ اور ان کا مقصد﴾

لیکن میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ جنوبی ہند سے شروع ہونے والی موجودہ سیاسی تحریک کو

(جس کی قیادت عملاً اعلیٰ طبقہ کے ہندوؤں ہی کے ہاتھ میں ہے) جو لوگ مغربی کلیات اور

کالجوں کی تعلیم کا نتیجہ قرار دیتے ہیں اور اس بنیاد پر اس قوم کا گن گایا جاتا ہے اور کم از کم اس کے

وجود کا یہ فائدہ بتایا جاتا ہے کہ اسی کی بدولت سوتے ہوئے جاگ پڑے۔ ان کو غور کرنا چاہئے کہ

اس میں کہاں تک حقیقت کا عنصر شریک ہے۔

﴿کیا ہندوستان کی تقسیم سے ہمارے مرض کا علاج ہو سکتا ہے﴾

”اور اس کے بعد مجھے ان لوگوں سے عرض کرنا ہے جو اسی مسئلہ ”رزق“ کے حل کی یہ

صورت نکال کر مطمئن ہونا چاہتے ہیں کہ ہم ملک کا کوئی گوشہ اپنے لئے الگ کر کے آباد ہو جانے

میں کامیاب ہو جائیں گے تو پھر روز کی اس کھٹ کھٹ سے نجات مل جائے گی اول تو جنگ و

جدال اور باہمی نزاع و فساد کے لئے صرف ہندو مسلمان کی تفریق کی ضرورت نہیں۔ چاہئے

والے اگر چاہیں گے تو شیعہ سنی کے مسئلہ میں بھی اس سے زیادہ خونریزیاں محض ایک لفظ ”وہابی“ وغیرہ وہابی یا ”دیوبندی“، ”بریلوی“ یا ازیں قبیل دوسری تقسیموں سے پھیلائی جاسکتی ہیں۔ پھر جن لوگوں نے مرض کا یہ علاج تجویز کیا ہے میں اگر ان کے متعلق یہ باور کرتا ہوں کہ ان کی نظر دُور نہیں پہنچی ہے تو کیا غلط سمجھ رہا ہوں اور بالفرض مسلمانوں کے بانٹنے یا بٹوانے میں بانٹنے والی قوتوں کو کسی وجہ سے کامیابی نہ بھی ہو۔ لیکن جس کا نصب العین آج ہی نہیں بلکہ آج سے صدیوں سے پہلے یہ تھا کہ

﴿می خواہند کہ مالک تمام روئے زمین شوزر﴾

”چاہتے ہیں کہ تمام ”روئے زمین“ کے مالک ہو جائیں۔“

آخر اُن سے ہم کہاں تک بھاگ بھاگ کر پناہ لیں گے۔ آپ ہندوستان ہی کے متعلق سوچ رہے ہیں کہ اس ملک کے کسی علاقہ میں ہمیں چین نصیب ہو سکتا ہے۔ اگر ان سے بالکل الگ ہو جائیں، لیکن ہندوستان تو بقول اُن کے ”ہندوستان“ ہے جو ”ہندوستان“ نہیں ہے۔ جب وہ بھی ان کے ”می خواہند“ میں داخل ہے تو آخر صرف جدائیگی اور بٹوارہ کو جو ہر مرض کی دوا خیال کیا جا رہا ہے۔ کہاں تک صحیح ہو سکتا ہے۔ زندگی اور حیات کے قدرتی قانونوں سے محروم ہونے کے بعد محض لاشوں کے چہروں پر غارے ملنے سے کسی کو زندہ نہیں خیال کیا گیا ہے اور نہ اُن سے زندگی کے آثار نمایاں ہو سکتے ہیں۔ ہمارے پاس ہماری کتاب میں ہمارے پیشوا (صلی اللہ علیہ وسلم) کی تعلیم میں جینے کے جو اصول بتائے گئے ہیں، ان سے کٹ کر جو باوجود ادعا اسلام کے اپنی خود تراشیدہ تدبیروں کے ذریعہ جینا چاہتے ہیں، میں نہیں سمجھتا کہ وہ اپنے کو کس طرح زندہ رکھ سکتے ہیں۔

بہر حال ایک طرف پنجاب سے سکھوں کا فتنہ تھا جو بڑھتے ہوئے بادل کی طرح مسلمانوں پر چھاتا چلا جاتا تھا اور بے دردی سے بجائے پانی کے ان پر آگ برسا رہا تھا اور دوسری طرف جنوبی ہند کا مڑنی سیلاب تھا۔ جس میں جنوب سے شمال اور مشرق سے مغرب تک کہ مسلمان اپنے ڈوبنے اور بہنے کا تماشا دیکھنے کا انتظار کر رہے تھے۔

﴿مرہٹہ گردی﴾

مرہٹے ملک میں اس کنارے سے اُس کنارے تک جہاں تک پہنچ سکتے تھے پہنچ کر

﴿ہر جا آبادی یافت سوختہ غارت کردہ بھاگ برابر ساختہ﴾ (سیرج ۲ ص ۴۷۵)
 ”جہاں کہیں آبادی انہوں نے پائی اُسے جلا کر، لوٹ کر زمین کے برابر کرتے
 چلے گئے۔“

حتیٰ کہ خود دہلی کو اس وقت جس وقت شاہ صاحب کی عمر چونتیس سال کی تھی۔ اور
 کالکے کے میلہ کا تماشا دیکھنے کے لئے ہندو مسلمان شہر سے باہر ہو گئے تھے۔ مرہٹوں نے

﴿دلی پر مرہٹوں کی تاخت اور دوسری اسلامی بستیوں کی بربادی﴾

﴿از دحام عظیم نمودہ بخاطر جمع غارت نمود مال و افراد و خست شب نزدیک مزار
 خواجہ قطب الدین ماندہ صبح روز چہار شنبہ یوم العرصہ مینا بازارہ دوکانہائے آبادی
 آں جا را سوختہ غارت نمود﴾ (صفحہ ۴۷۶)

”ہلہ کر کے ایک بڑی بھیڑ کے ساتھ باطمینان تمام دلی کو لوٹا اور بہت دولت
 جمع کی رات جب قریب ہوئی تو حضرت خواجہ قطب الدین (کاکا) کے مزار
 کے پاس شب گزار کر صبح بدھ کے دن جو عرصہ کا دن تھا مینا بازار اور آبادی کی
 دکانوں کو آگ لگا کر بھسم کیا اور سب کو لوٹ کھسوٹ لیا۔“

اور یہاں سے پلٹنے کے بعد مسلمانوں کی مشہور بستیاں

﴿قصبہ ریواڑھی و پاٹوڈھی رفتہ۔ ہر دو قصبہ را چناں کہ خواست غارت نمودہ از
 شیخ و بن براقلند﴾

”قصبہ ریواڑھی و پاٹوڈھی گئے اور دونوں قصبوں کو جیسا اُن کے جی میں آیا لوٹا،
 غارت کیا اور ان آبادیوں کی شیخ و بنیاد اکھاڑ دی۔“

﴿عید قربان کے دن مسلمانوں کی قربانیاں﴾

گویا ٹھیک عید الاضحیٰ کے دن مسلمانوں کی قربانیاں کر کے یہ اپنے حرص و آرزو کے دیوتاؤں کو خوش کر رہے تھے سوچنے والے سوچ سکتے ہیں کہ اس ماحول میں اوروں کا جو حال ہوگا وہ تو بجائے خود، لیکن جس سینہ میں ”اطیب النعم“ کا سوز بھرا ہوا تھا۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی امت مرحومہ کے اس حال کو دیکھ دیکھ کر، سن سن کر اس پر کیا گزرتی ہوگی!

﴿حضرت شاہ صاحب کا ایک تاریخی خواب﴾

کون کہہ سکتا ہے کہ حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے اس مشہور خواب میں جس کا تذکرہ ”فیوض الحرمین“ میں آپ نے فرمایا ہے۔ ان احاسیات کو دخل نہ تھا۔ درحقیقت اسی سلسلہ میں آپ کی آرزوؤں اور ہمت دعا کی توجہات ہی نے عالم مثال میں یہ شکل اختیار کی تھی۔ فیوض الحرمین کے پڑھنے والے تو اس خواب میں واقف ہیں۔ لیکن نہ پڑھنے والوں اور نہ جاننے والوں کے لئے میں مجسمہ اصل عبارت کے ساتھ درج کرتا ہوں۔ فرماتے ہیں:-

﴿رأيتني في المنام قائم الزمان اعني بذلك ان الله اذا اراد شيئاً من نظام الخير جعلني كالجارحة لاتمام مواده و رأيت ان ملك الكفار قد استولى على بلاد المسلمين و نهب اموالهم و سب اذريتهم و اظهر في بلدة اجميز شعائر الكفر و ابهل شعائر الاسلام (العياذ بالله) فغضب الله تعالى علي اهل الارض غضباً شديداً و رأيت صورة هذا الغضب متمثلة في الماء الاعلى ثم ترشح الغضب الي فرائتي غضباناً من جهة نقت من تلك الحضرة في نفسي لا من جهة ما يرجع الي هذا العالم و اناسا حثيثاً في جم غفير من الناس منهم الروم منهم الازابكة و منهم العرب بعضهم ركبان الابل و بعضهم فرسان و بعضهم مشاة على اقدامهم و اقرب مراثيت شهباً بهولاء الحجاج يوم عرفة و

رايتهم غضباناً لغضبى و سالونى ماذا حکم اللہ فى هذه الساعة
قلت فك كل نظام قالوا الى متى قلت الى ان تزرنى قد
سکست غضبى فجعلوا يتقاتلون بينهم و يضربون اليهم فقتل
منهم كثير و انكسرت رؤس ابلهم و شفا همائم انى تقدمت الى
البلده اخربها و اقتل اهلها فتبعونى فى ذلك و كذا لك خزينا
بلدة بعد بلدة حتى و صلنا الاجمير و قتلنا هنالك الكفار و
استخلصنا ها منهم و سيناً ملك الكفار ثم رأيت ملك الكفار
بماتبى مع ملك الاسلام فى نفر من المسلمين. نامر ملك
الاسلام فى اثنا ذلك بذبحه فبطش به القوم و صرعوه و ذبحوه
بسكين فلما رأت الدم يخرج من او داجه متد فقا قلت الان
نزلت الرحمة و رأت الرحمة و السكينة مثلت من باشر القتال
من المسلمين و صار و امر حومين فقام الى رجل و سألنى عن
المسلمين اقتتوا فيما بينهم فتوقفت عن الجواب ولم اصرح ﴿
(ص ۸۹-۹۰)

”میں نے خواب میں اپنے کو دیکھا کہ میں قائم الزمان ہوں جس کا مطلب یہ
ہے کہ اللہ تعالیٰ جب بھلائی اور خیر کے کسی نظام کو قائم فرمانا چاہتا ہے تو اس وقت
مجھے اس مقصد کی تکمیل کے لئے گویا ایک آلہ اور واسطہ بناتے ہیں اور میں نے
دیکھا کہ کفار کا راجہ (یا بادشاہ) مسلمانوں کے بلاد پر مسلط ہو گیا اور ان کے
اموال کو اس نے لوٹ لیا ان کی عورتوں اور بچوں کو گرفتار کر لیا اور اجمیر شہر میں
اس نے کفر کے شعار کا اعلان کر دیا شعار اسلام کو اس نے مٹا دیا (خدا کی پناہ)
پھر اس کے بعد یہ دیکھا کہ زمین کے باشندوں پر حق تعالیٰ غضبناک ہوئے اور
سخت غضبناک اور میں نے حق تعالیٰ کے غصہ کی صورت کو ملاء اعلیٰ میں متشکل
ہوتے ہوئے دیکھا پھر وہاں سے ٹپک ٹپک کر وہی الہی غیظ میرے اندر اترا پھر

میں نے اپنے کو غضبناک پایا اور یہ غضب جو مجھ میں بھر گیا تھا حضرت الہیہ کی طرف سے مجھ میں دم کیا گیا تھا اس کا منشاء کوئی ایسی چیز نہ تھی جس کا تعلق اس عالم سے ہو اور میں نے اس وقت اپنے کو ایک بڑے مجمع میں پایا جس میں روم والے بھی اور ازبکی (ترک) بھی اور عرب بھی اور بعض ان میں اونٹوں کے سوار تھے اور بعض اس پر سوار اور بعض پیدل، قریب قریب اس گروہ کی حالت ایسی معلوم ہوتی تھی جیسے عرفہ کے دن حجاج کی ہوتی ہے پھر میں نے ان لوگوں کو بھی اپنے غضبناک ہونے کی وجہ سے غصہ میں بھرا پایا۔ ان لوگوں نے مجھ سے پوچھا کہ اس وقت اللہ تعالیٰ کا کیا حکم ہے میں نے کہا کہ ”ہر نظام اور آئین کو توڑ دینا“ یہی حکم ہے۔

انہوں نے دریافت کیا یہ حال کب تک رہے گا؟ میں نے کہا کہ اس وقت تک جب تک تم میرے غصہ کو ٹھنڈا ہوتا نہ پاؤ پھر وہ باہم آپس میں لڑنے لگے اور جانوروں کو مارنے لگے پھر ان میں سے بہت سے مارے گئے ان کے اونٹوں کے سر ٹوٹے اور لب چور ہوئے پھر میں ایک شہر کی طرف اسے برباد کرتے ہوئے اور اس کے باشندوں کو قتل کرتے ہوئے آگے بڑھا۔ لوگ میرا ساتھ دے رہے تھے۔ یوں ہی ایک شہر کے بعد دوسرے شہر کو تباہ و برباد کرتے ہوئے ہم بالآخر اجمیر پہنچ گئے اور وہاں ہم نے کفار کو قتل کیا پھر میں نے کفار کے بادشاہ کو دیکھا کہ وہ اسلام کے بادشاہ کے ساتھ مسلمانوں کے ایک گروہ میں ساتھ ساتھ چل رہا ہے اتنے میں اسلام کے بادشاہ نے کفار کے بادشاہ کے متعلق حکم دیا کہ اسے ذبح کر دیا جائے لوگوں نے اسے پکڑ کر دے پٹکا اور چھری سے اُسے ذبح کر دیا۔ میں نے جب دیکھا کہ اس کی گردن کی شرگوں میں سے خون اُچھل اُچھل کر نکل رہا ہے تب میں نے کہا اب رحمت نازل ہوگئی اور میں نے دیکھا کہ یہ جو مسلمانوں میں لوگ جنگ میں شریک تھے ان کو اس رحمت و سکون نے احاطہ کر لیا اور ان پر رحم کیا گیا پھر ان میں سے ایک آدمی اٹھ کر

میرے پاس آیا اور ان مسلمانوں کے متعلق پوچھا جو باہم لڑتے تھے۔ میں جواب میں خاموش ہو گیا اور کوئی تصریح میں نے نہ کی۔“

شاہ صاحب عام طور پر اپنے خوابوں کے آخر میں تاریخ درج نہیں کرتے۔ لیکن اس خواب کی تاریخ لکھی ہے۔ اسی طرح ایک اور خواب جس کا ذکر آئندہ آئے گا۔ اس میں انہوں نے یہی کیا۔ بہر حال اس خواب کی تاریخ انہوں نے یہ درج کی ہے:-

﴿روایت ذلک فی لیلۃ الجمعة الحادیۃ والعشرین من ذی القعدہ﴾ (۱۱۴۴ھ)

”میں نے یہ خواب شب جمعہ ۲۱ ذی قعدہ ۱۱۴۴ھ کو دیکھا۔“

﴿شاہ صاحب کے اس خواب کی تعبیر پانی پت کی مشہور تاریخی جنگ﴾

ٹھیک اس تاریخ سے ۲۹ سال بعد یعنی ۱۱۷۳ھ میں اپنی وفات سے تین سال پہلے اسی شخص نے جس نے گزشتہ بالا واقعات کو خواب میں دیکھا تھا اپنے سر کی آنکھوں سے وہی شخص ایک اور واقعہ دیکھتا ہے جس میں بجائے اجمیر کے اگر دلی کا لفظ شامل کر دیا جائے تو تقریباً جو کچھ خواب میں دیکھا گیا تھا بیداری میں ”کفلق الصبح“ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پھر اسی کا معائنہ کرایا گیا اس سے میرا اشارہ پانی پت کے مشہور فیصلہ کن معرکہ کی طرف ہے جو تاریخوں میں ”مرہٹہ اور ابدالی کی جنگ“ سے موسوم ہے چونکہ ”ہندوستانی تاریخ“ کی ہر چھوٹی بڑی کتاب میں یہ واقعہ یا اس کا کچھ نہ کچھ حصہ ضرور مذکور ہے اس لئے تفصیل کی تو یہاں گنجائش نہیں۔ لیکن سیر المتاخرین جو تقریباً تمام پچھلی تاریخوں کا ماخذ ہے اسی سے بعض جستہ فقرے یہاں نقل کئے جاتے ہیں۔

﴿خواب اور بیداری کے واقعات کا انطباق﴾

میں نے جو یہ کہا کہ بجائے ”اجمیر“ کے دلی فرض کی جائے یہ بھی محض فرض نہیں ہے۔ بلکہ ہندوستان کے ”خالص اسلامی مرکز“ کو کفر کے احاطہ میں چونکہ دکھانا مقصود تھا اور دلی کو ظاہر ہے کہ مسلمانوں کے ساتھ کوئی خاص خصوصیت نہیں ہے۔ جس طرح اسلامی بادشاہوں

نے اسے دارالسلطنت بنایا تھا۔ ہندوؤں کا اندر پرست بلکہ ”ہستناپور“ دلی ہی کے کھنڈروں میں موجود ہے اور آج ”رائے سینا“ بھی دلی ہی کے اطراف میں موجود ہے علاوہ اس کے ”دلی“ زیادہ سے زیادہ مسلمانوں کا مرکز تھی۔ لیکن ہندوستان میں مسلمانوں ہی کا نہیں بلکہ اسلام کا سب سے پہلا مرکز تو وہی ہے۔ جہاں سے ولی الہند (یا بقول عوام ہندالولی) حضرت خواجہ بزرگ رحمۃ اللہ علیہ نے

کرداز ”اجمیر“ کا انبیاء

بے کتاب و بے پرلیں و مدرسہ

اور یہ تو ان کے لئے کہہ رہا ہوں جو نہیں دیکھتے ہیں، پر جو اس محسوس نظام کو کسی غیر محسوس نظام کے ساتھ وابستہ پارہے ہیں، وہ جانتے ہیں کہ ”اجمیر“ کا تعلق ہندوستان کے محیط سے کیا ہے۔ خیر کسی وجہ سے بھی سہی۔ آپ اجمیر کی جگہ دلی پڑھ لیجئے اور اس کے بعد مورخین نے ابدالی اور مرہٹوں کی اس فیصلہ کن جنگ کا حال لکھا ہے اسے پڑھیئے، پھر اندازہ کیجئے کہ ۱۱۴۲ھ میں جو کچھ خواب میں دیکھا گیا تھا کیا اسی کا ۱۱۷۳ھ میں مشاہدہ نہیں کرایا گیا شاہ صاحب نے لکھا ہے کہ پہلے میں نے دیکھا کہ ملک الکفار مسلمانوں کے بلاد پر مسلط ہو گیا اور ان کے اموال کو اس نے لوٹ لیا اور ان کی اولاد کو قید کر لیا۔ طباطبائی لکھتے ہیں:-

﴿لال قلعہ پر مرہٹوں کا قبضہ﴾

﴿نوز و الحجہ سال مذکور ۱۱۷۳ھ قلعہ (لال قلعہ) بدست بہاؤ افتادہ۔ حرم سرائے شاہی و جمیع کارخانجات سلطنت باختیار مرہٹہ رفت ذلک تقدیر العزیز العظیم﴾
(ج ۲ ص ۹۱۲)

”نویں ذی الحجہ ۱۱۷۳ھ میں لال قلعہ بہاؤ (سپہ سالار مرہٹہ) کے قبضہ میں چلا

۱۔ ممکن ہے علماء ظاہر یا ”متخبرین تخطیرا امراہم ینہم زبرا پر میری گفتگو گراں گزرے وہ باوجود“ چشتی صابری ہونے کا دعویٰ رکھنے کے اس بلند پاک سے وہ تعلق رکھنا نہیں چاہتے یا نہیں رکھتے جو حضرت شاہ صاحب کو اپنے اس جواب میں ”اسلامی مرکز“ کے رنگ میں دکھایا گیا ہے۔ مگر کیا کروں جو پاتا ہوں اس کا اظہار کرتا ہوں اپنے ان محسنوں کو کیسے بھول جاؤں جنکے صدقہ میں ایمان و اسلام کا حصہ ملا ہے۔ رضی اللہ عنہم ورضو عنہ

گیا اور شاہی حرم سرا کے ساتھ سلطنت کے تمام کارخانے مرہٹوں کے تصرف میں آ گئے۔ یہ عزیز علیم کا فتنہ تھا۔

آگے شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ اجمیر شہر پر اس کا قبضہ ہو گیا اور کفر کے شعاع کا اس نے اعلان کیا۔ اسلامی شعائر کو ختم کر دیا۔ طباطبائی کے یہ الفاظ ہیں:-

﴿بہاؤ قلعہ داری شاہ جہاں آباد بنار و شکر بہمن تفویض کرد۔ و جمعے را بہ حراست قلعہ ہمراہ او کرد﴾

”بہاؤ (سپہ سالار مرہٹہ) نے شاہ جہاں آباد و دہلی کی قلعہ داری نار و شکر برہمن کے سپرد کر کے ایک فوجی دستہ کو قلعہ کی حفاظت کے لئے اس کے ساتھ چھوڑ دیا۔“

اس سلسلہ میں ”بہاؤ“ جب یہ چال چلا کہ اپنی حکومت کو مستحکم کرنے کے لئے اودھ کے شجاع الدولہ کو اپنے ساتھ ملانا ضرور ہے اور مولوی غلام علی آزاد بلگرامی کے ایک شاگرد برہمن کو اس مہم پر شجاع الدولہ کے پاس بھیجا تو اس وقت شجاع الدولہ نے جو جواب دیا وہ مرہٹوں کی بھی اور شاہ صاحب کے خواب کی بھی کامل شرح سے شجاع الدولہ نے جواباً کہا:-

﴿از مدتے براہمہ دکن برہندوستان مسلط شدہ اند۔ روادار آبر و در فاہ و آسائش احدے از خلق خدا نیستند﴾

”ایک زمانہ سے دکن کے برہمن ہندوستان پر مسلط ہو گئے ہیں اور یہ لوگ خلق اللہ میں سے کسی کے آرام و آسائش اور فارغ البالی کے روادار نہیں ہیں۔“

اور آخر میں ان ”براہمہ دکن“ کی اس عجیب خصوصیت کا اظہار کیا ہے:-

﴿ہم را برائے خود ا قوام خودی خواہند مردم از دست ایشان بجاں آمدہ﴾

”سب کو اپنے لئے اور اپنی قوم کے لئے محکوم بنانا چاہتے ہیں۔ لوگ ان کے ہاتھوں جاں بلب ہیں۔“

خیر یہ تو جملہء معترضہ تھا۔ مجھے تو شاہ صاحب کے خواب سے غرض ہے یعنی مسلمانوں پر ملک الکفار کے غلبہ کو جس شان سے انہوں نے دیکھا تھا۔ آپ دیکھ رہے ہیں کہ من و عن وہی

صورت پیش آرہی ہے۔ ”لال قلعہ“ پر جس وقت مرہٹوں کا قبضہ ہوا ہے تو ”نہب اموال“ (لوٹ مار) میں کس حد تک وہ پہنچے تھے اس کا اندازہ صرف اس واقعہ سے ہو سکتا ہے کہ:-

﴿ تنگ ظرف مرہٹوں کی لوٹ مار کی ذلیل نوعیت ﴾

﴿ وراثت و تنگ چشمی بہاؤ بہ مرتبہ بود کہ سقف دیوان خاص پادشاہی را کہ از نقرہ مینا کار بود کندہ مسکوک ساخت و طلا آلات و نقرہ آلات مزار اقام نبوی و مقبرہ نظام الدین مغروف بہ اولیاء مرقد محمد شاہ مثل عود و سوز و شمعدان و قنادیل و غیرہ طلبیدہ مسکوک نمود ﴾ (سیرالمنابر ج ۲ ص ۹۱۲)

”بہاؤ کی پست نظری اور تنگ چشمی اس حد کو پہنچی ہوئی تھی کہ دیوان خاص کی چھت جس کی مینا کاری چاندی سے کی گئی تھی۔ اس کی سب چاندی کو کھرچ کر اس نے سکہ بنالیا۔ اور طلائی آلات چاندی کے ظروف جو قدم رسول ﷺ کی زیارت گاہ اور حضرت نظام الدین کے مقبرہ اور محمد شاہ کے مرقد میں تھے مثلاً عود سوز شمعدان، قنادیل وغیرہ کو اس نے سکہ بنالیا۔“

مرہٹوں کی اس تنگ نظری کا ذکر آزاد بلگرامی نے ان الفاظ میں فرمایا ہے:-

﴿ رسوم حق داران دیہات مثل مقدم و پٹواری و نجار و گاڈرو و حجام و حداد و غیرہم را ضبط نمودہ ﴾

”دیہات کے رسوم کے پرانے حق دار مثلاً مقدم پٹواری، بڑھئی، دھوبی، حجام لوہار سب کے حقوق کو ضبط کر لیا تھا۔“

اور صرف ”ضبط“ نہیں کیا گیا بلکہ ان سب کو بھی ٹھیکہ پر لگا دیا گیا۔

﴿ بہ مستاجراں داد و مبالغہ خیرے ازیں وجہ داخل خزانہ حرص او شد ﴾

”ٹھیکیداروں کو (یہ حقوق دے دیئے گئے تھے) اور بڑی بڑی رقبے اس راہ سے ان کے حرص کے خزانہ میں داخل ہوتی تھیں۔“

حالانکہ ہر دیہات کے یہ رسوم تقریباً ہزار ہا سال سے چلے آتے تھے۔ اور اب بھی ہندوستان کے مختلف علاقوں میں ان موروثی حقوق پر کسی نے دست اندازی نہیں کی ہے۔ نقطہ نظر کے اس اختلاف کا کیا علاج ہے کہ طباطبائی صاحب تو اسے ”وراثت و تنگ چشمی“ پر محمول

کرتے ہیں۔ لیکن حسن ظن سے کام لینے والے اس کو ”معاشی مہارت“ اور اقتصادی بلند نظری سے تعبیر کریں گے میر غلام علی صاحب نے اسی ”ملک الکفار“ کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:-

﴿بالاجی راؤ با آناقتدار کہ سلطنت ہندو دکن بدست آوردہ بود۔ نان باجرہ می خورد

نان گندم خوش نداشت باونجان خام دانیہ خام و کرسنہ خام بر غبت تمام خوردہ﴾

”بالاجی راؤ اس اقتدار کے باوجود کہ دکن اور ہندوستان کی سلطنت پر اس کا قبضہ ہو

گیا تھا۔ باجرے کی روٹی کھاتا تھا اور گیہوں کی روٹی اسے اچھی نہیں معلوم ہوتی تھی

کچے بیگن، کچے آم کرسنہ خام ان سب چیزوں کو بڑی رغبت سے کھاتا تھا۔“

ان عجیب و غریب خوراکیوں اور عجیب باتوں کا ظہور جب اس زمانہ میں ہوا تو کتنوں

نے اسے نفس کشی کی مثال قرار دیا۔ لیکن واقعی میں یہ نفس کشی ہے یا نفس پرستی؟ میر غلام علی کو تو ان

حرکات کے پیچھے جو ”چیز“ نظر آتی تھی وہ ان ہی کی زبانی سنئے۔ ممکن ہے آپ کو یا مجھے اس سے

اتفاق نہ ہو لیکن بطور نقل اس کے ذکر میں کیا حرج ہے۔ فرماتے ہیں:-

﴿چوں اصل پیشہ براہمہ گدا کی ست دور کیش ہندوان مقرر شدہ کہ صدقات را بہ

براہمہ باند داد۔ طباع آں قوم نسلأ بعد نسل بدریوزہ گری معتاد شدہ است و

طماعی و ابن الغرضی لازم ماہیت برہمنی گردیدہ بنا بریں باوجود حصول مرتبہ

سلطنت و امارت شیوہ گدا کی از طینت آں ہا بدر نمی رود﴾

”چونکہ برہمنوں کا اصل پیشہ دریوزہ گری ہے ان کے دھرم کی مانی ہوئی بات ہے

کہ ہر قسم کے دان ہن برہمنوں کو ہی دیئے جائیں اس کی وجہ سے نسلأ بعد نسل

اس قوم کی سرشت میں ابن الغرضی بطور لازم ماہیت کے شریک ہو گئی ہے۔ اسی

کا نتیجہ یہ ہے کہ سلطنت اور حکومت کے درجہ تک پہنچنے کے بعد بھی ان کی فطرت

سے شیوہ گدا کی الگ نہ ہو سکا۔“

خود اپنا تجربہ بیان کرتے ہیں کہ:-

﴿ہر محتاج کہ بحکام و متصدیاں براہمہ مذکور رجوع کند نظر آنہا ہمیں کہ برائے

ماچہ آوردہ و ہر چہ بر سر دور او یا بند کشیدہ گرفتہ برآمدکارا و حوالہ بعالم می کنند﴾

”کسی قوم کا کوئی حاجتمند جب ان مذکورہ بالا برہمنوں کے حکام اور کارندوں کی

طرف رجوع کرتا ہے تو ان حکام اور کارندوں کی نظر اسی پر ہوتی ہے کہ ہمارے لئے وہ کیا لایا ہے۔“

جو کچھ اس بیچارے کے پاس ہوتا ہے اُسے بھی گھسیٹ لیتے ہیں اور اس کے کام کو دنیا کے حوالہ کرتے ہیں۔

آخر میں داد دیتے ہوئے ایک شعر بھی درج فرماتے ہیں

بدست خلق عالم کاسہء در یوزہ می بنم
گدا چوں پادشاہ گرد و گدا ساز دجہانے را

(یعنی میں دنیا کی مخلوق کے ہاتھ میں بھیک کا پیالہ ہی دیکھتا ہوں، گدا جب بادشاہ ہو جائے تو سارے جہاں کو گدا بنا کر رہتا ہے)۔

خدا جانے میر صاحب طب کے ماہر تھے یا نہیں۔ لیکن اس کے بعد انہوں نے جو لطیفہ درج کیا ہے ممکن ہے کہ اطباء اس کی تصدیق کریں، فرماتے ہیں ان عادات و اطوار کی ایک دوسری توجیہ ان کے نزدیک یہ ہے کہ:-

مدار غذائے آنہا خواہ غنی باشد با فقیر بردال تو راست و با ایں دال عملے از روغن کہ
آں را در ہندی بگھار گویند نمی کنند و از خارج نیز روغن بکار نمی برند کہ یوستش را
اصلاح نماید و احیاناً اگر کسے بخورد اقل قلیل مرتبہ ایست کہ گویا نخوردہ و سمرچ سرخ و
خلیت و زرد چوبہ ہم در ماکولات شان بسیار استعمال می شود و سمرچ سوائے انچہ
در تختن داخل نمودہ اند ہنگام خوردن با طعام نیز با فراطی خوردند لہذا نطفہ نہ پاشت
بر پشت از ماکولات مذکور متکون می شود (خزانہ عامرہ میر غلام علی آزاد ص ۴۸)

”ان کی خوراک کا دار و مدار خواہ امیر ہو یا فقیر صرف تور (ارہر) کی دال پر ہے اس دال کے ساتھ روغن ڈال کر جو تدبیر کی جاتی ہے جسے ہندوستان میں بگھاڑ کہتے ہیں یہ لوگ اس عمل کو دال کے ساتھ نہیں کرتے علاوہ اس کے باہر سے بھی روغن اس میں شریک نہیں کرتے تاکہ اس کی خشکی کی کچھ اصلاح ہو کبھی اگر کوئی روغن ڈالتا

اس سمرچ سرخ کے متعلق امیر صاحب نے ایک اور عجیب خبر سنائی ہے فرماتے ہیں ”دیریں دبست سال کہ قدم
آنہا بہ سرزمین ہندوستان رسیدہ برنے مردم ہندوستان ہم استعمال سمرچ سرخ آموختہ بیشتر رواج ایں سمرچ
در بیت المال ہندوستان نہ بود۔ (خزانہ عامرہ ص ۴۸) واللہ اعلم بالصواب کیا کہا جائے جس طرح چائے ایک
حکومت کے زیر ہندوستان کے ہر گھر میں پہنچی ہے۔ یہی حال اس سمرچ سرخ کا بھی ہے۔

بھی ہے تو اس کی مقدار اتنی قلیل ہوتی ہے گویا کہ اس نے روغن کا استعمال نہیں کیا
اسی طرح لال مرچ اور ہینگ، ہلدی بھی ان کے کھانوں میں بہت مستعمل ہے۔
لال مرچ کو پکاتے وقت تو کھانے میں شریک کرتے ہی ہیں۔“

اس کے سوا جب کھانا کھانے لگتے ہیں۔ اس وقت بھی بکثرت لال مرچ کو چباتے
ہیں۔ اسی لئے ان کی نسل پشت پشت سے اس قسم کی خوراک کی عادی ہوتی چلی آرہی ہے۔
خیر یہ تو اس قوم کی چند خصوصیات کا ایک ضمنی ذکر ہے چونکہ اس زمانہ میں اس کی تعبیر
سادگی اور کفایت شعاری کی زندگی سے کی جاتی ہے اور جو قومیں نسلاً نسل سے نہ ان خوراکوں کی
عادی ہیں نہ اس طرز زندگی کی۔ ان سے جب اسی قسم کے لباس، اسی قسم کے کھانوں کا مطالبہ کیا
جاتا ہے تو وہ گھبراتے ہیں۔ کچھ دن ساتھ دیتی ہیں اور پھر پیچھے ہٹ جاتی ہیں۔ مقصود یہ ہے کہ اس
کے اسباب کی طرف بھی موقع سے اشارہ کرتا چلوں ورنہ اصل گفتگو تو شاہ صاحب کے خواب
کے متعلق ہو رہی تھی۔ یعنی خواب میں جس شان سے یہ دیکھا گیا تھا۔ ٹھیک ان ہی خصوصیات
کے ساتھ ملک الکفار مسلمانان ہند پر مستولی ہو گیا اور ان کے مرکزی مقام پر قبضہ کر لیا تھا۔

﴿شاہ صاحب کے خواب کا دوسرا جزو ہندوستان پر غازی احمد شاہ ابدالی

کا حملہ اور مرہٹہ طاقت کی شکست﴾

خواب کے دوسرے اجزاء کے متعلق بظاہر تو یہی سمجھ میں آتا ہے کہ اچانک احمد شاہ
ابدالی غازی کا ہندوستان پر جو حملہ ہوا اور مرہٹہ تحریک پانی پت کے میدان میں ہمیشہ کے لئے ختم
ہو گئی، کہا جاتا ہے اور مورخین لکھتے ہیں کہ اس حملہ پر احمد شاہ کو خود ہندوستان کے امیروں اور
نوابوں نے عرضداشت بھیج کر آمادہ کیا تھا۔ جیسا کہ طباطبائی کا بیان ہے:-

﴿نجیب الدولہ و راج ہائے ہندوستان از دست مرہٹہ و عماد الملک بجا آمدہ
زوال دولت و ملک خود از دست برد مرہٹہ برائے العین مشاہدہ نمود عرائض
استدعا بخدمت احمد شاہ ابدالی نگاشتہ خواہاں ورود اوراد ہند شدند﴾

”نجیب الدولہ اور ہندوستان کے مختلف راجاؤں، مرہٹوں اور عماد الملک کے
ہاتھوں جاں بلب ہو کر دیکھنے لگے کہ ان کی حکومت نے ان کے ہاتھوں سے نکل
کر مرہٹوں کے قبضہ میں جا رہی ہے اپنی آنکھوں سے یہ تماشا ان کو نظر آرہا تھا۔

تب انہوں نے احمد شاہ ابدالی کی خدمت میں عرض لکھ کر بھیجے اور اس بات کے خواہش مند ہوئے کہ شاہ ابدالی خود ہندوستان پہنچیں۔

مرہٹوں نے جب شجاع الدولہ کو ابدالی کی رفاقت سے روکنے کے لئے اپنے سفراء بھیجے تو اس کے جواب میں بھی شجاع الدولہ نے یہی کیا تھا۔ جس کا ذکر کچھ پہلے بھی آیا ہے یعنی:-

﴿مرد از دست شاں بجاں آمدہ برائے پاش و نموس و آبروئے خود در رفاہ عالی شاہ ابدالی را بمنت از ولایت طلب داشتہ و صدمات اورا بہ نسبت ایذائے مرہٹہ سہل انگاشتہ﴾

”لوگوں کا مرہٹوں کے ہاتھوں ناک میں دم آ گیا ہے اپنی عزت و آبرو اور دنیا کی آسائش دامن کے لئے ابدالی و خوشامد در آمد کر کے ولایت سے بلایا گیا ہے اور ابدالی سے جو نقصانات پہنچیں گے انہیں مرہٹوں کی مصیبت سے آسان خیال کر کے ایسا کیا گیا۔“

لیکن یہ تو باہر والے دیکھ رہے تھے، پر ”بارگاہ الست کے دور بینوں“ کو اسی سال پہلے ہی دکھایا گیا تھا کہ یہ

﴿لبا لمرصاد کا سوط عذاب تھا جو ہمیشہ فی اکثر ثوافیھا الفساد﴾

”جب لوگ زمین پر بگاڑ اور فساد کو (بھلائی اور خیر سے) آگے بڑھا دیتے ہیں۔“

کے موقع پر قدرتی قانون کے ماتحت ظاہر ہوتا رہتا ہے۔ لوگوں نے ”الغازی الابدالی“ کو ”خدا کا ہاتھ“ خیال کیا۔ لیکن اس عالم محسوس کے پیچھے بھی جو نظام ہے۔ وہاں کسی اور نے اپنے آپ کو

﴿جعلنی کالحجار حة﴾

”مجھے خدا نے بمنزلہ ایک آلہ اور عضو کے قرار دیا۔“

کی شکل میں پایا۔ باہر والوں نے نجیب الدولہ، شجاع الدولہ، دوندے خاں، رحمت خاں اور آخر میں ان سب کے ساتھ ”ابدالی“ کے قلوب کو غصہ سے معمور پایا۔ لیکن اندروالے نے اس کو باہر سے نہیں بلکہ اس غضب کی آگ کو ”اندر“ سے بلکہ ”باطن الباطن“ سے بھڑکتے ہوئے ملاء اعلیٰ تک اور ملاء اعلیٰ سے خود اپنے اندر پہنچی ہوئی محسوس کیا۔ جیسا کہ فرماتے ہیں:-

﴿فغضب اللہ علی اهل الارض غضباً شديداً و رأیت صورة

هذا الغضب متحثة فی الملاء الاعلی ثم تشرح الغضب الی

فرمتنی غضبانا ﴿﴾

”پھر اللہ تعالیٰ زمین والوں پر سخت غصہ کے ساتھ غضبناک ہوا۔ اور میں نے اسی غصہ کو ملاء اعلیٰ میں متمثل ہوتے ہوئے پایا۔ وہاں سے ٹپک ٹپک کر وہی غصہ مجھ میں اُتر ا پھر میں نے اپنے آپ کو بھی غضبناک پایا۔“

اور یہی آگ تھی جو غیب سے چل کر بالآخر پانی پت کے میدان میں بھڑکی اور جن پر خدا کا غضب تھا وہ اس میں بھسم ہوئے۔ باہر والوں نے ”پانی پت کی آخری جنگ کا“ مرد میدان احمد شاہ ابدالی رحمۃ اللہ علیہ کو قرار دیا۔ لیکن آج سننے والے سن رہے ہیں کہ اس سلسلہ میں اپنے کو ”قائم الزماں“ کسی اور کو دکھایا گیا تھا۔

شاہ صاحب نے اس خواب میں یہ بھی دیکھا تھا کہ خود اس معرکہ میں مسلمانوں نے بھی مسلمانوں کا قتل کیا تھا۔ اور ان مسلمانوں کے متعلق ان سے پوچھا بھی گیا جس کا انہوں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ کون نہیں جانتا کہ مرہٹوں کی اس جنگ میں مسلمانوں کی بھی ایک جماعت بطور نوکروں کے مرہٹوں کے ساتھ تھی ان میں حضری عرب بھی تھے اور ہندوستان کے مسلمان بھی، خصوصاً توپ خانہ کا سردار تو آج تک ابراہیم گاردی کے نام سے مشہور ہے جو ”بادواڑہ ہزار بندوق چقماقی و توپہا نظ سٹھء فرنگ“ مرہٹوں کے ساتھ تھا اور اسی نے ایک مدت تک توپوں کی زنجیر بندی کر کے مرہٹوں کو سانس لینے کا موقع دیا اور تعجب ہی کیا اور کیوں ہو۔ کیا آج بھی مختلف رنگوں میں یہی تاریخ نہیں دہرائی جا رہی؟

شاہ صاحب نے یہ بھی دیکھا تھا کہ پوچھنے والوں نے پوچھا کہ ”خدا کا حکم اس وقت کیا ہے؟ تو آپ نے فک سے کل نظام (اس وقت ہر قسم کے نظم کو ختم کر دینا چاہیے) فرمایا تھا۔ ظاہر ہے کہ جس وقت پانی پت کی جنگ ہوئی..... ہندوستان کے تقریباً بڑے بڑے نواب اور امیر اپنی اپنی حکومتوں کو چھوڑ کر آخری فیصلہ کے لئے میدان میں اتر آئے تھے۔ حتیٰ کہ دلی میں بھی کوئی نظام حکومت باقی نہ تھا اور جب تک ”غضب الہی“ کا ظہور رہا اس وقت تک کوئی نظام

۱۔ ہمارے ایک اشتراکی مزاج دوست نے جو اسلامی نظام کو بھی ایک قسم کا اشتراکی نظام یا اقرب الی الاشتراکیت سمجھتے ہیں۔ نہ معلوم کہاں سے نقل فرمایا ہے کہ شاہ صاحب سے عالم رویا یا مکافقہ میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ ارشاد فرمایا یعنی انقلاب کا حکم دیا غالباً اس کو ارشاد نبوی ٹھہرانے میں ان سے بہرہ ہوا ہے۔

قائم نہ ہو سکا۔ شاہ صاحب نے یہ بھی دیکھا کہ ملک الکفار پکڑا گیا اور ذبح ہوا۔ طباطبائی واقعات کی تفصیل کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ جب گشتوں کے پُشتے لگنے لگے:-

﴿تو سردارانِ اول بسواس را و پسر بالاجی را و کہ شہزادہ، آنہا بود، در عین شباب
بر خم تفنگ آہنگ صحرائے عدم نمود﴾

”تو اعلیٰ درجہ کے مرہٹہ سردار بالاجی پیشوا کا بیٹا بسواس را و جو مرہٹوں کا شہزادہ تھا عین جوانی کے دنوں میں بندوق کے فار سے عدم کے صحرائے طرف روانہ ہو گیا۔“

ہاشمی صاحب اپنی تاریخ میں ناقل ہیں کہ بھاؤ نے دلی پہنچ کر چاہا تھا کہ اپنے بھتیجے (یعنی ای بسواس را و پسر بالاجی) کو تخت پر بٹھا کر یہ اعلان کر دے کہ ”اب ممالک ہند کی شہنشاہی مرہٹہ برہمنوں کی ملکیت ہے۔“ لیکن پھر جنگ کے فیصلہ تک اعلان کے خیال کو ملتوی کر دیا۔

بہر حال تخت شاہی پر بٹھانے والے بسواس را و بھی اور بٹھانے والا بھاؤ بھی اسی جنگ میں ختم ہوئے۔ طباطبائی ان دونوں کے ذکر کے بعد ایک طویل فہرست درج کرتے ہیں۔ آخر میں لکھتے ہیں:-

﴿داز سرداراں نامور غنیم، احدے جاں سلامت نہ بردگردوسہ کس﴾

”دشمن کے نامور سرداروں میں کوئی اپنی جان بچا کر نہ بھاگ سکا مگر صرف دو تین آدمی۔“

خواب میں ”ملوکانہ اقتدار“ کے ان مظاہرہ کو بلکہ ”شہزادہ آنہا“ جس کی بادشاہت کا گویا صرف اعلان کرنا باقی رہ گیا تھا۔ اگر اسی خواب میں

﴿رأیت الدم یخرج من اوداجہ متر فقا﴾

”میں نے دیکھا کہ اس کی شرگ سے خون کے فوارے چھوٹ رہے تھے۔“

کی شکل میں دیکھا گیا۔ تو مثالی اور ناسوتی تعلقات کے جاننے والے کیا تعبیر کی تکمیل میں شک کر سکتے ہیں اور سچ تو یہ ہے کہ جب تمام مورخین کا اس پر اتفاق ہے کہ:-

﴿بعد از وقوع ایں شکست فاش بالاجی ہم غصہ مرگ گشتہ پس از پنج ماہ و سیزدہ

روز نوزدہم ذیقعد سال مذکور بہ پسر و برادر خود ملحق گشت﴾

”اس فاش شکست کے بعد بالاجی (یعنی پیشوا جو مرہٹوں کا موجودہ بادشاہ تھا)

وہ بھی موت کے غصہ کا شکار ہو گیا پانچ مہینے تیرہ روز بعد انیسویں ذیقعد کو اسی

سال وہ بھی اپنے لڑکے اور بھائی (بھاؤ) کے ساتھ جا کر مل گیا۔“

تو پھر بغیر ”تاویل“ کے شاہ صاحب کا خوف ”کفلق اصح“ بن جاتا ہے۔ بلکہ خواب میں ملک الکفار کا میدان جنگ میں نہ قتل ہونا اور بعد کو ملک الاسلام کے ساتھ ساتھ چلنا اس کے یہی معنی ہیں کہ ہر طرف سے گھر جانے کو یا قیدیوں کے مانند ہونے کے بعد پھر بھی کچھ دن وہ ”ملک الاسلام“ کے ساتھ رسوائی و ذلت کی زندگی گزارے گا اور بالآخر ختم ہو جائے گا۔ یہاں ایک نقطہ قابل لحاظ یہ بھی ہے کہ حضرت شاہ صاحب نے یہ خواب ذیقعد ہی میں دیکھا تھا اور بالاجہی راؤ کا انتقال بھی ذیقعد ہی میں ہوا۔

درمیان میں ایک خاص چیز جس کی طرف شاہ صاحب نے اجمالاً لیکن بلیغ فقرے میں ارشاد فرمایا ہے وہ اپنے غیظ کے متعلق آپ کا یہ جملہ ہے کہ

﴿نفث من تلک الحضرة فی نفسی لا من جهة ما یر جمع الی
ہذا العالم﴾

”حضرت (الہ) کی طرف سے یہ غصہ مجھ میں پھونک دیا گیا۔ اور اس کا سبب اور منشاء کوئی ایسی چیز نہ تھی جس کا تعلق اس عالم سے ہو۔“

یہ بڑے پتہ کی بات ہے کہ حمیت و غیظ و غضب تو وہ ہوتا ہے۔ جس کی محرک (مثلاً) اپنی کوئی رسوائی و فضیحت ہوتی ہے اور یہ ایسی چیز ہے جس میں مومن و کافر سب ہی شریک ہو سکتے ہیں اور ہوتے ہیں لیکن اس حمیت اور غصے کا خدا کے یہاں بھی اجر ہے یا اس کا شمار حمیت الجاہلیہ میں ہے۔ بہت زیادہ محل غور و تامل ہو سکتا ہے۔ اسی کی تعبیر حضرت نے کم از کم میرے نزدیک مایرجع الی هذا العالم سے فرمائی ہے۔ لیکن ایک حمیت و غیظ وہ ہے جس کی بنیاد ”الحب للہ والبغض للہ“ کی نہ ہلنے والی چٹان پر قائم ہے۔ یہی حمیت و غیرت اور یہی غیظ و غضب وہ ہے جس کی پیدا کردہ دعا و ہمت اور الحاج و زاری سے غیب اور غیب الغیب تک کے دوائر میں جنبش پیدا ہو جاتی ہے۔ سچ پوچھیے تو حمیت کی یہی للہی رگ جب کسی کی پھڑک اٹھتی ہے اور اس مقدس محرک سے جب کسی کے خون میں جوش آتا ہے تو ایک ”بیوہ زن“ کی آہ بھی ”برکند عالے“ کا تماشا دکھاتی ہے اور شب گیر نالوں کا یہی شور ہوتا ہے جو ”المنتقم الجبار“ کی انتقامی شانوں کو برسر کار لا کر ملاء اعلیٰ و اسفل میں طلاطم پیدا کر کے کتنے ابدالی اور کتنے حافظ الملک، دوندے خاں اور نجیب الدولہ کی شکل عالم ناسوت میں اختیار کرتا ہے۔ حالانکہ کام کسی کنج نشین کا دل شکستہ کرتا ہے لیکن تاریخ والے ان واقعات کو ان ہی ناسوتی مظاہر اور شہادتیں توالب کی طرف منسوب کرتے ہیں، نالوں کی بے تاثیر کے شکوہ

کرنے والے چاہیں تو حضرت شاہ صاحب کے اس عمیق لیکن مختصر اشارے ہی سے اپنی ہدایت کی شمع روشن کر سکتے ہیں اور جو مشکلات کی گرہوں کو دماغ کے زور سے کھولنے میں جب بے بس ہو جائیں تو دل کی قوت سے بھی وہ امداد حاصل کر سکتے ہیں بہر حال اس کے بعد شاہ صاحب نے دیکھا کہ یکے بعد دیگرے شہروں کو فتح و برباد کرتے ہوئے ہم ”اجمیر“ پہنچ گئے۔ تاریخوں کو اٹھا کر پڑھیے ٹھیک اسی شان کے ساتھ ابدالی اور ان کے رفقاء شہروں کو فتح کرتے ہوئے ”اسلامی مرکز“ یعنی دہلی پہنچ گئے۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ ملک الکفار کے خاتمہ کے بعد مسلمانوں پر رحمت و سکونت نازل ہوئی اور ان پر خدا کا رحم ہوا۔ ظاہر ہے کہ اس ”فتح“ کے بعد وہی لوگ جن کا مال چھینا گیا اور جن کی شاہی حرم سرائیں کفار کے قبضے میں آ گئی تھیں۔ وہی غنیم کی فوج سے:-

دو ہزار غلامو کنیز کہ اکثرے از اولاد و احفاء سرداران و متوسطان بود کہ در
عسکریاں ابدالی تقسیم یافت و غنائے کہ در احاطہ و انحصار نمی گنجید از جواہر و نقد و
اجناس دیگر و توپ خانہ، پنجاہ ہزار اسب و دو لاکھ گاؤ و چندیں ہزار شتر و پانصد
فیل کوہ پیکر بدست عسا کر منصورہ افتاد ﴿(ص ۹۱۲)

”دو ہزار غلام اور لونڈیاں جن میں اکثر بڑے اور اوسط درجہ کے لوگوں کے خاندان سے تعلق رکھتی تھیں، ابدالی کے لشکر میں تقسیم ہوئیں اور جواہر و نقد و پیسہ اور دوسری قسم کی چیزیں توپ خانے وغیرہ کے ذیل کے بیشار مال غنیمت میں ہاتھ آئیں۔ پچاس ہزار گھوڑے دو لاکھ بیل اور کئی ہزار اونٹ، پانچ سو ہاتھی کوہ پیکر کامیاب اور فخر مند فوج کے قبضہ میں آئے۔“

﴿شاہ ابدالی کا بے نظیر ایثار اور اس کا راز﴾

اس تاریخی معرکہ کا حال بھی شاہ صاحب کی اس روایہ صادقہ میں اگر لوگ چاہیں تو تلاش کر سکتے ہیں کہ یہ سب کچھ کرنے دھرنے کے بعد شاہ غازی ابدالی اثناء اللہ برہانے نے:-

﴿شانزدہم شعبان سال مذکور از باغ شالامار دہلی بقصد قندھار بکراں ہمت زیر
آں کشید و کلمہ مراجعت قندھار نمود۔

اور بخوشی و رضا شاہ ابدالی نے سلطنت برائے شاہ عالم و وزارت بنام شجاع
الدولہ دامیر الامرائی بنام نجیب الدولہ مقرر نمود ﴿

”اسی سال کی سولہویں شعبان کو دلی کے شالامار باغ سے ہمت کہ کے گھوڑے پر سوار ہو کر قندھار کا ارادہ فرمایا اور اسی طرف پلٹ گئے۔

سلطنت کے شاہ عالم کے نام وزارت شجاع الدولہ کے نام اور امیر الامراء نجیب الدولہ کے نام مقرر فرما کر خود قندھار چل دیئے۔

لوگ حیران ہیں کہ اتنے بڑے براعظم پر اتنی عظیم کامیابی و فحتمندی کے بعد ابدالی کا ملک کو شاہ عالم ہی کے سپرد کر کے قندھار جیسی معمولی حکومت کی طرف واپس ہو جانے کا کیا راز تھا؟ حضرت شاہ صاحب کا وہی فقرہ کہ یہ جو کچھ تھا کسی اور عالم کی بات تھی۔

﴿لَا مَا يَرْجِعُ إِلَى هَذَا الْعَالَمِ﴾

”اس کا تعلق اس دنیا کے قانون سے نہ تھا۔“

اگر یہ صحیح ہے اور صحیح نہ ہونے کی وجہ کیا ہو سکتی ہے تو اس کے سمجھنے میں کوئی دقت باقی نہیں رہتی۔ غازی ابدالی قدس سرہ نے اپنے دین کو دنیا اور اپنے خدا کو بت بنانا نہیں چاہا۔ جن کے اندر ”ان الدار الآخرة لہی الحویان، والاخرة خیر و البقی کا یقین راسخ نہیں ہوا اور اس کی وجہ بجز اس کے اور کیا ہو سکتی ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت پر ان کا اعتماد کامل میسر نہیں ہوا ہے ورنہ اس کی توثیق و تکمیل کے بعد یقیناً ان کو بھی وہی نظر آ سکتا ہے جو ابدالی موثر الآخرة علی الدنیا کو نظر آیا تھا۔ لیکن ”رضوا بالحویة الدنیا و اطمأنوبہا“۔ جن کا انتہائی مبلغ علم ہو۔ ان کے فہم سے سچ ہے کہ یہ بات بعید ہی نہیں بلکہ ناممکنات کی حد تک پہنچی ہوئی ہے اور سچ تو یہ ہے کہ محمدی مجزوں میں اگر کوئی چاہے تو ”ایثار ابدالی“ کو بھی شریک کر سکتا ہے۔

﴿نقمت اور نعمت کے بعد مسلمانوں کی غفلت اور خدا فراموشی﴾

یہ واقعہ بھی گزر گیا اس فتنہ کا شباب بھی حضرت شاہ صاحب ہی کی زندگی میں ہوا اور اس دنیا سے روانہ ہونے سے پہلے اپنے خواب کی تعبیر بھی انہوں نے دیکھ لی۔ لیکن جن مسلمانوں کے ”مکاسب ابدی“ اور ”زشتی اعمال“ نے مرہٹوں کی شکل اختیار کی تھی۔ باوجود سب کچھ دیکھنے کے کیا ان میں کوئی تغیر پیدا ہوا تھا۔ حضرت شاہ صاحب کا مکاشفہ کہ مسلمانوں اور اسلام پر ”ملک الکفار“ کی جانب سے جو مظالم ہو رہے تھے اسی سے

﴿غضب اللہ تعالیٰ علی اهل الارض غضباً شدیداً﴾

”زمین والوں پر حق تعالیٰ سخت غصہ کے ساتھ غضب ناک ہوئے۔“

کا ظہور ہوا تھا۔ واحسرتاہ یا ویلاہ کہ ”غیب“ میں جس امت کی یہ ناز برداریاں ہیں آہ کہ اس کی بے نیاز یوں میں سچ پوچھئے تو کوئی کی نہیں یا بہت کم کی واقع ہوئی تھی اور اپنی زشتی اعمال کو ”صورت نادر“ بھی قرار دیتے تھے وہ سکھی اور برہٹی فتنوں کو خدا کی تنبیہ بھی سمجھتے تھے لیکن باوجود سب کچھ سمجھنے کے کچھ نہیں سمجھتے تھے باوجود سب کچھ دیکھنے کے انہیں کچھ نہیں سوچتا تھا۔ فطرتیں مسخ ہو چکی تھیں، دلوں پر میل اور زنگ چھایا ہوا تھا، دیکھتے تھے، سنتے تھے اور نہیں سنتے تھے۔ سننے والے بہرے اور دیکھنے والے اندھے ان میں زیادہ پیدا ہو چکے تھے۔

﴿شاہ ولی اللہ کی چیخ و پکار اور خطرے کا مسلسل الارم﴾

وہ ”قدسی روح“ جو اس بجھتے ہوئے چراغ کو آخری دفعہ سنبھالا دینے کے لئے ”غیب“ سے ہندوستان کے مسلمانوں کو دی گئی تھی۔ وہ چیخ رہی تھی چلا رہی تھی۔ لیکن ان میں کم تھے جو اس نقار خانہ میں طوطی کی اس آواز پر کان دھرتے۔ میری مراد حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ سے ہے۔ ان کی مختلف کتابوں میں ان کی چیخ و پکار کی شورشیں اس وقت تک بند ہیں۔ شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا ”پیغام“ کیا تھا۔ مختلف طریقوں سے وہ مسلمانوں پر پیش کیا جاتا تھا۔ لیکن ان میں علم بانوں، کتاب بازوں اور معارف فروشوں کا ایک گروہ ہر طرف پھیلا ہوا تھا۔ غلطی ہوئی اور بڑی غلطی ہوئی کہ شاہ ولی اللہ کو بھی ان ہی پیشہ وروں میں سے ایک خیال کیا گیا۔ حالانکہ وہ ہر بات میں ان سے جدا تھا۔ اس کی آواز سب سے نرالی تھی۔ لیکن اس کی تمیز کس میں باقی تھی۔

﴿مسلمانوں کے مختلف طبقات کے نام شاہ صاحب کا ایک پیغام اور

سب کے لئے مفصل پروگرام﴾

بطور نمونہ کے حضرت شاہ صاحبؒ کے ایک پیغام کا ترجمہ درج کرتا ہوں جس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ وہ لیلا و نہارا اور سرا و جہرا جس امر کی دعوت دے رہے تھے وہ کیا تھا ”تہہیمات الہیہ“ کے جامع نے ایک جگہ اس کو بھی درج کر دیا ہے۔ میں اسی کا ترجمہ پیش کرتا ہوں۔ کیونکہ اصل عبارت کے نقل کرنے میں طوالت ہوگی۔ عربی کے جاننے والے عربی میں پڑھ سکتے ہیں۔ خدا جزائے خیر دے مجلس علمی ڈابھیل کو جس نے ان چند سالوں میں ان گراں بہاد فیئوں کو وقف

عام کر دیا ہے۔ بہر حال منجملہ تفہیمات کے ایک طویل تفہیمی مقالے کے بعض اجزاء یہ ہیں۔ جس میں مسلمانوں کے مختلف طبقات اور گروہوں کو ان کے موجودہ حالات پر تنبیہ کر کے آپ نے اصلاح کی راہ سمجھائی ہے۔ مثلاً سلاطین اسلام کو مخاطب کرتے ہوئے فرماتے ہیں:-

﴿سلاطین اسلام سے خطاب﴾

”اے بادشاہو! علماء اعلیٰ کی مرضی اس زمانہ میں اس امر پر مستقر ہو چکی ہے کہ تمام حکومتیں کھینچ لو اور اس وقت تک نیام میں داخل نہ کرو۔ جب تک مسلم، مشرک سے بالکلیہ جدا نہ ہو جائے اور اہل کفر و فسق کے سرکش لیڈر کمزوروں کے گروہ میں جا کر شامل نہ ہو جائیں اور یہ کہ ان کے قابو میں پھر کوئی ایسی بات نہ رہ جائے جس کی بدولت وہ آئندہ سر اٹھا سکیں۔ قاتلوہم حتی لا یبقوا فتنۃ و یكون الدین کلہ اللہ۔ (یعنی ان سے جنگ کرتے رہو تا آنکہ فتنہ فرو ہو جائے اور دین صرف اللہ کے لئے مخصوص ہو جائے، پھر جب کفر و اسلام کے درمیان ایسا کھلا نمایاں امتیاز پیدا ہو جائے، تب تمہیں چاہیے کہ ہر تین دن یا چار دن کے سفر کی منزلوں پر ایک ایک حاکم مقرر کرو۔ ایسا حاکم جو عدل و انصاف کا مجسمہ ہو۔ قوی ہو، جو ظالم سے مظلوم کا حق وصول کر سکتا ہو اور خدا کے حدود کو قائم کر سکتا ہو اور اس میں سرگرم ہو کہ پھر لوگوں میں بغاوت و سرکشی کے جذبات پیدا نہ ہوں وہ جنگ پر آمادہ نہ ہوں اور دین سے مرتد ہونے کی کسی میں جرأت باقی نہ رہے، نہ کسی گناہ کبیرہ کے ارتکاب کی کسی کو مجال ہو، اسلام کا کھلے بندوں اعلان ہو اور اس کے شعائر کا علانیہ اظہار کیا جائے۔ ہر شخص اپنے متعلقہ فرائض کو صحیح طور پر ادا کرے۔ چاہیے کہ ہر شہر کا حاکم اپنے پاس اتنی قوت رکھے۔ جس کے ذریعہ سے اپنے متعلقہ آبادی کی اصلاح کر سکتا ہو۔ مگر اسی کے ساتھ اس کو اتنی قوت فراہم کرنے کا موقع نہ دیا جائے جس کے بل بوتے پر وہ خود ان سے نفع گیر ہونے کی تدبیریں سوچنے لگے اور حکومت کے مقابلہ پر آمادہ ہو جائے۔ چاہیے کہ اپنے متعلقہ مقبوضات کے بڑے علاقہ اور اقلیم پر ایسے امیر مقرر کئے جائیں جو جنگی مہمات کا بھی اختیار رکھتے ہوں۔ ایسے امیر کے ساتھ بارہ ہزار کی جمعیت رکھی جائے مگر جمعیت ایسے آدمیوں سے بھرتی ہو جن کے دل میں جہاد کا دلولہ ہو اور خدا کی راہ میں کسی کی ملامت سے خوفزدہ نہ ہوں۔ ہر سرکش و متمرّد سے جنگ اور مقابلے کی ان میں صلاحیت ہو..... اے بادشاہو! جب تم یہ کر لو گے تو اس کے بعد علماء اعلیٰ کی رضا مندی یہ چاہے گی کہ تم لوگوں کی منزلی اور عاقلی زندگی کی طرف توجہ کرو۔ ان کے باہمی معاملات کو سلجھاؤ اور ایسا کر دو کہ پھر کوئی معاملہ ایسا نہ ہونے پائے جو شرعی قوانین

کے مطابق نہ ہو، اسی کے بعد لوگ امن و امان کی صحیح مسرت سے فائز الرام ہو سکتے ہیں۔“
اسلامی امیروں کو مخاطب فرماتے ہوئے فرماتے ہیں:-

﴿امراء و ارکانِ دولت سے خطاب﴾

”اے امیرو! دیکھو، کیا تم خدا سے نہیں ڈرتے، دنیا کی فانی لذتوں میں تم ڈوبے جا رہے ہو اور جن لوگوں کی نگرانی تمہارے سپرد ہوئی ہے ان کو تم نے چھوڑ دیا ہے تاکہ ان میں بعض بعض کو کھاتے اور نگلتے رہیں..... کیا تم علانیہ شراب نہیں پیتے؟ اور پھر اپنے اس فعل کو تم برا بھی نہیں سمجھتے؟ تم نہیں دیکھ رہے ہو کہ بہت سے لوگوں نے اونچے اونچے محل اس لئے کھڑے کئے ہیں کہ ان میں زنا کاری کی جائے اور شرابیوں کو ڈھالی جائے لیکن تم اس میں دخل نہیں دیتے اور اس حال کو نہیں بدلتے کیا حال ہے ان بڑے بڑے شہروں کا جن میں چھ سو سال سے کسی پر حد شرعی نہیں جاری ہوئی۔ جب کوئی کمزور مل جاتا ہے تو اسے پکڑ لیتے ہو اور جب قوی ہوتا ہے تو چھوڑ دیتے ہو تمہاری ساری ذہنی قوتیں اس پر صرف ہو رہی ہیں کہ لذیذ کھانوں کی قسمیں پکواتے رہو۔ اور نرم و گداز جسم والی عورتوں سے لطف اٹھاتے ہو۔ اچھے کپڑوں اور اونچے مکانات کے سوا تمہاری توجہ اور کسی طرف منعطف نہیں ہوتی، کیا تم نے اپنے سر کبھی اللہ کے سامنے جھکائے؟ خدا کا نام تمہارے پاس صرف اس لئے رہ گیا ہے کہ اپنے تذکروں اور قصے کہانیوں میں اس نام کو استعمال کرو اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اللہ کے لفظ سے تمہاری مراد زمانے کا انقلاب ہے کیونکہ تم اکثر بولتے ہو خدا قادر ہے کہ ایسا کر دے یعنی زمانے کے انقلاب کی یہ تعبیر ہے۔“

﴿فوجی سپاہیوں کو خطاب﴾

اے فوجیو اور عسکریو! تمہیں خدا نے جہاد کے لئے پیدا فرمایا تھا۔ مقصد یہ تھا کہ اللہ کی بات اونچی ہوگی اور خدا کا کلمہ بلند ہوگا اور شرک اور اس کی جڑوں کو تم دنیا سے نکال پھینکو گے لیکن جس کام کے لئے تم پیدا کئے گئے تھے اسے تم چھوڑ بیٹھے اب جو تم گھوڑے پالتے ہو، ہتھیار جمع کرتے ہو اس کا مقصد صرف یہ رہ گیا ہے کہ محض اپنی دولت میں اس سے اضافہ کرو اس سلسلہ میں جہاد کی نیت سے تم بالکل خالی الذہن رہتے ہو۔ تم شراب پیتے ہو، بھنگ کے پیالے چڑھاتے ہو، ڈاڑھیاں منڈواتے ہو اور مونچھیں بڑھاتے ہو۔ عام لوگوں پر زیادتیاں اور ظلم کرتے ہو حالانکہ جو کچھ ان کا لے کر کھاتے ہو اس کی قیمت ان تک نہیں پہنچتی۔ خدا کی قسم، تم عنقریب اللہ کی طرف واپس جاؤ گے پھر

تمہیں وہ بتائے گا جو کچھ تم کیا کرتے تھے۔ تمہارے ساتھ خدا کی یہ مرضی ہے کہ اچھے پارسا، صالحین، غازیوں کا لباس اور ان کی وضع اختیار کرو۔ چاہئے کہ اپنی ڈاڑھیاں بڑھاؤ موچھیں کٹواؤ، پنج وقتہ نماز ادا کیا کرو۔ اور عام لوگوں کے مال سے بچتے رہو جنگ اور مقابلے کے میدان میں ڈٹے رہو۔ تمہیں چاہئے کہ سفر اور جنگ وغیرہ کے موقع پر نماز میں جو آسانیاں اور رخصتیں رکھی گئی ہیں انہیں سیکھ لو مثلاً قصر کرنا، جمع کرنا، سنتوں کے ترک کرنے کی اجازت ہے اس سے واقف ہونا، تیمم کی اجازت سے مطلع ہونا۔ پھر اس کے بعد نماز کو خوب زور سے پکڑ لو اور اپنی نیتوں کو درست کر لو اور اللہ تعالیٰ تمہارے جاہ و منصب میں برکت دے گا اور دشمنوں پر تمہیں فتح عطا فرمائے گا۔

عام پیشہ وروں کو مخاطب کر کے فرماتے ہیں:-

﴿اہل صنعت و حرفت سے خطاب﴾

ارباب پیشہ! دیکھو، امانت کا جذبہ تم سے مفقود ہو گیا ہے۔ تم اپنے رب کی عبادت سے خالی الذہن ہو چکے ہو اور تم اپنے فرضی بنائے ہوئے معبودوں پر قربانیاں چڑھاتے ہو تم مدار اور سالار کا حج کرتے ہو۔ تم میں بعض لوگوں نے فال بازی اور ٹوٹکا اور گنڈے وغیرہ کا پیشہ اختیار کر رکھا ہے یہی ان کی دولت ہے اور یہی ان کا ہنر ہے۔ یہ لوگ خاص قسم کا لباس اور بانا اختیار کرتے ہیں۔ خاص طرح کے کھانے کھاتے ہیں۔ ان میں جن کی آمدنی کم ہوتی ہے وہ اپنی عورتوں اور بچوں کے حقوق کی پروا نہیں کرتے۔ تم میں بعض صرف شراب خوری کو پیشہ بنائے ہوئے ہیں اور تم ہی میں کچھ لوگ عورتوں کو کرایہ پر چلا کر پیٹ پالتے ہیں۔ یہ کھسا بد بخت آدمی ہے اپنی دنیا اور آخرت دونوں کو برباد کر رہا ہے۔ حالانکہ حق تعالیٰ نے تمہارے لئے مختلف قسم کے پیشے اور کمانے کھانے کے دروازے کھول رکھے ہیں جو تمہاری اور تمہارے متعلقین کی ضرورتوں کے لئے کافی ہو سکتے ہیں۔ بشرطیکہ تم اعتدال کی راہ اپنے خرچ میں اختیار کرو اور محض اتنی روزی پر قناعت کرنے کے لئے آمادہ ہو جاؤ جو تمہیں باسانی اخروی زندگی کے نتائج تک پہنچا دے۔ لیکن تم نے خدا کی ناشکری کی اور غلط راہ حصول رزق کی اختیار کی۔ کیا تم جہنم کے عذاب سے نہیں ڈرتے جو برا بکھونا ہے دیکھو! اپنی صبح و شام کو خدا کی یاد میں بسر کیا کرو اور دن کے بڑے حصہ کو اپنے پیشہ میں صرف کرو اور رات کو اپنی عورتوں کے ساتھ گزارو۔ اپنے خرچ کو اپنی آمدنی سے ہمیشہ کم رکھا کرو پھر جو بچ جایا کرے اس سے مسافروں کی مسکینوں کی مدد کیا کرو اور کچھ اپنے اتفاقی مصائب اور

ضرورتوں کے لئے پس ماندہ بھی کیا کرو اور تمہاری تدبیر درست نہیں ہے۔
پھر اس طرح مشائخ کی اولاد اس زمانے کے عام طلبہ، علم اور واعظوں زاہدوں کو بھی آپ
نے خصوصیت کے ساتھ پکارا ہے۔ مثلاً مشائخ کی اولاد کو نصیحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں:-

﴿مشائخ کی اولاد یعنی پیرزادوں سے خطاب﴾

اے وہ لوگو جو اپنے آباء کے رسوم کو بغیر کسی حق کے پکڑے ہوئے ہو یعنی گزشتہ
بزرگان دین کی اولاد میں ہو میرا آپ سے سوال ہے کہ آپ کو کیا ہو گیا ہے کہ ٹکڑیوں ٹکڑیوں
ٹولیوں ٹولیوں میں آپ بٹ گئے ہیں ہر ایک اپنے اپنے راگ اپنی اپنی منڈلی میں الاپ رہا ہے
اور جس طریقہ کو اللہ نے اپنے رسول محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ سے نازل فرمایا تھا
اور محض اپنے لطف و کرم سے جس راہ کی طرف رہنمائی فرمائی تھی۔ اسے چھوڑ کر ہر ایک تم میں
ایک مستقل پیشوا بنا ہوا ہے۔ اور لوگوں کو اسی طرف بلا رہا ہے۔ اپنی جگہ اپنے کو راہ یافتہ اور رہنما
ٹھہرائے ہوئے ہے۔ حالانکہ دراصل وہ گم کردہ راہ اور دوسروں کو بھٹکانے والا ہے۔ ہم ایسے
لوگوں کو قطعاً پسند نہیں کرتے جو محض لوگوں کو اس لئے مرید کرتے ہیں تاکہ ان سے ٹکے وصول
کریں۔ ایک علم شریف کو سیکھ کر دینا بڑھرتے ہیں۔ کیونکہ جب تک اہل دین کی شکل و شباهت
اور طرز و انداز نہ اختیار کریں گے دنیا حاصل نہیں ہو سکتی۔

اور نہ میں ان لوگوں سے راضی ہوں جو سوائے اللہ و رسول خود اپنی طرف بلا تے ہیں
اور اپنی مرضی کی پابندی کا لوگوں کو حکم دیتے ہیں۔ یہ لوگ بن مار اور راہگیر ہیں۔ ان کا شمار
دجالوں کذابوں، قانون اور لوگوں میں ہے جو خود فتنہ اور آزمائش کے شکار ہیں۔

خبردار! خبردار! ہرگز اس کی پیروی نہ کرنا۔ جو اللہ کی کتاب اور رسول کی سنت کی طرف
دعوت نہ دیتا ہو۔ اور اپنی طرف بلاتا ہو اور چاہئے کہ زبانی جمع خرچ صوفیہ کرام کے اشاروں کے
متعلق عام مجلسوں میں نہ کیا جائے۔ کیونکہ مقصد تو (تصوف) سے صرف یہ ہے کہ آدمی کو احسان
کا مقام حاصل ہو جائے۔ لوگو، دیکھو کیا تمہارے لئے اللہ تبارک و تعالیٰ کے ارشاد میں کوئی
عبرت نہیں ہے:-

﴿إِنَّ هَذَا صِرَاطِي مُسْتَقِيمًا فَاتَّبِعُوهُ وَلَا تَتَّبِعُوا السَّبِيلَ فَتَفْرَقَ بَكُمْ

عَنْ سَبِيلِهِ﴾

”یہ میری راہ ہے سیدھی تو اس پر چل پڑو اور مختلف راہوں کے پیچھے نہ پڑو، وہ تمہیں اللہ سے بچھڑا دیں گے۔“

پھر اس زمانے کے طلبہ علم کو خطاب کر کے فرماتے ہیں:-

﴿غلط کار علماء سے خطاب﴾

ارے بد عقلو! جنہوں نے اپنا نام ”علماء“ رکھ چھوڑا ہے تم یونانیوں کے علوم میں ڈوبے ہوئے ہو۔ اور صرف ونحو و معانی میں غرق ہو اور سمجھتے ہو کہ یہی علم ہے۔ یاد رکھو! علم یا تو قرآن کی کسی آیت محکم کا نام ہے یا سنت ثابتہ قائمہ کا۔

چاہئے کہ قرآن سیکھو! پہلے اس کے غریب لغات کو حل کرو سبب نزول کا پتہ چلاؤ اور اس کے مشکلات کو حل کرو۔ اسی طرح جو حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحیح ثابت ہو چکی ہے اسے محفوظ کرو یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نماز کس طرح پڑھتے تھے، وضو کرنے کا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا کیا طریقہ تھا اپنی ضروریات کے لئے کس طرح جاتے تھے اور حج کیونکر ادا فرماتے تھے۔ جہاد کا آپ کے کیا قاعدہ تھا۔ گفتگو کا کیا انداز تھا۔ اپنی زبان کی حفاظت کس طرح فرماتے تھے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق کیا تھے۔ چاہئے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی پوری روش کی پیروی کرو۔ اور آپ ﷺ کی سنت پر عمل کرو۔ مگر اس میں بھی اس کا خیال رہے کہ جو سنت ہے اُسے سنت ہی سمجھو نہ کہ اُسے فرض کا درجہ عطا کرو اسی طرح چاہئے کہ جو تم پر فرائض ہیں انہیں سیکھو مثلاً وضو کے ارکان کیا ہیں، نماز کے ارکان کیا ہیں زکوٰۃ کا نصاب کیا ہے۔ قدر واجب کیا ہے۔ میت کے حصوں کی مقدار کیا ہے۔ پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عام سیرت کا مطالعہ کرو جس سے آخرت کی رغبت پیدا ہو۔ صحابہ اور تابعین کے حالات پڑھو اور یہ چیزیں فرائض سے فاضل اور زیادہ ہیں لیکن ان دنوں جن چیزوں میں تم الجھے ہوئے ہو اور جس میں سرکھپا رہے ہو اس کو آخرت کے علم سے کیا واسطہ، یہ دنیا کے علوم ہیں۔

پھر ان ہی طلبہ کو فرماتے ہیں:-

جن علوم کی حیثیت صرف ذرائع و آلات کی ہے (مثلاً صرف ونحو وغیرہ) تو ان کی حیثیت آگہ اور ذریعہ ہی کی رہنے دو۔ نہ کہ خود ان ہی کو مستقل علم بنا بیٹھو، علم کا پڑھنا تو اسی لئے واجب ہے کہ اس کو سیکھ کر مسلمانوں کی بستیوں میں اسلامی شعائر کو رواج دو لیکن تم نے دینی شعار اور اس کے احکام کو تو پھیلایا نہیں اور لوگوں کو ضرورت سے زائد باتوں کا مشورہ دے رہے ہو تم نے اپنے حالات سے عام مسلمانوں کو

یہ باور کرا دیا ہے کہ علماء کی بڑی کثرت ہو چکی ہے۔ حالانکہ ابھی کتنے بڑے بڑے علاقے ہیں جو علماء سے خالی ہیں اور جہاں علماء پائے بھی جاتے ہیں وہاں بھی دینی شعاروں کو غلبہ حاصل نہیں ہے۔

پھر آپ نے ان لوگوں کو بھی مخاطب کیا ہے جنہوں نے اپنے وسوسوں کا نام دین رکھ چھوڑا ہے اور جو ان کے وسواسی معیار پر پورا نہیں اترتا گویا دین سے وہ خارج ہے۔ اس گروہ میں زیادہ تر زہاد، عباد اور دعاظ ہی اس زمانے میں مبتلا تھے۔ اس لئے عنوان کا آغاز ان ہی سے کیا گیا۔ فرماتے ہیں:-

﴿دین میں تنگی پیدا کر نیوالے واعظوں اور کنج نشین زاہدوں سے خطاب﴾

دین میں خشکی اور سختی کی راہ اختیار کر نیوالوں سے میں پوچھتا ہوں اور واعظوں، عابدوں اور ان کنج نشینوں سے سوال ہے جو خانقاہوں میں بیٹھتے ہیں کہ بہ جبر اپنے اوپر دین کو عائد کرنے والو! تمہارا کیا حال ہے۔ ہر بڑی بھلی بات ہر رطب و یابس تمہارا ایمان ہے۔ لوگوں کو تم جعلی اور گھڑی ہوئی حدیثوں کا وعظ سنا تے ہو۔ اللہ کی مخلوق پر تم نے زندگی تنگ کر چھوڑی ہے حالانکہ تم تو (اے امیہ محمدیہ) اس لئے پیدا ہوئے تھے کہ لوگوں کو آسانیاں بہم پہنچاؤ گے نہ ان کو دشواریوں میں مبتلا کر دو گے۔ تم ایسے لوگوں کی باتیں دلیل میں پیش کرتے ہو جو بیچارے مغلوب الحال تھے اور عشق و محبت الہی میں عقل و حواس بھی کھو بیٹھے تھے حالانکہ اہل عشق کی باتیں وہیں کی وہیں لپیٹ کر رکھ دی جاتی ہیں نہ کہ ان کا چرچا کیا جاتا ہے..... تم نے وسواس کو اپنے لئے گوارا کر لیا ہے اور اس کا نام احتیاط رکھ چھوڑا ہے۔ حالانکہ تمہیں صرف یہ چاہئے تھا کہ اعتقاداً و عملاً احسان کے مقام کے لئے جن امور کی ضرورت ہے بس اس کو سیکھ لیتے۔ لیکن جو بیچارے اپنے خاص حال میں مغلوب تھے۔ خواہ مخواہ ان کی باتوں کو احساس خالص امور میں گڈنڈ کرنے کی حاجت نہ تھی اور نہ ارباب کشف کی چیزوں کو ان میں مخلوط کرنے کی ضرورت تھی۔

چاہئے کہ مقام احسان کی طرف لوگوں کو بلاؤ۔ پہلے اسے خود سیکھ لو پھر دوسروں کو دعوت دو۔ کیا تم اتنا بھی نہیں سمجھتے کہ سب سے بڑی رحمت اور سب سے بڑا کرم اللہ کا وہ ہے جسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پہنچایا ہے۔ وہی صرف ہدایت ہے جو آپ کی ہدایت ہے۔ پھر تم کیا بتا سکتے ہو کہ جن افعال کو تم کرتے ہو وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ کرامؓ کیا کرتے تھے۔

آخر میں ایک پیغام عام مسلمانوں کے نام ہے جس میں کسی خاص طبقے کی تخصیص نہیں ہے۔ فرماتے ہیں:-

﴿عام امت مسلمہ سے جامع خطاب امراض کی

تشخیص اور علاج کی تجویز﴾

میں مسلمانوں کی عام جماعت کی طرف اب مخاطب ہوں اور کہتا ہوں۔ آدم کے بچو! دیکھو!! تمہارے اخلاق سوچکے ہیں تم پر بے جا حرص و آرزو کا سوار ہو گیا ہے تم پر شیطان نے قابو پالیا ہے۔ عورتیں، مردوں کے سر چڑھ گئی ہیں اور مرد عورتوں کے حق برباد کر رہے ہیں۔ حرام کو تم نے اپنے لئے خوشگوار بنالیا۔ اور حلال تمہارے لئے بدمزہ ہو چکا ہے پھر قسم ہے اللہ کی، اللہ نے ہرگز کسی کو اس کے بس سے زیادہ تکلیف نہیں دی ہے چاہئے کہ تم اپنی شہوانی خواہشوں کو نکاح کے ذریعہ پوری کرو۔ خواہ تمہیں ایک سے زیادہ نکاح ہی کیوں نہ کرنا پڑیں اور اپنے مصارف، وضع قطع میں تکلف سے کام نہ لیا کرو اسی قدر خرچ کرو جس کو تم میں سکت ہو۔ یاد رکھو۔ ایک کا بوجھ دوسرا نہیں اٹھاتا اور اپنے اوپر خواہ مخواہ تنگی سے کام نہ لو۔ اگر تم ایسا کرو گے تو تمہارے نفوس بالآخر فسق کی حدود تک پہنچ جائیں گے۔ اللہ تعالیٰ اس کو پسند فرماتا ہے کہ اس کے بندے اس کی آسانیوں سے نفع اٹھائیں۔ جیسا کہ یہ بھی اسی کو پسند ہے کہ جو چاہیں۔ اعلیٰ مدارج پر احکام کی پابندی بھی کر سکتے ہیں اپنے شکم کی خواہشوں کی تکمیل چاہئے کہ کھانوں سے کرو اور اتنا کمانے کی کوشش کرو جس سے تمہاری ضرورتیں پوری ہوں دوسروں کے سینے کے بوجھ بننے کی کوشش نہ کرو۔ کہ ان سے مانگ کر کھایا کرو۔ تم ان سے مانگو اور وہ نہ دیں، اسی طرح بے چارے بادشاہوں اور حکام کے اوپر بھی بوجھ نہ بنو، بے چارے بادشاہوں اور حکام کے اوپر بھی بوجھ نہ بن جاؤ۔ تمہارے لئے یہی پسندیدہ ہے کہ تم خود کما کر کھایا کرو۔ اگر تم ایسا کرو گے تو خدا تمہیں معاش کی بھی راہ سمجھائے گا جو تمہارے لئے کافی ہوگی۔

اے آدم کے بچو! جسے خدا نے ایک جائے سکونت دے رکھی ہو۔ جس میں وہ آرام کرے۔ اتنا پانی جس سے وہ سیراب ہو۔ اتنا کھانا جس سے بسر ہو جائے۔ اتنا کپڑا جس سے تن ڈھک جائے۔ ایسی بیوی جو اس کی شرم گاہ کی حفاظت کر سکتی ہو۔ اور اس کے رہن سہن کی جدوجہد میں مدد دے سکتی ہو۔ تو یاد رکھو کہ دنیا کامل طور سے اس شخص کو مل چکی ہے۔ چاہئے کہ اس پر خدا کا شکر کرے۔

بہر حال کوئی نہ کوئی کمائی کی راہ آدمی ضرور اختیار کرے اور اسی کے ساتھ قناعت کو اپنا دستور زندگی بنائے اور رہتے سہنے میں اعتدال کا جادہ اختیار کرے اور اللہ کی یاد کے لئے جو فرصت ہم دست ہوا سے غنیمت شمار کرے کم از کم تین وقتوں صبح و شام اور پچھلی رات کے ذکر کا خاص طور پر خیال رکھے۔ حق تعالیٰ کی یاد، اس کی تسبیح و تہلیل اور قرآن کی تلاوت کے ذریعہ سے کیا کرے۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث سے اور ذکر کے حلقوں میں حاضر ہوا کرے۔

اے آدم کے بچو! تم نے ایسے بگڑے ہوئے رسوم اختیار کر لئے ہیں۔ جن سے دین کی اصلی صورت بگڑ گئی ہے۔ تم عاشورہ کے دن جھوٹی باتوں پر اکٹھا ہوتے ہو۔ اسی طرح شبِ برات میں کھیل کود کرتے ہو اور مردوں کے لئے کھانے پکا پکا کر کھلانے کو اچھا خیال کرتے ہو اگر تم سچے ہو تو اس کی دلیل پیش کرو۔

اسی طرح اور بھی بُری بُری رسمیں تم میں جاری ہیں۔ جس نے تم پر تمہاری زندگی تنگ کر دی ہے۔ مثلاً تقریبات کی دعوتوں میں تم نے حد سے زیادہ تکلف برتنا شروع کر دیا ہے اسی طرح ایک بُری رسم یہ بھی ہے کہ کچھ بھی ہو جائے لیکن طلاق کو گویا تم نے ناجائز ٹھہرا لیا ہے۔ یوں ہی بیوہ عورتوں کو نکاح سے روکے رہتے ہو۔ ان رسموں میں تم اپنی دولت ضائع کرتے ہو، وقت برباد کرتے ہو اور جو صحبت بخش روش تھی اسے چھوڑ بیٹھے ہو۔ تم نے اپنی نمازیں برباد کر رکھی ہیں تم میں کچھ لوگ ہیں جو دنیا کمانے میں اور اپنے دھندوں میں اتنے پھنس گئے ہیں کہ نماز کا انہیں وقت ہی نہیں ملتا۔ کچھ لوگ ہیں جو قصہ کہانی سننے میں وقت گناتے ہیں۔ خیر پھر بھی اگر ایسی مجلسیں لوگ ایسے مقامات پر قائم کیا کرتے جو مسجدوں سے قریب ہوں تو شاید ان کی نمازیں ضائع نہ ہوتیں۔ تم نے زکوٰۃ کو بھی چھوڑ دیا ہے۔ حالانکہ کوئی ایسا دولت مند نہیں ہے۔ جس کے اقرباء، اعزہ میں حاجت مند لوگ نہیں ہوتے۔ اگر ان لوگوں کی وہ مدد کیا کریں ان کو کھلایا پلایا کریں اور زکوٰۃ کی نیت کر لیا کریں تو یہ بھی ان کے لئے کافی ہو سکتی ہے تم میں بعض نے روزے چھوڑ رکھے ہیں۔ خصوصاً جو فوجی ملازم ہیں کہتے ہیں کہ وہ روزہ رکھنے پر قادر نہیں ہیں۔ یعنی جو محنت انہیں برادشت کرنی پڑتی ہے اس کے ساتھ روزے نہیں رکھ سکتے۔ تم کو معلوم ہونا چاہئے کہ تم نے راہ غلط کر دی ہے اور تم حکومت کے سینے پر بوجھ بن گئے ہو۔ بادشاہ جب اپنے خزانے میں اتنی گنجائش نہیں پاتا۔ جس سے تمہاری تنخواہ ادا کرے تب رعایا پر زندگی کو دشوار کرتا ہے۔

سپاہیو! یہ تمہاری کیسی بُری عادت ہے۔ کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو روزے رکھتے ہیں لیکن سحری نہیں کرتے اور رمضان میں ان سخت کاموں کو نہیں چھوڑتے۔ جن کی وجہ سے روزے ان پر گراں گزرتے ہیں۔

آخر میں فرماتے ہیں:-

ملاء اعلیٰ کی طرف سے اصلاحی مطالبات کا اس زمانے میں جن امور کے متعلق تقاضہ ہو رہا ہے اس کا ایک طویل باب ہے۔ کھڑکی سے آدی بڑی نیکیوں کو جھانک سکتا ہے، اور ڈھیر کے لئے اس کا نمونہ کافی ہے۔

میں نے قصداً شاہ صاحب کے ان دعوتی پیغاموں کا ترجمہ پیش کیا ہے۔ جس سے اس کا بھی اندازہ ہو سکتا ہے کہ عام طور پر مسلمانوں کے ہر طبقہ کی ہندوستان میں کیا حالت ہو چکی تھی۔ نیز اس سے حضرت شاہ صاحب کے اندرونی جذبات و احساسات کا بھی سراغ مل سکتا ہے کہ ان کی نگاہیں کہاں کہاں تھیں۔ جو لوگ ان کی کتابوں کو حنفیت، شافعییت، تقلید و عدم تقلید یا صرف تصوف و کلام کے متعلقہ مباحث تک محدود خیال کرتے ہیں ان کے لئے بھی ان تقریروں میں تنبیہ ہے۔ چاہئے کہ شاہ صاحب کی خدمات کی قیمت لگاتے ہوئے ذرا زیادہ بلند نظری سے وہ کام لیں۔

﴿ہندی مسلمانوں کا جمود یا مرنے کا تہیہ﴾

خلاصہ یہ ہے کہ قدرت کی طرف سے نگوینی طور پر بھی مسلمانان ہند کو مسلسل الارم دیا جا رہا تھا اور تشریعی حیثیت سے پیغمبروں کے صحیح جانشینوں کو اٹھایا جا رہا تھا جو انہیں بار بار چونکا رہے تھے، جگا رہے تھے۔ لیکن وہ اپنی جگہ کچھ فیصلہ کر چکے تھے ان کے بڑے اور چھوٹوں نے گویا مرنے کا تہیہ کر لیا تھا۔

ادھر مرہٹوں کا نازک ترین مرحلہ محض اللہ کے رحم و کرم سے طے ہو گیا تھا۔ چاہئے تھا کہ آنکھیں کھل جاتیں لیکن شاہ صاحب کے جو کچھ مطالبات تھے ان میں سرموفرق نہ ہوا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جہاں فساد کے ایک جرثومہ کی جڑ نکلی تھی۔ بلکہ سچ یہ ہے کہ شاہ ابدالی غازی نے سکھوں کی قوتوں پر بھی مختلف ضربیں ایسی لگائی تھیں کہ پنجاب کے مسلمان اگر چاہتے تو وقفہ کی

ان گھڑیوں میں جاگ سکتے تھے۔ لیکن وہ اسی طرح سوتے رہے جیسے پہلے تھے۔ گویا ان کو سانپ سونگھ گیا تھا۔

﴿قدرتی قانون کے مطابق اس خواب غفلت

کی سزا انگریزی اقتدار کا آغاز﴾

آخر قدرت کے قوانین جو اٹل ہیں وہ بھی کام کرتے رہے ادھر ان اندرونی فتنوں کی شدت میں کچھ کمی ہوئی۔ لیکن شمال مشرق اور جنوب مشرق کے ساحلی کناروں سے وہی قوم جس کے متعلق مسلمانوں کے اہل لغت کبھی یہ لکھا کرتے تھے کہ

﴿انگریز بروزن رنگریز نوعی ست از نوع انسانی کہ گاہ گاہ بہ کنار دریا ظاہری شود۔﴾

”انگریز کا لفظ رنگریز کے وزن پر ہے یہ انسانی نوع کی ایک قسم ہے جو کبھی کبھی سمندر کے کنارے نمایاں ہوتی ہے۔“

تو ان ہی دنوں میں جب پانی پت کے میدانوں میں مرہٹوں کا یہ فیصلہ ہو رہا تھا۔ قدرت کسی اور فیصلہ کا انتظام کر رہی تھی بنگال کے ناظم سراج الدولہ کی فوج لارڈ کلیم (المشہور بہ کلايو) کے اس شبخون حملہ سے دل از دست رفتہ ہو چکی تھی۔ جس میں غالباً پہلی دفعہ چٹمانی بندو قوں کے چلانے والوں کو کارتوسی گولیوں کا تجربہ ہوا تھا۔ طباطبائی نے لکھا ہے کہ کلايو اور اس کے ساتھی :-

﴿سراج الدولہ کی فوج پر کارتوسی بندو قوں

کے ساتھ لارڈ کلايو کا پہلا شبخون حملہ﴾

﴿ساعتے از شب باقی ماندہ اکثر از کشتی فردو آمدہ از طرف پشت لشکر تفنگ افکنان داخل شدند، فاصلہ ورشک ندادہ قدم بقدم راہ می پیودند و گولہ تفنگ چوں تگرگ بلا بر سر لشکریان سراج الدولہ می بارید۔﴾

”کچھ رات رہے بہت سے انگریز کشتی سے اتر کر سراج الدولہ کی فوج کے

پشت کی طرف سے بندوقیں سر کرتے ہوئے اس کی فوج میں گھس گئے وہ
 باڑھ مارنے میں وقفہ نہیں دیتے تھے اور مسلسل مارچ کرتے ہوئے آگے
 بڑھے چلے جاتے تھے۔ اور بندوق کی گولیاں اولوں کی طرح سراج الدولہ
 کے فوجیوں پر برس رہی تھیں۔“

ظاہر ہے کہ ہندوستانی سپاہیوں کو ”گولہ تفنگ چوں نگرگ“ کا پہلی دفعہ تجربہ ہوا تھا۔
 وہاں نہ ڈھال کام آتی تھی، نہ نیزہ، نہ تلوار اور نہ اس کے ہاتھ اور پیترے، نتیجہ یہ ہوا کہ

﴿سراج الدولہ کے لشکر میں ابتری اور قیامت کا نمونہ﴾

﴿بہ مشاہدہ ایں رست خیز کہ نمونہ محشر دران معکر آشکارا و نمایاں گشتہ بود دل
 از دست رفتہ اضطراب و ہراسے عظیم و ر خاطر جائے گرفت۔﴾

”اس بھاگ دوڑ میں جو قیامت کا نمونہ سراج الدولہ کی چھاؤنی میں قائم
 ہو گیا تھا۔ لوگوں کے دل قابو سے نکل گئے۔ دلوں میں سخت خوف و ہراس نے
 جڑ پکڑ لی۔“

اگرچہ واقعہ ”پانی پت“ کے سانحہ سے تین سال پہلے پیش آیا تھا۔ لیکن ”تھنگ چوں
 نگرگ“ کے مقابلے میں سپاہیوں میں پھر کبھی ہمت نہ ہوئی اور بالآخر ”پلاسی“ کے مشہور میدان
 میں اس لئے کہ

﴿میر جعفر کی غداری اور جنگ پلاسی میں انگریزوں کی فتح﴾

﴿میر جعفر خاں و دیگران کہ باعث ایں فساد و خواہاں شکست سراج الدولہ
 بودند از دور بطرفیکہ متعین بودند استادہ تماشا شائے نمود۔﴾

میر جعفر خاں اور دوسرے لوگ جو اس فساد کے بانی مبنی تھے اور سراج الدولہ
 کی شکست کے آرزو مند تھے جس مقام پر متعین تھے دور ہی سے کھڑے اس
 تماشا کو دیکھ رہے تھے۔

جو مقدر تھا وہ پورا ہوا۔ اپنے نمک حرام، طوطا چشم ملازم میر جعفر کا قیدی سراج الدولہ،
 محمدی بیگ سے جو اس کے قتل کے لئے بھیجا گیا تھا یہ کہتے ہوئے سنا گیا کہ

﴿آیا راضی نمی بشوند کہ در گوشہ افتادہ زندگی کنم﴾
 ”کیا (میر جعفر وغیرہ) اس پر بھی راضی نہیں ہیں کہ کسی گوشہ تنہائی میں پڑا میں
 زندگی گزار دوں؟“

لیکن اس کے باپ اور نانا کے نمک پروردہ محمدی نے سر ہلادیا:۔

﴿سراج الدولہ کالرزہ خیز قتل﴾

﴿وضربے چند بر پیکر نازنین اوز و بروئے زمین افتاد گفت بس است کہ من
 کار من تمام شد و انتقام بانجام رسید۔﴾
 ”اور چند وار اس کے نازنین پیکر پر اس نے کئے وہ زمین پر گر پڑا اور بولا بس
 کرو میرا کام تمام ہو گیا اور انتقام اپنے آخری انجام کو پہنچ گیا۔“

﴿اپنے پایہ تخت مرشد آ باد کے بازاروں

﴿میں سراج الدولہ کی لاش﴾

وہی مرشد آ باد جہاں بنگالی بارواڑیہ کے اس مطلق العنان خود سر بادشاہ کی سواریاں
 شاہانہ تحمل شکوہ سے روز نکلا کرتی تھیں آج اس کی
 ﴿لاش او بر ہووج فیلے اندراختہ بطور تشہیر در شہر گردانیدند﴾
 ”... لاش ایک ہاتھی کے ہووج پر ڈال کر بطور تشہیر شہر میں پھرائی گئی۔“
 اور میر جعفر کی کھال اوڑھ کر کرٹل کلیم (کلا یو) اور اس کے جانشینوں نے کمپنی بہادر
 کے نام سے سرزمین ہند پر اس تخت کو بچھا دیا جو آج تک بچھا ہوا ہے۔
 ہندوستان کے مسلمانوں کو الغازی الابدال جس شاہ عالم اور شجاع الدولہ کے سپرد
 کر کے خود قندھار روانہ ہو گئے تھے حضرت شاہ صاحب کی وفات کے تقریباً دو سال بعد کلا یو نے
 یہ مقام الہ آباد مشہور

﴿بنگال، بہار، اڑیسہ کی دیوانی کمپنی بہادر کے نام﴾
 ﴿فرمان اسناد دیوانی ہر سہ صوبہ بنگال، بہار، اڑیسہ بنام کمپنی وزیر (شجاع

الدولہ) و بادشاہ (شاہ عالم) درخواست و چار و ناچار قبول نمودہ بروفق خواہش
اور فرامین اسناد نوشتہ دادند ﴿

”تینوں صوبے بنگال، بہار، اڑیسہ کی دیوانی کی سند کمپنی بہادر کے نام وزیر
(شجاع الدولہ) اور بادشاہ (شاہ عالم) سے چاہی اور چار و ناچار (دونوں کو
قبول کرنا پڑا۔ اور کلاہیوں کی خواہش کے مطابق اسناد کے فرامین لکھے گئے۔“

اتنے بڑے بڑے صوبوں کی کل مال گزاری چوبیس لاکھ مقرر ہوئی اور چالیس ہزار
سالانہ ناظم بنگالہ کے اخراجات کے لئے طے ہوئے اور

﴿قبولیت بہ مہر کمپنی کہ دست آویز تعہد مال گزاری است داخل دفتر
پادشاہی گروید﴾

”کمپنی کے مہر کے ساتھ قبولیت نامہ جو مالگزاری کے معاہدہ کی دستاویز تھی
بادشاہی دفتر میں داخل ہوئی۔“

بقول طباطبائی اتنا اہم کام اتنی آسانی سے انجام پا گیا۔

﴿کہ بیع و شرائے خربار بردار و چار پائے رہوار ہم بایں زودی بدون تکرار یک
سوئی نمی شود، انفصال و انقطاع یافتہ۔﴾

”کہ کسی بوجھ لا دینے والے گدھے اور کسی چوپایہ کی خریداری بھی اتنی جلدی
بغیر کسی رد و کد اور تکرار کے طے نہیں ہوتی لیکن یہاں (اتنا بڑا معاملہ) طے
پا کر ختم ہو گیا۔“

”نؤتی الملک من تشاء وتنزع الملک ہمن تشاء“ کی پھر ایک تفسیر
گنگا جہنا کے سنگم پر لکھی گئی۔ شاہ عالم نام کو ہندوستان کے بادشاہ تھے۔ لیکن کرنل اسمٹ جو ان کی
نگرانی کے لئے الہ آباد میں چھوڑا گیا تھا۔ اس کا یہ حال تھا کہ:-

﴿فرنگی ٹھیکہ داروں کی نزاکت دماغی شاہی نقارہ

کی آواز سے سر میں درو﴾

﴿از صدائے نقارہ نوبت خانہ پادشاہی کہ در قلعہ بودگا ہے ناخوش گشتہ تو اخشن

نوبت را مانع می شد و مردم نقار خانہ ناچار ممنوع از عمل خود بودند ﴿
 ”بادشاہی نوبت خانہ کی آواز سے ناخوش ہوتا تھا اور نقارے کے بجانے میں
 مانع ہوا۔ نقار خانے والے مجبوراً رک گئے۔“

سچ ہے۔

تانا پڑے خلل کہیں آپ کے خواب ناز میں
 ہم نہیں چاہتے کی اپنی شبِ دراز میں
 ان ”ٹھیکہ داروں“ کی نزاکتِ دماغ اب کیا کہنے تھے۔ ع
 غنچہ چٹکا تو کہا سر میں دھمک ہوتی ہے

انا للہ وانا الیہ راجعون

ظاہر ہے دین کا وہ دیوانہ جو مسلسل پچاس ساٹھ سال سے آسمان کے ان بدلے
 ہوئے تیوروں کا اندازہ کر رہا تھا اس کی اندرونی تڑپ اور بے چینی کبھی کبھی ابدالی اور حافظ الملک
 رحمت خاں، شجاع الدولہ اور میر قاسم کی شکلیں بن بن کر نمایاں ہوتی تھیں۔ لیکن جن کے لئے وہ
 تڑپتا تھا۔ وہ تو سوئے ہوئے تھے، کیا کرتا، کب تک اپنے جگر کے نالوں سے آسمان کو ہلاتا۔

﴿آخر میں شاہ ولی اللہ کی دردناک وصیت﴾

آخر عمر میں جب وصیت نامہ ترتیب دینے لگے۔ تو جہاں اور باتیں لکھیں ان میں
 سب سے زیادہ دردناک وصیت وہ ہے جسے پڑھ کر کلیجہ کانپ اٹھتا ہے دنیا کی سب سے بڑی
 اسلامی سلطنت کے عاصمہ (پایہ تخت) میں بیٹھ کر اسی سلطنت کا ایک عالم لکھتا ہے اور حالات
 نے جو رخ پلٹا تھا ان کا صحیح اندازہ کرنے کے بعد لکھتا ہے:-

﴿ما مردم غریبم کہ درد دیا رہندوستان آباے با بغربت افتادہ اند۔﴾ (وصیت

نامہ ص ۱۱) ﴿

”ہم لوگ اجنبی مسافر لوگ ہیں ہمارے باپ دادا اس ملک میں بحالت

مسافرت و غربت ہی یہاں داخل ہوئے اور پھر وہی حالت واپس ہو گئی۔“

حضرت کے کلام اور مختلف کتابوں سے جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں ایسا معلوم ہوتا

ہے کہ ان پر اپنی قوم کی اس حالت کا خاص اثر تھا وہ دیکھ رہے تھے کہ اگر یہی لیل و نہار ہیں تو اس ملک میں اب دین اور اہل دین کا بس خدا ہی حافظ اور اب اس میں شک کی گنجائش ہی کیا باقی تھی جو کچھ ہونے والا تھا اس کی صبح بلکہ صبح سے بھی زیادہ روشنی طلوع ہو چکی تھی قوم کی تقدیر پر ان پر واضح ہو چکی تھی۔

﴿۱۲۳ھ میں حالات کی نزاکت کے باوجود﴾

شاہ صاحب کے سفر حجاز کا اصل راز ﴿﴾

اور آج ہی نہیں بلکہ میرا تو خیال ہے کہ ۱۲۳ھ میں جب آپ کی عمر تقریباً ۳۰ سال کی تھی اچانک آپ کا سفر حجاز کیلئے آمادہ ہو جانا، اور ایسے زمانے میں اس خطرناک ارادے پر عمل کر گزرنے کی ٹھان لینا جب بحر عرب، بحر ہند اور بحر احمر کے تمام سواحل پر تگیزی، ولندیزی قزاقوں اور فرانسیسی و انگریزی تاجر صورت ملک گیروں کی بحری ترک تازیوں کے جولان گاہ بنے ہوئے تھے۔ اعلانیہ حاجیوں کے جہاز لوٹے جاتے تھے۔ جس کی تفصیل کا یہ موقع نہیں بلکہ ایک مستقل مضمون کی ضرورت ہے۔ یوں بھی شمالی ہند سے جنوبی ہند کے علاقوں کو طے کر کے سورت کی بندرگاہ تک پہنچنا آسان نہ تھا۔ خشکی میں ہر جگہ خصوصاً صوبجات متوسط اور مالوہ گجرات جو بندرگاہ کے راستہ پر واقع تھے۔ مرہٹوں کی شورشوں کی خصوصی آماجگاہ بنے ہوئے تھے۔ تاہم شاہ صاحب راہ کی ان تمام دشواریوں کے باوجود عزم حجاز کو پورا کر کے رہے۔ راستہ کا یہ حال تھا کہ رات کو اگر کوئی ساتھی گاؤں یا آبادی میں بھی چھوٹ جاتا تھا تو شاہ صاحب ”یا بدیع العجائب یا بدیع العجائب“ کا وظیفہ شروع کر دیتے تھے جس کے یہ معنی ہیں کہ گویا ایسے آدمی کا بچکر خطرہ سے نکل آنا ایک عجوبہ روزگار بات تھی۔ بہر حال میرے نزدیک علاوہ حج و زیارت اور دوسرے مقاصد کے ایک بڑا محرک، جیسا کہ آئندہ بھی اس پر کچھ بحث کی جائے گی۔ مسلمان ہند کے تاریک مستقبل کا احساس بھی تھا جس کی امت سرزمین ہند میں اس حال میں گرفتار ہونے والی تھی کچھ ان تک خبر پہنچانی تھی اور جہان کی دعائیں روئیں وہاں بھی کچھ عرض کرنا چاہیے تھا اسی سلسلہ میں ان کو مکہ معظمہ میں وہ خواب دکھلایا گیا جس کا ذکر گزر چکا اور مدینہ منورہ میں یہ سرفرازی نصیب ہوئی کہ خود ختمی مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے براہ راست

اس بشارت سے مفتخر فرمایا کہ

﴿ان مراد الحق فیک ان یجمع شملا من شمل الامة
المرحومة بک﴾ (صفحہ ۱۲ فیوض)

”تمہارے متعلق خدا کا ارادہ ہو چکا ہے کہ امت مرحومہ کے جتھوں میں سے
کسی جتھے کی تنظیم تمہارے ذریعہ سے کی جائے۔“

میرے خیال میں یہ ہندوستان ہی کی امت مرحومہ تھی جس کی پراگندگیوں کی تنظیم کا
کام ایک خاص الہی تدبیر سے حضرت اور حضرت کے دودمان اور ”ذریات طیبات“ سے لیا
گیا۔ اس مضمون کو کسی آئندہ مناسب مقام پر ذرا تفصیل سے انشاء اللہ عرض کروں گا۔

﴿شاہ صاحب نے ہندوستان کو بالکل خیر باد کہہ کر

حجاز ہی میں اقامت کیوں نہیں کر لی﴾

بالفعل یہاں سوچنے کی بات یہ ہے کہ ایسی حالت میں جب شاہ صاحب ہندوستان کو
چھوڑ چکے تھے اور ایک دوسری صورت بھی آپ کے سامنے تھی۔ یعنی اپنی اس مسافرت کی
مصیبت اور غربت کا ازالہ جس کا احساس انہیں اس ملک میں تو ہو چکا تھا۔ یوں بھی تو کر سکتے
تھے کہ بجائے غربت اور مسافرت کی مصیبت کے ملک حجاز ہی میں رہ پڑتے۔ کیونکہ گوان
ممالک کی خیر بھی نظر نہیں آرہی تھی۔ اور مسلمان جن علاقوں کو اب تک اپنا وطن سمجھ رہے تھے
مستقبل کی گھڑیوں پر نظر رکھنے والے وہاں بھی ان کی غربت اور مسافرت کو دبے پاؤں آتا ہوا
دیکھ رہے تھے لیکن پھر بھی۔

جو ہجرت کر کے بھی جائیں تو اب شبلی کہاں جائیں

کہ اب امن وامان شام و نجد و قیرواں کب تک

کی حالت پیدا نہ ہوئی تھی۔ بالخصوص سرزمین حجاز تو ترکی اور مصری سلطنتوں کے بیچ میں بہت کچھ
قابل بھروسہ تھی پھر اس مقدس ملک میں آپ کو قیام کا بھی کافی موقع ملا۔ مختلف مقامات میں
آپ کو مختلف اشارے بھی ہوتے رہے اور طرح طرح کے مکاتف مختلف رنگوں میں ہوئے مگر
ان میں کسی جگہ بھی آپ کو اس کا ایمانہ کیا گیا کہ ہندوستان کی واپسی کا ارادہ ترک کر دو۔ یہی نہیں

بلکہ آپ کے بعض متوسلوں نے ہندوستان کی ان حالتوں کو دیکھ کر جب چاہا کہ حجاز سے واپس نہ ہوں اور وہیں رہ پڑیں اور مشورۃ شاہ صاحب کو اس بارہ میں خط لکھا تو آپ نے جواب میں تحریر فرمایا کہ

﴿وإما أعزم ترك الرجوع إلى الوطن فلا تبدأ به حتى يشرح

الله صدركم أو صدر جل لا جلكم﴾ (مکاتیب حیات دلی ص ۲۹۱)

”اور یہ ارادہ کہ وطن کی طرف اب واپس نہیں ہونا چاہئے تو اس پر اصرار نہ کرو جب تک خود تمہارا سینہ نہ کھل جائے یا کسی اور شخص (یعنی خود شاہ صاحب) کو شرح صدر تمہارے لئے نہ ہو جائے۔“

بلکہ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ امت مرحومہ کے جس طبقہ کے ”شمل“ کے اجتماع کی آپ نے بشارت پائی تھی۔ اس کے لئے بہر حال اسی ”عالم غربت“ میں مرنا اپنے لئے پسند کرتے تھے۔ حتیٰ کہ حالات جب روز بروز بد سے بدتر ہوتے چلے جا رہے تھے اور آپ کو اس کا یقین ہو گیا کہ اب اس ملک پر مسلمانوں کی حکومت قائم نہیں رہ سکتی اور بہر حال غیر اسلامی قوتوں کا اس پر اقتدار قائم ہی ہو جائے گا۔ تو اب چاہے آپ اسے اپنے دل کی تسلی خیال کیجئے یا جہاں اور بہت سی چیزیں انہوں نے ”غیبی اشارات“ کے تحت لکھی ہیں۔ اس کا بھی اعلان کسی گمان غالب کے تحت میں نہیں بلکہ یقین و اعتقاد کی صورت میں کیا ہے۔

﴿شاہ صاحب کی ایک محیر العقول توقع﴾

﴿والذى امتقدانه انفق عليه الهنور مثلاً على اقليم هندوستان

فلمه مستقرة عامة واجب في حكمة الله تعالى ان يلهم رؤسا

لهم التدین بدین الاسلام﴾ (تہذیبات الہیہ ص ۱۰۲)

”اور جس بات کا مجھے یقین ہے وہ یہ ہے کہ اگر مثلاً ہندوؤں کا ہندوستان کے ملک پر تسلط قائم ہو جائے اور یہ تسلط مستحکم اور ہر پہلو کے اعتبار سے ہو۔ جب بھی اللہ تعالیٰ کی حکمت کی رو سے یہ واجب اور ضروری ہے کہ ہندوؤں کے سرداروں اور لیڈروں کے دل میں یہ الہام کرے کہ وہ دین اسلام کو اپنا

مذہب بنالیں۔“

غالباً آپ کی یہ تحریر ”پانی پت“ کے تقدیری فیصلے سے پہلے کی ہے اور خاص کر اسی قوم کے تسلط کے خیال کو انہوں نے تمثیل کی شکل میں پیش کیا ہے۔ بہر حال ہندوستان کے متعلق ”پاسبان مل گئے کعبہ کو صنم خانے میں“

ان کا نظریہ بالکل عقیدہ تھا۔ بلکہ سچ یہ ہے کہ غالباً اسی نظریہ کے موجد اول بھی وہی ہیں کیونکہ انہوں نے لکھا ہے کہ ”کما الہم الترك“ یعنی جیسے ترکوں کو قبول اسلام کی الہامی توفیق ہوئی اور جو اسلامی جھنڈے کو سرنگوں کر رہے تھے۔ خود ان کے آگے سرنگوں ہو کر صدیوں اسلامی علم کے دنیا میں تنہا علم بردار رہے۔

﴿شاہ صاحب اور نظریہ وطنیت﴾

لیکن باوجود اس خیال کے کہ ”غربت و مسافرت“ کی حالت میں بھی سرزمین ہند کو چھوڑنا نہیں چاہتے تھے۔ انہوں نے اس کا خیال کبھی نہیں پکایا۔ کہ بجائے عرب کے اپنا مرکزی تعلق بھی ہم ہندوستان ہی سے قائم کر لیں، اپنی اسی وصیت میں شدت کے ساتھ اصرار لکھتے ہیں:-

﴿مارالابدست کہ حرمین محترمین رویم۔ روئے خود ابرآں آستانہا مالیم﴾
 ”ہم مسلمانوں کے لئے ناگزیر ہے کہ حرمین محترمین ہم جایا کریں اور اپنے چہروں کو آستانوں پر جا کر ملا کریں۔“

اور آخر میں دو ٹوک قطعی فیصلہ کی صورت میں ارقام فرماتے ہوئے نظریہ ”وطنیت“ کی جو واقعی جڑ ہے اس پر تیر لگاتے ہیں:-

﴿سعادت ما ایں ست و شقاوت مادر اعراض ازیں۔﴾

”ہماری سعادت اور کامیابی اسی میں ہے اور ہماری بدبختی و شقاوت اس مسلک سے روگردانی اور اعراض کرنے میں ہے۔“

کس قدر عجیب بات ہے آج ”ہندی قومیت“ انڈین نیشنلسٹی کی راہ کا جو سب سے بڑا کاٹا خیال کیا جاتا ہے کہ مسلمان جسم کو اپنے تور کھتے ہیں ہندوستان میں لیکن دل ان کا

رہتا ہے مکہ اور مدینہ میں، کہا جاتا ہے اور اعلانیہ کہا جاتا ہے کہ جب تک یہ ڈوری کاٹ نہیں دی جائے گی۔ اس ملک میں صحیح وطنیت کا جذبہ کبھی بار آور نہیں ہو سکتا اور سچی بات بھی یہی ہے کہ وطن پرست ہی نہیں بلکہ ایک اچھے وطن دوست کے لئے بھی یہ بات دنیا کی نظر میں قابل تعجب ہو سکتی ہے اور ضرور ہو سکتی ہے کہ رہتا ہے وہ ہندوستان میں اور ہر تھوڑی دیر بعد وہ سر جھکاتا ہے۔ اس خطہ کی طرف، اس ملک کی طرف، اس سمت کی طرف اور اس قبلہ کی طرف جو ہزاروں میل سمندر پار ایک ریگستان میں ہے۔ ”وطن پرستوں“ کے نزدیک تو بہ طریقہ غلط اور اتنا غلط ہے کہ جہاں تک جلد ممکن ہو اس کا خاتمہ کر دینا چاہئے لیکن وطن پرستوں کے ایک حلقہ میں بھی اس کی لاسود کوشش جاری ہے کہ دونوں نظریوں میں تطبیق دی جائے اور ”ما جعل اللہ لرجل من قلبین فی جوفہ“ کے قدرتی قانون کو توڑ کر چاہا جاتا ہے کہ ایک ہی آدمی کے دینے میں دو دل بنادیئے جائیں۔ ایک الہ والے آخر کسی دوسرے الہ کا اضافہ اپنے معبودوں، مطلوبوں، مقصودوں میں کیونکر کریں۔

بہر حال جس کی جو سمجھ میں آ رہا ہے کر رہا ہے۔ اور ذاتی طور پر میں ان خیالات میں کسی خیال کی ترجیح کی صلاحیت اپنے اندر نہیں پاتا لیکن حضرت شاہ صاحب کا خیال یہی تھا کہ مسلمانوں کی ساری سعادت اسی میں ہے کہ وہ اپنا مرکز حرم کی زمین پاک ہی کو بنائے رکھیں اور ان کی پوری بدبختی یہی ہے کہ کسی حیثیت سے بھی وہ ان دونوں مقدس مقاموں سے الگ ہو جائیں۔

✽ حجازی تہذیب اور مسلمانوں کے امتیازی طریقہ زندگی

کے بارہ میں شاہ صاحب کا تشدد ✽

اور صرف یہی نہیں۔ بلکہ اپنی مختلف کتابوں کے مختلف مقاموں پر منجملہ چند کلی امور کے شاہ صاحب جس پر بالکل بے اختیار ہو کر پھر جاتے ہیں وہ یہ ہے کہ مسلمان خواہ کسی ملک میں اپنی ابتدائی زندگی گزاریں۔“

لیکن بہر حال اپنی وضع قطع اور طرز بود و ماند میں ان کو اس ملک کے مقامی باشندوں سے قطعاً جدا رہنا چاہیے اور جہاں کہیں رہیں اپنی عربی شان اور عربی رجحانات ہی میں ڈوبے

رہیں۔“ اسی وصیت میں فرماتے ہیں اور اپنے اس خیال کی توجیہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں:-

﴿عربیت نسب، عربیت لسان ہر دو فخر مانت کہ ما ايسد الاولين والاخرين
والفضل الانبياء والمرسلين وفخر موجودات عليه وعلى آله الصلوٰۃ والتسليمات نزدیک
می گردانند﴾

”عربی نسل، عربی زبان، یہ دونوں چیزیں ہمارے لئے فخر ہیں کہ انہیں دونوں
نسبتوں سے ہم سید الاولین والاخرین افضل الانبياء والمرسلين عليه افضل
الصلوٰۃ والتسليمات سے نزدیک رہتے ہیں۔“

پھر اس کے بعد اور صراحت کرتے ہیں کہ

﴿شکر نعمت عظمیٰ آنست کہ بقدر امکان عادات ورسوم عرب اول کہ منشاء
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم است را از دست ندیم﴾

”اس سب سے بڑی نعمت کا شکر یہی ہے کہ حتی الوسع عرب اول کے عادات
ورسوم جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا منشاء ہے۔ اس کو ہم اپنے ہاتھوں سے نہ
چھوڑیں۔“

شاید ہمارے ہی بعض حلقوں میں قیامت کا شور برپا ہو جائے گا اور غل مچایا جائے گا۔
جب ان کو سنایا جائے گا کہ یہی امام ولی اللہ جن کو ہندی میشلزم اور ”قومی پالیسی“ کے پہلے علم
بردار لیڈر ثابت کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ اپنی اسی وصیت میں آگے فرماتے ہیں کہ

﴿رسوم عجم و عادات ہنود را در میان خود نہ گذاریم﴾
”عجم (غیر عربی اقوام) کی رسمیں اور ہندوؤں کی عادتوں کو چاہیے کہ ہم اپنے
اندر کسی طرح باقی نہ رکھیں۔“

اب اللہ مجھے بتاؤ کہ جب شاہ صاحب ہی کا نام لے کر مسلمانوں کو لباس اور وضع قطع
تک میں غیروں کے قدم بقدم چلنے کا مشورہ دیا جائے اور مجھے اس پر حیرت اور غصہ ہو تو کیا
تصور دار میں ہی ہوں؟

انصاف! انصاف!! اے اہل انصاف۔ اللہ انصاف!!!

اور اسی ایک جگہ کو نہیں ”ذی الاعجاز عجم“ (غیر عربی اقوام کے فیشن) کے متعلق

ایک ایک کی صدا شاہ صاحب نے اپنی کس کتاب میں نہیں لگائی ہے۔ آپ نے ایک مکتوب میں اس کا اندازہ کر کے کہ ”وضع قطع“ یا فیشن کی تبدیلی کا عارضہ پہلے کھاتے پتوں اور ان ہی لوگوں کو پکڑتا ہے۔ جو تھوڑی بہت معاشی فراغ البالی رکھتے ہوں جس کا شاہ صاحب کو تو فقط اندازہ ہوا تھا اور ہم اپنی آنکھوں سے اس کا تماشا کر رہے ہیں۔ اگرچہ اس زمانہ میں ”امیروں“ کی ”حقیقت“ پر ”تعلیم یافتگی“ کی چادر اڑھادی گئی ہے اور جب ارباب ثروت و فراغت کا ذکر آتا ہے۔ تو عموماً لوگوں کو ذہن پرانے جاگیرداروں اور زمینداروں کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔ حالانکہ مدت ہوئی۔ کم از کم مسلمانوں میں تو اس طبقہ کا گویا خاتمہ ہو چکا ہے اور اب ان کی جانشینی کا کام وہی لوگ انجام دے رہے ہیں جو کسی نہ کسی حیثیت سے موجودہ حکومت کے متوسلین میں ہیں ان میں وہ سارے عوارض پیدا ہو چکے ہیں جو عموماً امیروں اور امیرزادوں کے ساتھ خاص ہیں لیکن ایک لفظ تعلیم یافتہ بول کر خود ہی نہیں بلکہ دوسرے بھی ان کو امراء و اغنیاء کے جوگہ سے باہر کر دیتے ہیں اور اب جو کچھ امیروں کے متعلق سنا جاتا ہے۔ سمجھتے ہیں کہ اس کا نشانہ، تعلیم یافتوں کا معاشی وسعت رکھنے والا گروہ نہیں ہے۔ بہر حال شاہ صاحب نے اس خط میں چند خاص طبقات سے مکتوبہ الیہ کو پرہیز کرنے کا حکم دیا ہے۔ اسی سلسلہ میں فرماتے ہیں:-

﴿اہل عجم کے فیشن اختیار کرنیوالوں سے﴾

شاہ صاحب کی بے زاری ﴿﴾

﴿فایاک و غنی طاغ بتکلف ذی الاعاجم ویتداخل فی﴾

مضاربة الجماجم ﴿﴾ (منقولہ از حیات ولی ص ۲۹۰)

”خبردار! بچے رہنا اس تو نگر امیر سرکش سے جو خواہ مخواہ غیروں (عجمیوں) کے فیشن کو زبردستی اختیار کرتا ہے اور جو لوگ صحیح راہ سے منحرف ہیں ان سے برابری اور مقابلہ کے میدان میں گھسا پھرتا ہے۔“

موجود اصطلاح کے ”تعلیم یافتوں“ اور پرانے محاورہ کے تو نگروں امیروں میں یہ دونوں خصوصیات کتنے بہتر طریقے پر پائی جاتی ہیں لیکن شاہ صاحب بے چاروں کو کیا معلوم تھا کہ آئندہ دنوں میں ارباب غنا و ثروت تو اپنی امارت و تو نگری کی وجہ سے بہ تکلیف زبردستی

غیروں کی ریس کریں گے۔ لیکن جو غربت کی وجہ سے اس مرض سے محفوظ رہیں گے ان کے سر ان ہی کی امامت اور قیادت کے نام سے غیروں کے لباس اور معاشرت کے منڈھنے کی کوشش کی جائے گی۔ انا نالہ وانا لہ راجعون۔

﴿پھر شاہ صاحب نے ہندوستان کو کیوں نہیں چھوڑا﴾

تذکرہ حضرت شاہ ولی اللہ اس قصہ کو مختصر کر کے میں پھر اپنے اصل مضمون کی طرف متوجہ ہوتا ہوں یعنی بہر حال شاہ صاحب کے گزشتہ بیانات سے یہ بات ظاہر ہو گئی کہ ہندوستانی مسلمانوں کے ان مصائب کو دیکھتے ہوئے بھی اور اس کا بھی انداز لگاتے ہوئے کہ زوال کی یہ حالت ابھی دور تک جائے گی۔ ”شاہ صاحب“ نے ”ہندوستان“ چھوڑنے کا ارادہ کبھی نہیں فرمایا اور نہ کسی کو اس کا مشورہ دیا کہ محمد رسول اللہ علیہ وسلم کی تصدیق کرنے والے کروڑوں مسلمانوں کو ان کے حال پر چھوڑ کر محض اپنی تن آسانی کے لئے ملک سے باہر نکل جائیں گویا۔

زاہد نہ داشت تاب جمال پری زخاں

سنجے گرفت و ترس خدا را بہانہ ساخت

﴿در حقیقت کشمکش حیات سے کسی طرح پیچھا چھوٹ نہیں سکتا﴾

حالانکہ جب زندگی ابتدائی کشمکشوں ہی کا نام ہے جو بھی جہاں کہیں جس حال میں

ہے۔ وہ

ع ”زندگی ہے یا کوئی طوفان ہے“..... کی چیخ میں مبتلا ہے۔

حتیٰ کہ ایک ایک، ایک مذہب، ایک رنگ، ایک معاشرت رکھنے والا یورپ آج جن قیامت خیز مصیبتوں کا شکار ہے اس سے زیادہ کا تو شاید تصور بھی نہیں کیا جاسکتا اور آج کیا کب ایک صدی بھی باقی ہمہ اتحاد و اشتراک و تعلیم و تہذیب و رواداری اس ملک میں خون کی ندیاں نہیں بہی ہیں۔ سروں کو گردنوں سے نہیں اڑایا گیا ہے اپنے ہی ہم مذہبوں نے خود، اپنے مذہب والوں کی عورتوں کو بیوہ اور بچوں کو یتیم نہیں کیا ہے گھروں میں آگ نہیں لگائی ہیں۔ مال و دولت کو تاخت و تاراج نہیں کیا ہے۔..... ہاں تو پھر ”تم خیرا کے خیالی منصوبے پکانا کہ یہاں سے چھوڑ کر دوسری جگہ جب چلے جائیں گے تو عافیت نصیب ہوگی۔ اور جس آسمان کے

نیچے یہاں ہیں کسی دوسری زمین میں وہ آسمان بدل جائے گا خام خیال نہیں تو کیا ہے؟ بلاشبہ بعض اوقات خاص حالات میں تو میں اس فعل پر بھی مجبور ہوئی ہے۔ اور مجبوری ارادی نہیں بلکہ مجبوری کی شکل میں آتی ہے۔ اس وقت اس پر عمل ناگزیر ہو جاتا ہے اور ایسی حالت میں عمل نہ کرنے والے اپنی قومی و ملی خصوصیات کو کھو بیٹھتے ہیں۔ لیکن ہر تھوڑی پریشانی کے بعد پیٹھ پھیر کر مورچہ چھوڑ دینا اور اسی کو عقل و رائے کا حکم قرار دینا میرے خیال میں بزدلی ہی نہیں۔ بلکہ ان لاکھوں بلکہ کروڑوں بیکسوں، کمزوروں کے ساتھ غداری بھی ہے۔ جنہیں دشمنوں کے بنجوں میں پھڑ پھڑانے کے لئے چھوڑ دیا جائے۔ حتیٰ الوسع حالات کا مقابلہ کرنا چاہئے اور اپنے سے زیادہ ان بے وسیلہ غریب ہم قوموں کا خیال کرنا چاہئے جو اپنے اندر بھاگنے کی سکت بھی نہیں پاتے۔ میرا خیال ہے کہ شاہ صاحب نے اسی خیال سے ہندوستان کو چھوڑنے کا ارادہ نہیں فرمایا۔ اور اپنے کو اس حد تک راضی کر لیا کہ اگر خدا نخواستہ اس پر ہنود کا عام اور تام دخل و قبضہ بھی ہو گیا تو اس وقت بھی ان کو یقین تھا جیسا کہ پہلے بھی یقین دلایا گیا ہے کہ ”وہی نہیں جن پر ہم گرتے ہیں بلکہ وہ جو ہم پر گریں گے ان کو چکنا چور ہونا پڑے گا۔“ اسلام کی مادی تاریخ بجائے پہلی صورت کے دوسری صورت کی شہادتیں اپنے اندر زیادہ تعداد میں رکھتی ہے۔ عرب گرا چورا ہوا، ایران گرا بھسم ہو گیا۔ مصری ہم پر ٹوٹے ان کو ٹوٹنا پڑا ترک جھپٹے۔ لیکن ہم ہی نے ان کو اپنے جھپٹے میں لے لیا۔ اور یہ بھی تو سوچنا چاہئے کہ ہمارا نصب العین صرف خود ہی جینا نہیں ہے۔ بلکہ اسی کے ساتھ دوسروں کو جلانے کا کام بھی تو ہمارے سپرد ہے۔ اور بقول حضرت شاہ صاحب کے ”ختم نبوت“ کے اسباب میں ایک بڑا سبب یہ بھی ہے کہ پہلے تو شخصی انبیاء اٹھائے جاتے تھے لیکن محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صدقہ میں جب ایک امت ہی اخرجت للناس کی سند دے کر دنیا کے لئے اٹھائی گئی ہے۔ ”پھر اب فالو نبوتوں کی ضرورت ہی کیا رہ جاتی ہے۔ قرآن مجید میں متعدد جگہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شہادت اور نگرانی کو اس کے ساتھ وابستہ کیا گیا ہے کہ ہم بھی شہداء علی الناس (دنیا کے انسانوں) کے نگران بنے رہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس عہدے کے ہٹنے کے ساتھ ہی اپنے رسول کی شہادت و نگرانی سے ہم محروم ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ جس دن سے ہمارا دماغ عام انسانوں سے ہٹ کر صرف اپنی جماعت تک محدود ہو گیا ہے۔ روز بروز ان نگرانیوں کی برکات سے ہم محروم ہوتے چلے جاتے ہیں۔ جو النبی الخاتم صلی اللہ علیہ وسلم

کی نگرانی کے لازمی نتائج ہیں۔

کیا کروں بات میں بات نکلتی چلی آتی ہے۔ قلم کو روکتا ہوں۔ لیکن یہ خیال کر کے کہ پھر موقعہ ملے نہ ملے جو کچھ اپنے اندر ہے دوسروں تک پہنچا دیا جائے۔ جذبات دبائے سے نہیں دیتے اور سلف کے حالات سننے یا سنانے کا مقصد بھی صرف سننا یا سنانا نہ ہونا چاہئے۔ ماضی سے مستقبل کی زندگی میں اگر کچھ مدوئل سکتی ہے تو پھر یہ کام کی بات ہے ورنہ بجز ایک دلچسپ داستان کے وہ اور کیا ہے۔

﴿ہندوستان میں قیام اور مستقبل کا کام﴾

ہاں تو میں عرض کر رہا تھا کہ ہندوستان ہی میں قیام کا ارادہ طے کرتے ہوئے شاہ صاحب نے یقیناً اپنے عمل کا کوئی پروگرام بنایا۔ اگرچہ یہ تفصیل انہوں نے اپنے دستور العمل کے ضوابط کو کسی جگہ قلم بند نہیں فرمایا ہے۔ لیکن پھلوں سے بھی درختوں کی نوعیت کا پتہ چلایا گیا ہے۔ خود جس کا عمل اس کے منصوبے کی فہرست اگر ہمارے سامنے پیش کرتا ہو تو ہمیں اس کے سمجھنے اور پڑھنے سے انکار نہ کرنا چاہیے۔

بہر حال میں نے جہاں تک غور کیا ہے اور شاہ صاحب کی کتابوں کی کثرت مطالعہ نے جن نتائج تک مجھے پہنچایا ہے۔ اس کا خلاصہ میرے الفاظ میں یہ ہو سکتا ہے کہ اپنے زمانہ کے مختلف فتنوں کو دیکھ دیکھ کر ان کے روٹنگٹے کھڑے ہو جاتے تھے۔ گویا ٹھیک ”اطیب النغم“ میں جو شاہ صاحب کا پہلا شعر ہے۔

کان نجوم ما اومضت فی الغیاب

عیون الافاعی اورؤس العقارب

ترجمہ: تاریکیوں میں جو ستارے چمک رہے ہیں۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ ناگوں کی آنکھیں ہیں یا بچھوؤں کے سر ہیں۔

وہ سماں ہندوستان میں ان آنکھوں کے سامنے گھوم رہا ہے۔ انہوں نے اندازہ کر لیا تھا اور وہ نہ کرتے تو کون کر سکتا تھا کہ اب

بنے رہو گے تم اس ملک میں میاں کب تک

بہ دیر یا بسویر رہی یہی نام نہاد اسلامی حکومت کے خاتمہ کا وقت قریب آچکا ہے۔ ان کے سامنے سوال آتا ہوگا کہ آخر ان کروڑوں مسلمانوں کا انجام کیا ہوگا۔ معاش کی کفیل تو ”رزاق مطلق“ ہے۔ جب تک جو جیتا ہے ذوالقوة الہتین۔ بہر حال اس کا انتظام کسی نہ کسی شکل میں کر ہی دیا کرتا ہے اور یوں قناعت کی راہوں کو چھوڑ کر کوئی سینہ کوبی ہی پر مصر ہو تو آج انگلستان جو نہ صرف سیاسی قوتوں کے ذریعہ سے دنیا کی آباد ترین پیداواروں کا تنہا خرمین ہے بلکہ تجارت صنعت و حرفت، قمار، دسوا الغرض مالی انتفاع کے ممکنہ وسائل کی کنجیاں ساری روئے زمین کی اسی کے ہاتھ میں ہیں اور کس انگلستان کا یہ حال ہے جو اپنے طول و عرض میں بنگال کے کسی متوسط درجہ کے ضلع سے بھی بڑا نہیں ہے۔ آبادی بمشکل صرف چار ساڑھے چار کروڑ تک پہنچی ہے۔ لیکن باایں ہمہ ان چار کروڑ میں تقریباً دو کروڑ لیبرس اور مزدوروں کے ”پیٹ پیٹ“ کے شور سے آسمان تھرا رہا ہے۔ آئے دن حکومت والوں پر پتھر پھینکے جاتے ہیں، کھڑکیاں توڑی جاتی ہیں اور جو کچھ ہوتا رہتا ہے۔ روزناموں کے تاروں میں اس کی خبر چھپتی رہتی ہیں بھلا جس ملک کو خود آزادی ہی حاصل نہیں ہے بلکہ بیسیوں ممالک و اقالم کی آزادیاں بھی اسی کی آزادی میں ہضم ہو چکی ہیں، سیاست بھی ”تجارۃ“ بھی صنعت بھی، حرفت بھی اور اس کے سوا ہر راہ سے ہر چیز ہر قوم کی اسی انگلستان کے باشندوں میں فنا ہو رہی ہے جب اس کا یہ حال ہے تو جن کا یہ خیال ہے کہ صرف غیروں سے آزاد ہو کر ہم بتیس کروڑ انسانوں کو ”آواز شکم“ کو قناعت کے ذریعہ سے نہیں بلکہ حرص و آرزو کی بھٹیوں کو بھڑکا کر دبانے میں کامیاب ہوں گے ان کے اس خیال کو خواب و خیال کے سوا اور کیا کہا جاسکتا ہے۔ آج جو حضرات عوام کو اپنے جھنڈوں کے نیچے پیٹ بجا بجا کر بلارہے ہیں اور دنیا کو یہ بتلا اور سمجھا رہے ہیں کہ انسان کے لئے سب سے مقدم اور اہم پیٹ کا مسئلہ ہے اور اعضاء انسانی میں عضو رئیس بس معدہ ہے۔ ان کو ”فکر معقول“ سے کام لینا چاہیے کہ جس راہ پر آدم کی اولاد کو وہ لے جا رہے ہیں یہ ترکستان جا رہی ہے یا کعبہ پہنچائے گی۔

بہر حال میرے نزدیک شاہ صاحب کے سامنے مسلمانوں کے ”شکم“ کے غم سے زیادہ زندگی کے اس ”سوال اہم“ کا ”غم“ تھا۔ جس کے جواب کے بغیر اس دنیا کی ہر زندگی بے نتیجہ ہو کر رہ جاتی ہے۔ یعنی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کو ”انجام“ کی درستی کے

لئے ”آغاز“ کا جو دستور خدا کی طرف سے پہنچایا تھا۔ شاہ صاحب دیکھ رہے تھے کہ مسلمانوں کو اس پیغام سے جو تعلق ہے۔ ان فتنوں کی پہلی زد قدرتنا اسی تعلق پر پڑے گی۔ اب تک ہر مسلمان علاوہ موروٹی مسلمان ہونے کے ”علی دین ملوکہم“ کے قانون کے تحت بھی مسلمان ہی رہنے میں فائدہ محسوس کرتا تھا۔ بلکہ غیروں میں بھی کتنے تھے جو اپنے مسلمان نہ ہونے پر اس زمانے میں پچھتاتے تھے۔ لیکن جب ”ملوک“ بدل جائیں گے اور ”ابتدعوہا وجعلوا اعزۃ اہلہا اذلۃ وکذلک یفعلون“ کے مستمر قاعدہ کی بنیاد پر اس وقت اسلام سے وابستگی کا یہ ”ملوک“ ذریعہ بھی باقی نہ رہے گا، سوال یہی تھا کہ پھر اسلام اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے دامن مبارک کے ساتھ بندھے رہنے کی ہندوستان میں مسلمانوں کی کیا شکل ہوگی۔

﴿شاہ صاحب کے زمانہ کے ”علماء و مشائخ“ کی کمزوریاں﴾

دوسری طرف وہ یہ بھی دیکھ رہے تھے کہ ہندوستان میں مذہب اسلام کی تعلیم و تعلم اور نشر و اشاعت کے جو ذمہ دار ہیں۔ ان کے دونوں طبقوں یعنی مذہب کے ظاہری رسوم و عالم عقائد کے محافظ جنہیں عموماً علماء کہتے ہیں اور مذہب کی واقعی روح اور اس کے باطنی مقاصد کے علم بردار جنہیں صوفیہ اور مشائخ کہتے ہیں، دونوں گروہوں کا اس زمانہ تک پہنچتے پہنچتے عجب حال ہو رہا تھا۔ شاہ صاحب کے جس ”پیغام“ کا ترجمہ پہلے درج کر چکا ہوں، اسی سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ اس عہد کے علماء کی کیا حالت تھی کہ ان کو مخاطب کر کے فرمایا تھا:

﴿اشغلتکم بعلوم الیونانیین وبالصرف والنحو والمعانی﴾
 ”تم یونانیوں کے علوم اور صرف و نحو و معانی میں الجھے ہوئے ہو۔“

﴿فقیہوں کے بے راہ روی اور بے بصری﴾

اور یہ تو عام علماء کا حال تھا۔ خصوصیت کے ساتھ جنہیں علماء دین کا لقب حاصل تھا۔ اور فلسفہ و منطق سے وہ ناکارہ تھے جن کا نام فقہاء تھا۔ ان کی یہ کیفیت تھی کہ دین کے حقیقی سرچشموں قرآن و حدیث اور ائمہ مجتہدین اور ان کے تلامذہ کے اقوال تک سے بہت دور آگے

۱۔ قرآن کی آیت ہے کہ ملکہ سبائے کہا تھا کہ سلاطین ”جب کسی ملک میں داخل ہوتے ہیں تو اس کو بگاڑ دیتے ہیں اور ملک کے عزت والوں کو خوار و ذلیل کر دیتے ہیں۔“ ۱۲

نکل کر ہر وہ چیز جو فقہ کے نام سے کسی کتاب میں لکھی ہوئی ہوتی ہے ان کے نزدیک ”وحی محکم“ اور ”نص قطعی“ کا درجہ حاصل کئے ہوئے تھی اپنی مشہور کتاب ”انصاف میں فقہاء عصر کی تصویر ان الفاظ میں کھینچتے ہیں:-

﴿فالسفیه یومئذ هو الشر المتشدد شدتیہ الذی حفظ اقوال
الفقہاء تویہا وضعیفہا من غیر تمیز و سروہا بشقشقة
شدقیہ﴾ (۹۳)

”اس زمانہ میں فقہ اس شخص کا نام ہے جو باتوں میں ہر دوزور سے ایک جڑے
کو دوسرے جڑے پر ٹپکتا ہو۔ جو فقہاء کے اقوال قوی ہوں یا ضعیف سب کو یاد
کر کے بغیر اس امتیاز کے ان میں سے کس میں قوت ہے کس میں نہیں ہے وہ
انہیں اپنے جڑوں کے زور سے چلتا کرتا رہے۔“

اسی گروہ کے متعلق دوسری جگہ لکھتے ہیں کہ ان بے تمیزیوں کا یہ حال ہے کہ خود امام ابو
حنیفہؒ ان کے تلامذہ اور بعد کے اقوال تک میں فرق نہیں کر سکتے:-

﴿ربزعلم ان جمیع ما یوجد فی ہذہ الشروح الطویلۃ و کتب
الفتاویٰ البضخمة فہر قول ابی حنیفہ و صاحبہ ولا یفرق بین
القول المخرج و بین ما ہو قول فی الحقیقۃ ولا محصل معنی
قولہم علی تخرج الکرخی کذا و اعلیٰ تخرج الطحاوی کذا
ولا یمیز بین قولہم جواب المسئلۃ علی قول ابی حنیفہ کذا
و علی اصل ابی حنیفہ کذا﴾ (۸۶)

”(یعنی اس زمانہ کے فقہوں کا) خیال یہ ہے کہ طویل و ضخیم شرحوں اور فتاویٰ
کی کتابوں میں جو مسائل پائے جاتے ہیں۔ یہ سارے کے سارے امام
ابو حنیفہؒ اور ان کے شاگردوں کے ہیں (یہ مسکین فقہ) اس کی تمیز نہیں رکھتا
کہ روایات ائمہ کے اصول کی بنیاد پر ان کی طرف منسوب کی گئی ہیں۔ ان
میں اور جو واقعی ان کے اقوال ہیں۔ ان میں کیا فرق ہے وہ بیچارہ فقہ کی یہ

اصطلاح بھی نہیں سمجھتا جو لکھتے ہیں کہ فلاں بات کرنی کی تخریج پر مبنی ہے یا
طحاوی کی تخریج سے اس کا تعلق ہے۔“

اسی طرح یہ قول کہ ابو حنیفہؒ کے قول پر مسئلہ کا جواب یہ ہے اور ابو حنیفہؒ کی اصل پر
جواب یہ ہے۔ ان دونوں قولوں میں ان کو کوئی تمیز نہیں ہوتی اور یہ بے چارے ان میں کوئی فرق
نہیں جانتے۔

اس قسم کی واقعی تنقیدوں سے ان کی کتابیں معمور ہیں۔ ماسوا اس کے ایک گروہ ان
لوگوں کا بھی تھا جو

﴿فَهَمُّوا لَطَبِ الْعِلْمِ تَوْصِلًا إِلَى الْعِزِّ دُونَ الْجَاهِ فَاصْبَحَ الْفُقَهَاءُ
بَعْدَ مَا كَانُوا مَطْلُوبِينَ طَالِبِينَ وَبَعْدَ أَنْ كَانُوا عِزَّةً بِالْأَعْرَاضِ عَنْ
السَّلَاطِينِ أَذِلَّةً بِالْأَقْبَالِ عَلَيْهِمْ﴾ (۸۱)

”طلب علم کے لئے اس لئے آمادہ ہوئے تاکہ علم کو اپنی عزت اور جاہ کے
حاصل کرنے کا ذریعہ بنائیں نتیجہ اس کے بعد یہ ہوا کہ فقہاء جو پہلے عوام کے
مطلوب تھے اب یہی عوام کے طالب ہو گئے اور سلاطین اور بادشاہوں کے
دربار سے الگ رہنے کی وجہ سے جو معزز شمار کئے جاتے تھے اب بادشاہوں
کے آستانوں پر وہ جھک کر ذلیل و خوار ہو رہے ہیں۔“

دین کے ان حاشیہ برداروں کو شاہ صاحب دیکھ رہے تھے اور ان کا سینہ شق ہوا جاتا
تھا۔ ”ملوکی“ رابطہ کے ختم ہونے کے بعد مسلمانوں کو ان کے صحیح دین پر باقی رکھنے کی ایسوں سے
کیا توقع ہو سکتی تھی پھر کچھ ہی دن پیشتر ان ہی دنیا طلب علماء کے ہاتھوں اکبر کے دربار میں
اسلام کا جو ہنجار ہو چکا تھا۔ اس کا نقشہ بھی شاہ صاحب کے پیش نظر تھا۔

﴿صوفیوں کی افسوسناک حالت﴾

دوسری طرف صوفیہ اور مشائخ کی جو کیفیت تھی۔ شاہ صاحب کے درد مندوں کے
لئے وہ صرف اذیت اور دکھ ہی بنی ہوئی تھی۔ کیونکہ علماء سے زیادہ غریب مسلمانوں پر اس زمانہ

میں خصوصاً ہندوستان میں ان ہی کا اثر غالب تھا۔ ان کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اگر مسلمان ان ہی کے ہاتھوں میں سپرد کر دیئے گئے تو یہ ان کو کہاں لے جا کر غرق کریں گے اپنے وصیت نامہ میں لکھتے ہیں:-

﴿کرامات فروشاں ایں زماں ہمہ الا ماشاء اللہ طلسمات و نیرنجات را کرامات دانستہ اند۔﴾

”کرامتوں کے بیچنے والے اس زمانہ میں سب کے سب (بجز اس کے جسے خدا چاہے) اپنی طلسماتی کارروائیوں اور علم نیرنج کے نتائج کو کرامات سمجھے بیٹھے ہیں۔“

پھر اس کی تفصیل کرنے کے بعد کہ آدمی طلسمی قوانین اور علوم نیرنجات کے زور سے کس کس قسم کے ”خوارق“ دکھا سکتا ہے آخر میں فرماتے ہیں کہ

﴿و اعمال جوگ کہ بعضے ملاحظات جوگیہ را خاصیت تمام است در اشراق و کشف﴾

”اور جوگ کی بعض تدبیریں، کیونکہ جوگیوں کی زندگی کے بعض پہلوؤں کو دوسرے کی حالت پر فی الجملہ اطلاع یا کشف وغیرہ سے خاص تعلق ہے۔“

جن لوگوں نے شاہ صاحب کے متعلق خیال قائم کیا ہے کہ انہوں نے ہندوستان کے براہمنہ اور جوگیہ کے فلسفہ دیدانت اور فلسفہ یوگا کو اسلامی حقائق سے مخلوط کر کے ایک ”جدید ہندی دین“ کی بنیاد ڈالی ہے۔ کیا ان کی نگاہوں سے یہ اور اس قسم کی بیسیوں عبارتیں نہیں گزری ہیں شاہ صاحب نے صاف کھل کر لکھ دیا ہے کہ

﴿بسیارے از سادہ لوحان دیدہ اسم کہ چوں ایں اعمال از شیخے فرا گرفتہ اند آں را عین کرامت می دانند﴾

”میں نے بہت سے سادہ لوحوں کو دیکھا ہے کہ کسی شیخ سے جب اس قسم کے عمل وغیرہ کو سیکھ چکے ہیں تو ان باتوں کو ٹھیک کرامت قرار دیتے ہیں۔“

لیکن واقعہ یہ ہے کہ:-

﴿صلاح و فحور، مقبول بودن یا مردود بودن دریں جایج فرق پیدا نمی کند﴾
 ”نیوکار یا بدکاری اسی طرح مقبول ہونا یا مردود ہونا اس معاملہ میں اس
 اختلاف حال سے کوئی فرق نہیں پڑتا (یعنی ان روحانی درزشوں سے یہ نتائج
 ہر ایک میں پیدا ہوتے ہیں خواہ شقی ہو یا سعید۔“

﴿نمود و انمود کا فتنہ﴾

خصوصاً جو زمانہ شاہ صاحب کا تھا۔ طرح طرح کے طریقے اور نئی نئی شکلوں میں
 تصوف پیش ہو رہا تھا۔ آپ ہی کے عہد میں ولی کا وہ مشہور مردود، معروف بہ۔ ”نمود و انمود“
 ایک خاص بھیس میں ان ہی طلسمی نیرنجاتی جو گیتی طریقوں کو سیکھ کر نمودار ہوا تھا۔ جس نے ایک
 خاص زبان اور اس کے قواعد ایجاد کئے تھے۔ اور اپنے ایک ساتھی کو محرم اسرار بنا کر۔ ”آقوزہ،
 ”مقدمہ“ نامی کتاب کے الہام کا دعویٰ کیا تھا۔ مدعی تھا کہ نبوت اور وصیت کے درمیان ایک اور
 لاہوتی عہدہ ہے۔ جس کی تعبیر وہ ”بیگوکت“ کے لفظ سے کرتا تھا، کہتا کہ ہر اولوالعزم پیغمبر کے
 ساتھ ہمیشہ نو بیگوک ہوا کئے ہیں اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بھی نو ہی بیگوک کا پیدا
 ہونا ضروری ہے پھر شیعوں کی جماعت میں تو یہ کہتا ہے کہ بیگوک اول حضرت علی کرم اللہ وجہہ
 تھے۔ ان کے بعد آٹھ اماموں تک یعنی حضرت علی رضا علیہ السلام تک امامت اور بیگوکت کے
 عہدے ایک ہی ذات میں جمع ہوتے رہے۔ ان کے بعد صرف امامت رہ گئی اور نواں آخری
 بیگوک کا منصب مجھے حاصل ہوا ہے۔ مجھ ہی پر یہ عہدہ ختم بھی ہوتا ہے۔ اور سنیوں سے کہتا کہ
 چار بیگوک تو خلفاء راشدین تھے۔ اور باقی چار بیگوکوں کے لئے بنی امیہ اور عباسیہ کے بعض
 ایسے خلفاء کے نام لیتا جو گونہ نیکی اور دینی حمیت میں امتیاز رکھتے تھے اور نواں بیگوک اپنے کو
 ٹھیراتا اس نے عوام کو فریب دینے کے لئے اپنے مریدوں اور لڑکوں لڑکیوں کے خاص خاص
 مجہول المعنی نام رکھے تھے۔ مثلاً وہی محرم اسرار جو گویا اس کا خلیفہ تھا۔ اس کا نام ”دوجی یار“ تھا نما
 نمود اور فقار نمود یہ اس کے لڑکوں اور ”نمانہ کلاں نمانہ خورد“ لڑکیوں کے نام تھے۔ مریدوں کو
 ”فربود“ کہتا تھا۔ اس نے پنج وقتہ نمازوں کے سوا ہر نامی عبادت کا طریقہ جاری کیا تھا۔

جو طلوع و غروب و استوائ شمس کے وقت ایک خاص طریقہ سے ادا کی جاتی تھی۔ علاوہ اسلامی عیدوں کے چند مزید تہواروں کا اضافہ کیا تھا۔ یعنی جن دنوں میں (العیاذ باللہ) وحی کی اس پر ابتداء ہوئی۔

ملعون مدعی تھا کہ اس پر بھی وحی دو طریقوں سے آتی ہے ایک میں آفتابی قرص اس کے سامنے نمودار ہوتا ہے اور اسی پر حرف لکھے ہوئے نظر آتے ہیں اور دوسری میں آواز آتی ہے۔ الغرض خرافات کا ایک سیلاب تھا جو پیر و مرید نے مل کر بہایا تھا چونکہ بعض امراء بھی اس کے معتقد ہو گئے تھے۔ اس لئے عوام کا میلان بھی اس کی طرف بتدریج بڑھتا جاتا تھا۔ حتیٰ کہ فرخ سیر بادشاہ بھی اس کی استجابت دعا کی شہرت سن کر تنہائی میں ملا۔ مکار نے یہ سن کر بادشاہ ملنے آ رہا ہے کمرہ کا دروازہ بند کر دیا۔ ہزار منت و سماجت کے بعد جب دروازہ کھلا تو بادشاہ کے سامنے اس مرگ چھالے کو پھینک کر جس پر خود بیٹھا ہوا تھا بولا:-

﴿پوست تخت گدائی و شاہی ہمہ داریم آنچہ می خواہی﴾

بادشاہ اپنے ساتھ روپوں اور اشرافیوں کی تھیلیاں نذر کے لئے گیا۔ ٹھوکر مار کر کنارہ کر دیں۔ جب فرخ سیر نے بہت اصرار کیا تو خود نوشتہ قرآن دے کر اس کی اجرت کل ستر روپیہ اس نے قبول کی۔ بادشاہ پر اس کی مصنوعی بے نیازی و استغناء کا پورا اثر ہوا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اب تک تو کچھ علماء اور عام پبلک کے خوف سے اپنے مزخرفات کے اعلانیہ اظہار کی اسے جرأت نہ ہوتی تھی۔ لیکن بادشاہ کی عقیدت مندی کے بعد خوب کھل کھیل ایک خاص قسم کی لمبی ٹوپی سر پہنے گئے آگے آگے دو جھنڈوں کے ساتھ اس کے ”فربود“ اس کی سواری نکالتے تھے۔ باہم ایک دوسرے پر غبر و گلاب چھڑکتے جاتے اور وہی مجہول المعنی اخزائی الفاظ والے منتر جپتے جاتے تھے اور اب ان کو کوئی کچھ نہیں کہہ سکتا تھا۔ دلی کی ایک بڑی مخلوق اس کی معتقد اور اس کی اصطلاح میں اس کی ”فربود“ ہو گئی تھی۔ فرخ سیر کے عہد تک اس کا یہی حال رہا۔ محمد شاہ کے زمانہ میں جب محمد امین خاں منصب وزارت سے سرفراز ہوئے تو منجملہ اور کاموں کے اس ”نمودا نمود“ کی بھی خبر لینی چاہنی لیکن اتفاق دیکھئے۔ جیسا کہ طباطبائی نے لکھا ہے۔ ٹھیک اس ہی

دنوں میں جب اس کی گرفتاری کے احکام جاری ہوئے۔ امین خاں جو مرض قونج میں پہلے ہی سے مبتلا تھے انتقال کر گئے۔ مردود ”نمامود“ کے لئے ان کی موت استدراج کا ذریعہ بن گئی۔ اب کیا تھا۔ خوب لن ترانیوں کی لینے لگا۔ اگرچہ دو تین سال بعد خود بھی مر گیا اور اسی کے بعد اس کے خلیفہ اول ”دوجی یار“ اور صاحبزادے بلند اقبال ”نمامود“ میں نصف لی و نصف لک کے قصہ میں جھگڑا ہو گیا۔ دوجی یار نے آخر ایک دن جب اس کے اکثر ”فر بودوں“ کا مجمع تھا کھڑے ہو کر ”سازش“ کا سارا قصہ سنا دیا۔ دونوں مل کر جو مسودات بناتے اور کاٹ پیٹ کر درست کرتے تھے ان کا طومار لوگوں کے سامنے پیش کیا اور کہا کہ اگر

﴿از جانب خدای بود۔ حاجت بحک و اصلاح ہم دیگر نداشت﴾

”اگر اللہ میاں کی طرف سے یہ کتاب ہوتی تو اس میں کاٹ چھانٹ اور اصلاح کی ضرورت نہ ہوتی۔“

دونوں کے حروف کے پہچاننے والے کثرت سے موجود تھے۔ راز کھل گیا اور بے چارے عوام کو اس کے فتنہ سے نجات میسر آئی۔ اگرچہ ”نمامود“ نے کچھ دن اپنے باپ کی بیگوکت کو بجائے دہلی کے ایک دیہات میں جا کر چلایا اور ”نمامود“ کے بعد ”فغار“ صاحب دوسرے بیٹے نے بھی کچھ دن اس تحریک کو چند لوگوں میں باقی رکھا۔ یہاں تک کہ بالآخر ”فغار“ کے مرنے کے بعد چند بقیۃ السیف اس کے اعزہ بنگال میں پناہ گزیں ہوئے اور مشہور اشتی القوم میر جعفر کے بیٹے میرن کی سرپرستی میں کچھ دن گزارے۔ خدا جانے ان منحوسوں کے نام لیوا اب بھی بنگال میں پائے جاتے ہیں یا نہیں؟ تاہم ایک مدت تک خصوصاً اس زمانہ میں جس میں حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ دلی میں تھے۔ ہندوستان کے مسلمان اس خبیث فتنہ کا شکار ہو رہے تھے اور واقعہ کچھ بھی نہ تھا۔ عالمگیر کے عہد میں کابل کا صوبہ دار امیر خاں تھا۔ اس کے پاس ایران سے یہی ”نمودانمود“ جس کا اصلی نام محمد حسین تھا، آیا اور سید ہونے کا مدعی ہوا۔ امیر خاں کی بیوی جو لالہ تھی اس نے ایک لڑکی پال رکھتی تھی اسی سے اس کا نکاح ہو گیا۔ امیری سے گزرنے لگی۔ امیر خاں جب مر گیا تو محمد حسین جو امیر خاں کے خوشبو خانہ کا داروغہ بھی تھا۔ عطر و گلاب کا تحفہ لے کر دلی چلا۔ لاہور میں عالمگیر کی وفات اور خانہ جنگی کی خبر ملی۔ امراء کے

ہاتھ اسی عطر و گلاب کو بیچ کر اس نے ساٹھ ستر ہزار روپے کھرے کئے اور اسی نے ”دوجی“ یار سے سازش کر کے مکر و فریب کا یہ طلسم کھڑا کیا تھا۔

مسلمانوں کی یہ زود اعتقادات جو غلط تصوف کے رواج کا نتیجہ تھیں۔ حتیٰ کہ بادشاہ تک ان ہی اوہام میں مبتلا تھا۔ اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ ایک صاحب بصیرت روح کے لئے کس درجہ سوہان روح بنی ہوئی ہوگی اور بات کچھ اسی پر ختم نہیں ہوگئی تھی۔ یہ تو ایک فرقہ تھا اور بھی اس قسم کے فرقے مختلف ناموں سے تصوف و عرفان کے بلند آہنگ دعوؤں کے ساتھ پیدا ہو رہے تھے اور مختلف شعبہوں، کرشموں سے عوام کو اپنی طرف مائل کر کے گمراہ کر رہے تھے۔ شاہ صاحب خود اپنا ذاتی تجربہ بیان فرماتے ہیں:-

﴿ نجوم کے شعبہ اور کہانت کے کرشمے ﴾

﴿ ما تجربہ کہ وہ ایم کہ ماہر در فن نجوم چوں دانست الحال کدام دقیقه است از وقت آن روز ازل جاذب و منتقل می شود بطالع و ہی بیوت مواضع کواکب در خاطر حل صورت می بندد گویا صفحہ تسوینہ لبیوت، مقابل ادایستادہ است وہم چنین ماہر در فن رمل گاہے در ول خود معین می کند کہ فلاں انگشت رالحیان قرار دادام و فلاں انگشت رافلاں شکل و رذہن صورت می بندد ازین اشکال کدام متولد می شود تا اینکه زانچہ پیش او حاضر می شود ﴾

”میں نے خود تجربہ کیا ہے کہ نجوم کے فن میں جن لوگوں کی مہارت ہوتی ہے۔ جب انہیں معلوم ہو جاتا ہے کہ اس وقت دن کے دقیقوں میں سے کون دقیقہ ہے تو مطالع کے ہر ہر بیت و مقامات کواکب کی طرف ان کا ذہن منتقل ہو جاتا ہے اور یہی حال ان لوگوں کا ہے جو فن رمل میں ماہر ہوتے ہیں اپنے دل میں

۱۔ میں نے اس مردود ”نمود و نمود“ کے حالات میں ذرا زیادہ بطن سے قصداً کام لیا ہے تاکہ لوگوں کو معلوم ہو کہ اس زمانہ میں بھی بعض لوگ اپنے مریدوں اور عزیزوں کو جو عجیب و غریب خطابات تقسیم فرماتے ہیں یا نبوت و مسیحیت مہدویت وغیرہ کے معجون سے ”بزوری“ ”مثالی“ اور خدا جانے کس کس قسم کی بنوئیں تراش رہے ہیں۔ یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ ہندوستان ان تماثلوں کو پہلے بھی دیکھ چکا ہے۔ ۱۲

یہ خیال جماتے ہیں کہ فلاں انگلی کو میں نے لہیان قرار دیا ہے اور فلاں انگلی کو فلاں شکل اور ان سب سے ذہن میں ایک صورت قائم کر کے سوچتے ہیں کہ ان میں ظاہری شکل و صورت میں بچہ کس کے مناسب ہوگا۔ اس طرح زانچہ سامنے ہو جاتا ہے۔“

اور یہ نجوم کا حال ہے۔ شاہ صاحب نے لکھا ہے کہ کہانت جس کی بہت سی قسمیں ہیں جن میں کبھی جن اور ارواح کو حاضر کیا جاتا ہے۔ (یعنی موجودہ زمانہ کا اس پر دیو چزم) نیز توجہ کو کسی نقطہ پر مرکوز کر کے معمول کو متاثر کرنا جسے اب مسمریزم کہتے ہیں شاہ صاحب لکھتے ہیں:-

﴿ہمت بستن بر کارے و شکل مہیب بر آمدن و دل بردل کے داشتن و طالب را مسخر کردن ہمہ از فنون نیرنج است﴾ (وصیت نامہ ص ۵۴)

”کسی کام کے متعلق ہمیں کو قوی کرنا اور ذردانی شکل میں لوگوں کے سامنے اپنے کو نمایاں کرنا کسی کے دل پر دل رکھنا اور طالب کو مسخر کرنا یہ ساری باتیں علم نیرنگ سے تعلق رکھتی ہیں۔“

لیکن غلط تصوف نے عوام کو باور کرایا تھا کہ یہ ساری باتیں قرب ہی کے دلائل ہیں۔ اس زمانہ کا ”ہیپناٹزم“ جس میں اپنے اوپر وجد کی حالت طاری کے غیبی باتیں بتائی جاتی ہیں۔ کچھ لوگ اس راہ سے بھی شکار پھنسا رہے تھے۔ حضرت شاہ صاحب ہی کا بیان ہے:

﴿ہم چنین وجد و شوق و قلق سرایت ایں حالت در حاضر آں﴾

”اسی طرح وجد و شوق و بے چینی اور جو لوگ موجود ہوں ان میں اس حال کا ساری و طاری ہو جانا۔“

حالانکہ اس حال کو بھی مقبولیت حق نے کوئی تعلق نہیں ہے بلکہ بقول حضرت:-

﴿منشاء آں حدت قوت بہیمہ است﴾

”اس کا منشاء بھیمی قوت کی شدت اور تیزی ہے۔“

اور یہ تو زندہ پیروں کی کرامات شمار ہوتے تھے۔ وہی تخیلات نے گزشتہ روحوں کے متعلق عجیب و غریب خیالات پیدا کر دیئے تھے۔ فاتحہ جو عموماً اس لئے کیا جاتا ہے کہ بزرگوں کی

روح کو کچھ قرآن پڑھ کر اور غرباء و مساکین کو کھلا کر اس کو ثواب بخشا جائے۔ لیکن سرزمین ہندی میں اس فاتحہ نے بتدریج ایصال ثواب کے مقصد کو چھوڑتے ہوئے قریب قریب وہی شکل اختیار کر لی تھی جو ہندوؤں میں چڑھا دے کی ہے یعنی مختلف قسم کے پھل پھول پکوان وغیرہ دیوتاؤں اور دیویوں پر اس لئے چڑھائے جاتے ہیں کہ ان دیوتاؤں کی روحیں چڑھانے والوں کے اس تحفہ سے خود متمتع اور لذت گیر ہوتی ہیں۔ جاہل مسلمانوں میں اس فاتحہ کا بھی قریب قریب یہی مطلب ہو گیا تھا اور عوام ہی کیا بعض خواص تک کا یہ خیال تھا کہ جو کھانا کسی بزرگ کے نام فاتحہ دیا جاتا ہے۔ اس پر اس بزرگ کی روح حاضر ہوتی ہے اور اس سے لذت گیر ہوتی ہے۔ مولوی غلام حسین طباطبائی جنہوں نے سیر المتاخرین جیسی کتاب لکھی ہے اور جو ان کے علم و فضل کی کھلی دلیل ہے خود اپنے متعلق ایک موقع پر اسی کتاب میں لکھتے ہیں کہ:-

بعضے مردم کہ دسترخوان حضرت شاہ مرواں می نمائند و راں نشانے از غیب می شود۔ چنانچہ در ہند معرلے و مکرر مردم ہوشیار بچشم خود نشانہا را دیدہ سرمہ اعتقادہ بصیرت درویدہ دلہا کشیدہ اند و ایں کرامت ازاں جناب بنظر احقر ہم الحمد للہ مکرر در آمدہ ہے (ص ۲۵۰ ج ۲)

”بعض لوگ جو حشرت شاہ مرواں (یعنی حضرت علی کرم اللہ وجہہ) کے دسترخوان کی تقریب کرتے ہیں اور اس دسترخوان پر غیب سے آپ ہی آپ ایک نشان نمایاں ہو جاتا ہے چنانچہ ہندوستان میں اس کا رواج ہے اور بڑے اچھے ہوش گوش والوں نے بار بار انی آنکھوں سے ان نشانوں کو دیکھا اور اپنی آنکھوں میں اعتقاد و بصیرت کا سرمہ لگایا۔ بلکہ (دسترخوان والی کرامت حضرت کی) اس کا معائنہ تو الحمد للہ متعدد بار اس احقر کو بھی ہوا ہے۔“

۱ جس کے معنی بجز اس کے اور کیا ہو سکتے ہیں کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے نام سے جو فاتحہ دی جاتی ہے۔ اس کے متعلق لوگوں کا خیال تھا کہ فاتحہ کے اس کھانے پر خود حضرت تشریف فرما ہوتے ہیں۔ اور اسی لئے ”قبولیت“ کی علامت اس پر بنا دیتے ہیں۔ بتایا جائے کہ کہاں فاتحہ کا وہ مقصد کہ بزرگوں کی روح کو اس کا ثواب بخشا جاتا ہے اور کہاں یہ اعتقاد کہ اس کھانے پر

ان بزرگوں کی روح خود حاضر ہوتی ہے۔ یہ نشانات کس طرح بنتے تھے۔ اس سے تو خدا ہی واقف ہے لیکن طباطبائی صاحب ہی نے ایک واقعہ لکھا ہے کہ ایک شخص نے جو ان کے نزدیک خارجی العقیدہ تھا شیعوں کے علم الرعم ان غیبی نشانوں کی خبر سن کر دعویٰ کیا کہ ہم بھی یزید وغیرہ کے نام کا فاتحہ دیتے ہیں اور اسی قسم کے دسترخوان کا انتظام کرتے ہیں چونکہ ان کی روحوں سے مجھے اخلاص ہے اس لئے وہ بھی ضرور آکر دسترخوان پر نشان بنائیں گے۔ یہ ارادہ کر کے اس نے دسترخوان کا انتظام کیا اور ایک عورت کو حکم دیا کہ کمرہ میں دسترخوان بند کر کے باہر اس کی کنجی لے کر بیٹھ جائے اور تھوڑی دیر بعد دروازہ کھولے اور جب نشانات دسترخوان پر نمایان ہوں تو مجھے خبر دے تاکہ دوسروں کو بھی اس کا تماشا دکھایا جائے۔ اب طباطبائی صاحب لکھتے ہیں کہ:-

”زن در باطن شیعہ بود و مذہب خود مخفی داشت بعد از ساعتی حسب الامر در را کشود دید کہ سگے سیاہ گرگین و راں جائے گاہ بر سر دسترخوان نشہ از ہرگونہ طعام اندک اندک چشیدہ و دمی چشد از شدت شغف خود داری نہ توانست بے اختیار و دید و بشارت رسانید کہ نشان چہ معنی دار و خود تشریف آوردہ نوش جان می نمایند“

”وہ عورت اندر سے شیعہ مذہب اور تقیہ کئے ہوئے تھی تھوڑ دیر بعد اس نے جب دروازہ کھولا تو کیا دیکھتی ہے کہ ایک کالا بھڑیے جیسا کتا وہاں دسترخوان پر ہر قسم کے کھانے کو تھوڑا تھوڑا چکھ چکا اور چکھ رہا ہے۔ عورت کو اپنے مذہب سے جو محبت تھی اس نے اپنی خود داری پر اس کو باقی نہ رکھا اور بے اختیار ہو کر دوڑی امیر کو اس نے بشارت پہنچائی کہ نشان کا کیا پوچھتے ہیں وہ تو خود ہی تشریف لا کر نوش جان فرما رہے ہیں۔“

ظاہر ہے کہ یہ حرکت ”زن در باطن شیعہ بود“ ہی تھی۔ بس اسی واقعہ سے ان نشانوں کے بنانے والوں کا سراغ مل سکتا ہے۔ آج بھی ہندوؤں میں جب مردے گنگا میں بہانے کے لئے بھیجے جاتے ہیں تو ان کے بہنے کے بعد دوسرے دن عموماً پنڈت یہ اعلان کرتے ہیں کہ جس گھاٹ سے مردہ بہایا گیا اس کے کنارے کی ریت پر فلاں جانور کے پاؤں کے

نشانات دیکھے گئے اور اسی سے اندازہ کیا جاتا ہے کہ مرنے والے نے اسی جانور کے جون میں جنم لیا جس کے نشانات نظر آئے ہیں مجھ سے بعض معتبر برہمنوں نے بیان کیا کہ یہ کارستانی خود ان پنڈتوں کی ہوتی ہے کہ جو گنگا کے کنارے مردوں کے یہاں کی رسم انجام دیتے ہیں اور ظاہر ہے کہ اس کے سوا اور ہو بھی کیا سکتا ہے یا ممکن ہے کہ رات کو ہر قسم کے جانور چلتے ہیں ان ہی کو مردے کے قدم کا نشان فرض کر لیا جاتا ہے وہم کی خلاقی ہو۔ بہر حال طباطبائی صاحب نے کتے کا جو واقعہ نقل کیا ہے اور یہ کہ ہر قسم کے کھانوں کو ”اندک اندک“ اُسے چھکتے پایا گیا۔ اس سے بھی اس خیال کی تائید ہوتی ہے کہ صاحب فاتحہ کے متعلق لوگوں کا عام خیال یہی تھا کہ تھوڑا تھوڑا ہر کھانے سے مردہ کی روح چمکتی ہے۔ گو بعد اللہ اب بہت کم لوگ فاتحہ کے متعلق یہ خیال رکھتے ہیں اور عموماً اب یہی سمجھا جاتا ہے۔ کہ مقصود بزرگوں کی روح کو ثواب پہنچانا ہے لیکن بعض لوگ اب بھی ایسے ہیں۔ جنہوں نے مجھ سے خود کہا ہے کہ ”کھانے کی روح کو بزرگوں کی روح آ کر کھا جاتی ہے اور اس کے راوی وجود کو ہم لوگ کھاتے ہیں۔ اسی بنیاد پر ہم اس کھانے کو بزرگوں کا اُش خیال کرتے ہیں۔“ الغرض غلط ”تصوف“ اور جھوٹے ”سمش“ کی راہوں سے اقتصادی و عملی تباہیوں کا سیلاب مختلف شکلوں میں مختلف گوشوں میں مسلمانوں کی خالص اسلامی و دینی زندگی کے ”ایوان“ کو دھمکیاں دے رہا تھا۔

﴿ام الفتن یعنی خانہ جنگی﴾

اور سچ پوچھئے تو باہر کے فتنوں کے جگانے میں دراصل جو حقیقی اسباب کام کر رہے تھے۔ ان کا باہر سے نہیں، بلکہ بالکل تعلق ہمارے ”اندز“ ہی سے تھا۔ کچھ آج نہیں بلکہ جب کبھی جہاں کہیں یہ صورت پیش آئی ہے۔ تحلیل و تنقیر کے بعد یہی ثابت ہوا کہ جو کچھ ہوا۔

﴿ما ظلمناہم ولکن کانوا انفسہم یظلمون﴾

”نہیں ظلم کیا ہم نے بلکہ وہ خود اپنے آپ پر ظلم کرتے تھے۔ کے ازلی قانون ہی کے تحت ہوا۔ خصوصاً امت محمدیہ صلی اللہ علیہ صلوٰۃ و سلاما کے متعلق تو صحیح حدیثوں میں آچکا تھا کہ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بارگاہ الہی میں

درخواست پیش کی:-

﴿لَا تَسْلُطْ عَلَيْهِمْ عَدُوًّا مِنْ أَنْفُسِهِمْ﴾

”(میری امت پر) ان ہی میں سے ان پر کوئی دشمن نہ مسلط کیا جائے۔“

تو ”الحکیم الغنی“ کی طرف سے آپ کو جواب ملا:-

”میں اُن پر اُن کے سوا کسی (بیرونی دشمن) کو مسلط نہیں کرونگا۔

﴿لَا اسْلُطْ عَلَيْهِمْ عَدُوًّا سِوَى أَنْفُسِهِمْ يَسْتَبَاحُ بَيْنَهُمْ مَنْ وَلَوْ

اجتمع عليهم من باقطارها حتى يكون بعضهم مهلك

بعضها﴾

”بلکہ وہی اندرونی دشمن ان کے قلمرو میں تباہی پھیلانے کا اور خارجی دشمن

مسلمانوں پر مسلط نہیں ہو سکتے اگرچہ زمین کے کناروں سے سمٹ کر کیوں نہ

وہ آجائیں بلکہ مسلمان ہی باہم بعض بعض کو ہلاک کریں گے۔“

صحاح کی مختلف کتابوں مثلاً ابوداؤد و ترمذی میں الفاظ کی کچھ کمی بیشی کے ساتھ یہ

حدیث موجود ہے اور اسلام کی تاریخ مشاہدہ ہے۔ جو مصیبت مسلمانوں پر جس شکل میں بھی آئی

در اصل اس کی ابتداء گھروالوں سے ہوئی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اکثر فرمایا کرتے:-

﴿اخشى عليكم الدنيا فتنافسوا فيها﴾ (بخاری)

”میں تم پر دنیا سے ڈرتا ہوں کہ اس کے معاملہ میں باہم نفسانیت میں مبتلا

ہو جاؤ گے۔“

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس جب فارس کے اموال غنیمت آئے۔ آپ

نے ان کو مسجد نبوی کے چبوتروں پر ڈلوادیا۔ صبح ہوئی تو جو کچھ آیا تھا اس پر سے چادر ہٹائی گئی۔

راوی کا بیان ہے:-

﴿ننظر عمر الى شئ لم نر عيناه مثله من الجوهر والر

بؤ والذهب والفضة نبي﴾

”عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ایسی چیزیں دیکھیں جنہیں ان کی آنکھوں نے

نہیں دیکھا تھا یعنی جواہرات موتی اور سونے چاندی وغیرہ پس عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ رو پڑے۔“

عبدالرحمن بن عوف حاضر تھے۔ بولے:-

﴿هَذَا مِنْ مَوَاقِفِ الشُّكْرِ فَمَا يَكِيكُ﴾
 ”یہ تو شکر کی جگہ ہے پھر آپ کو کس خیال نے رُلا یا۔“
 فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جواب میں فرمایا:-

﴿أَجَلٌ وَلَكِنَّ اللَّهَ لَمْ يَعْطِ قَوْمًا هَذَا إِلَّا الْقِيَّ بَيْنَهُمُ الْعَدُوَّةَ وَالْبَغْضَاءَ﴾ (کتاب الخراج لابن یوسف)

”ہاں! لیکن اللہ تعالیٰ نے کسی قوم کو یہ چیز نہیں دی۔ مگر اسی کے ساتھ ان میں باہم عداوت و بغض و کینہ پیدا ہو گیا۔“

مغل حکومت بھی عہد عالمگیری کے بعد فتنوں کے جس طوفان میں گھر گئی تھی۔ جس کا ایک اجمالی نقشہ آپ کے سامنے پیش کیا گیا۔ جانتے والے جانتے ہیں کہ باہر سے سے جتنے سیلاب آئے ان کا سرچشمہ بھی اندر ہی تھا جس کا انسا نہ طویل ہے اور عام طور سے تاریخ کی کتابوں میں مسطور ہے میرا اشارہ اس اندرونی فتنہ کی طرف ہے جس کی تعبیر عام کتابوں میں ”سادات بارہ“ کے فتنہ سے کی جاتی ہے۔

۱۔ کہا جاتا ہے کہ سید ابوالفرج واسطی اکبر کے عہد سے پہلے عراق کے مشہور واسطہ سے ہندوستان تشریف لائے۔ ابتداء میں پٹیالہ (پنجاب) کے گرد و نواح میں آپ کی اولاد آباد ہوئی۔ جن گاؤں میں ان کی اولاد آباد ہوئی تھی ان کے نام چیت بانو نہ انھیں پورا درجہ نہ تھے، پھر سادات کا یہ خاندان آگے بڑھا دوآبہ میں آباد ہوا۔ ضلع مظفرنگر میں جانشہ اب بھی ایک مشہور قصبہ ہے اس میں اس خاندان کے کچھ لوگ آباد ہوئے اور وہی سادات بارہ کے نام سے مشہور ہیں۔ یہ بارہ کہلاتے ہیں: مورخین اس کی توجہ یہ میں مختلف ہیں لیکن ابوالفرج واسطی کی جو اولاد جگہ نہیر میں آباد ہوئی تھی اور بعد کو وہ جاجیری سادات کے نام سے مشہور ہوئی ان کا ایک سلسلہ بہار ضلع موگیر میں پایا جاتا ہے اور چونکہ بارہ گاؤں میں یہ آباد ہیں اس لئے سادات بارہ گانوں کہلاتے ہیں۔ خاکسار مناظر احسن گیلانی کا تعلق بھی ان ہی جاجیری سادات سے ہے بارہ کی وجہ یہاں بھی ممکن ہے بارہ گاؤں سے ہو۔ ۱۲

﴿سادات بارہ کا فتنہ﴾

عالمگیر کے لڑکے بہادر شاہ کے انتقال کے بعد معزالدین جہاندار شاہ اور فرخ سیر میں جنگ ہوئی اس معرکہ میں فرخ سیر کی کامیابی چونکہ بالکلیہ بارہ کے سیدوں میں سے دو بھائی حسین علی خاں اور حسن علی خاں رہین منت تھی اسی بنیاد پر فرخ سیر کے عہد میں حکومت پر ان ہی دو بھائیوں کا اقتدار قائم ہو گیا۔ اور ایسا اقتدار کہ بادشاہی بیچارہ ”شاہ شطرنج“ ہو کر رہ گیا۔ قدرتنا فرخ سیر کے لئے یہ صورت ناقابل برداشت بنتی چلی جا رہی تھی۔ سید بھائیوں اور فرخ سیر میں ان بن ہو گئی اور اسی مخالفت اور سعادت نے بالآخر ان نتائج کو پیدا کیا جن کا خمیازہ آج ہندوستان کے مسلمان بھگت رہے ہیں۔ طباطبائی جو ہم مشربی کی وجہ سے بجائے فرخ سیر کے سید بھائیوں کے سخت ترین طرف داروں میں ہیں۔ ان کو لکھنا پڑا کہ یہی فسادات سادات ﴿بمرور تمام مملکت ہندوستان را فرد گرفتہ اقتدار ارسلاطین تیموریہ بالمرہ بباد﴾

﴿فتارت﴾

”آہستہ آہستہ ہندوستان کی ساری مملکت کا اس نے احاطہ کر لیا اور تیموری سلاطین کا اقتدار قطعی طور سے فنا کی آندھی کے نذر ہو گیا۔“

﴿اس فتنہ کی اصل جڑ شیعہ سنی اختلاف تھا﴾

اگرچہ بظاہر یہ مخالف بادشاہ اور ان سید برداران کے درمیان تھی۔ لیکن جو واقعات کے عالم ہیں وہ جانتے ہیں کہ ”سادات بارہ“ کے اقتدار نے دراصل اسی فتنہ کی آگ کو ہوادے کر تیز کر دیا۔ جس کی ابتدائی ہمایوں کے عہد سے اس ملک میں شروع ہوئی تھی۔ سب جانتے ہیں کہ یہاں اسلام کا داخلہ (عربی حملوں کے بعد) ترکستانی مسلمانوں کے ذریعہ سے ہوا۔ اور یہ عجب اتفاق ہے کہ غوریوں سے لودویوں تک جتنے خانوازدے دلی کے تخت پر قابض ہوئے سب کے سب سنی حنفی مسلمان تھے۔ جب تک یہ دور رہا ہندوستانی مسلمان اس وقت تک بڑے خوش قسمت رہے۔

﴿ہندوستان میں شیعیت کے قدم﴾

لیکن مغلی عہد میں ہمایوں کو شیرشاہی حکومت کے مقابلے میں جب ایرانی حکومت کی امداد سے کامیابی حاصل ہوئی تو اس ملک میں تورانیوں کے ساتھ ایرانیوں کا اقتدار بھی بڑھنے لگا۔ ہمایوں اور ہمایوں کے بعد جتنے مغل بادشاہ تھے وہ بطور منت شناسی کے ایران سے آنے والوں کو بڑی قدر و عزت کے ساتھ ہاتھوں ہاتھ لینے لگے اور اسی زمانے سے بڑے بڑے عہدوں پر حتیٰ کہ صوبہ داریوں اور گورنریوں پر بھی ایرانی حکام کا تقرر ہونے لگا۔ عالمگیر کے عہد تک مغل حکومت شباب کے دور میں تھی جو زہر اندر داخل ہو گیا تھا اس کے نتائج محسوس نہیں ہوئے تھے۔ لیکن عالمگیر کے بعد عناصر کے اعتدال میں ضعف پیدا ہوا اور ان دو متضاد عناصر کے اندرونی تصادم نے رنگ لانا شروع کیا۔ سادات بارہ اگرچہ وطناً ایرانی نہ تھے لیکن ان کا مسلک وہی تھا جو ایرانیوں کا تھا۔ قدرتی طور پر ان کے زمانہ اقتدار میں ایرانی امراء کو تورانی یا دوسرے لفظوں میں ”سنی امراء پر برتری حاصل ہونے لگی اور اتنی برتری کہ بعض بڑے بڑے تورانی امیر تو حکومت اور حکومت کے تعلقات سے دست کش ہو کر گھر بیٹھ گئے۔ جن میں حضرت آصف جاہ اول بانی حکومت آصفیہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں میر غلام علی آزاد بلگرامی لکھتے ہیں:-

﴿کہ بنا بر گری بازار امراء جدید و کساد بازاری امراء قدیم از نوکری استعفاد او بہ دار الخلافہ شاہجان آباد آمدہ و لباس درویشانہ پوشیدہ خانہ نشین شد﴾ (ص ۱۲)

”نئے امیروں کی گرم بازاری اور پرانے قدیم امراء کی کساد بازاری کو دیکھ کر حضرت آصف جاہ اول مغلی حکومت کی ملازمت سے مستعفی ہو کر شاہجہان آباد پہنچے اور درویشانہ لباس اختیار کر کے خانہ نشین ہو گئے۔“

خلاصہ یہ ہے کہ سارے فتنوں کی بنیاد اگر سچ پوچھے تو ہندوستان میں بھی وہی مسئلہ رہا جس سے کہ ہر جگہ حتیٰ کہ پہلی صدی ہجری میں فتنوں کی ابتداء ہوئی۔ یعنی وہی شیعیت و سنیت کا جھگڑا۔ ابتداء تاریخ اسلام سے جس کسی کے دل میں دنیا طلبی کی انگلیٹھی سلگی اس نے دین کے

اسی مسئلہ کی آڑ لے کر اپنے حرص ہوا کی جہنم روشن کی اور آج تک یہ حال ہے کہ جس واقعہ پر اس اختلاف کی بنیاد قائم ہے۔ حالانکہ اس پر تیرہ سو سال گزر چکے، لیکن جب کسی کا جی چاہتا ہے۔ اس کو تر و تازہ کر کے اپنے مقاصد کے حصول کا ذریعہ بنالیتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ واقعہ اسی وقت پیش آ رہا ہے۔ اور فریقین کو دو صورتوں میں سے کسی ایک صورت کو ابھی طے کرنا ہے۔

﴿اسلامی عقائد کے متعلق ایک عام غلط فہمی﴾

کتنی عجیب بات ہے کہ قرآن تعلیمات کے بے شمار بنیاد و محکمات مثلاً یہ کہ کسی مومن کے لئے قطعاً یہ جائز نہیں ہے کہ وہ اپنے کو کسی حال میں اکیلا و تنہا خیال کرے۔ اس پر یہ اعتقاد حتمی طور پر واجب ہے کہ ہر حالت میں ایک لامحدود قوت کو انتہائی رحم و کرم کے ساتھ اپنے قریب یقین کرے محسوس کرے کہ یہ قوت اس کے ظاہر و باطن اول و آخر کو محیط ہے۔ بغیر کسی دغدغہ کے اس واقعہ پر بھروسہ کرے کہ اس کی ایمانی صفت کی وجہ سے یہی لامحدود طاقت ہر لمحہ اور ہر حال میں اس کی طرف سے مدافعت پر آمادہ ہے۔ جب مومن مخلوقات کی ربوبیت پر قدم جماتا ہے تو اس کو باور کرنا چاہئے اور قطعاً بغیر کسی شک و شبہ کے باور کرنا چاہیے کہ غیبی قوتیں یعنی ملائکہ اللہ اس پر نازل ہو رہے ہیں اور دنیا و آخرت میں اس کی امداد و اعانت ان کے فرائض میں سے ہے علی ہذا۔ مثلاً ہر مومن کا فرض ہے کہ اپنے ماں باپ، اموال و تجارت، گھر درالغرض ہر چیز سے زیادہ اپنے رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام سے محبت رکھے۔ ظاہر ہے کہ یہ اور ایسی بیسیوں باتیں ہیں جو قرآن کے نصوص صریحہ سے بغیر کسی تاویل کے ماخوذ ہیں۔ اسی طرح حمد و شکر تو کل و تفویض، توبہ استغفار، امانت و اطاعت وغیرہ وغیرہ ان کے قرآن حقائق ہونے میں کون شک کر سکتا ہے۔ بلاشبہ یہ ساری چیزیں ایسی ہیں کہ ان کا انکار کرنے والا کافر ہو جاتا ہے اور ظاہر ہے کہ ان ہی چیزوں کا نام عقائد ہے لیکن بجائے ان کے ایسی باتیں کہ خدا کے صفات زائد برذات ہیں یا عین ذات، صفات حقیقی سات ہیں یا آٹھ پھر ہر صفت کی نوعیت کیا ہے۔ خصوصاً کلام کی قسمیں اور اس کے مباحث، ازیں قلیل یہ مسئلہ کہ دنیاۓ اسلام کے کس علاقہ کے کن باشندوں کو اور ان باشندوں میں کس قبیلہ کو اس قبیلہ میں سے کس بطن کو اس بطن سے کس فخذ کو اس

فخذ سے کس گھرانے والوں کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جانشینی اور خلافت کا صرف استحقاق نہیں بلکہ پہلا استحقاق حاصل ہے۔ ان مسائل کو عقائد کی کتابوں میں مجبوراً اس لئے شریک کرنا پڑا کہ مختلف لوگوں نے مختلف زمانوں میں ان ہی مسائل کو اپنے فساد و زلیغ کا ذریعہ بنایا۔ اگر بنی امیہ خلافت کے مباحث کا شب و شتم کے ساتھ برسرِ منبر فیصلہ کرنے کی ابتداء نہ کرتے تو جو واقعہ ہو چکا تھا اور جن لوگوں کا اس سے تعلق تھا جب وہ گزر چکے تھے۔ پھر ان کو کوئی خواہ مخواہ کیوں چھیڑتا۔ لیکن چھیڑنے والوں نے ان ہی چیزوں کو زیادہ اجاگر کر کرے اسلام کی طرف منسوب کرنا شروع کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کتابوں میں آخر ان ہی مباحث کی طرف زیادہ توجہ کرنی پڑی اور قرآن کے سینکڑوں بیانات و حکمت نگاہوں سے اوجھل ہو گئے اور ایسے اوجھل کہ بجائے اعتقادات میں شریک کرنے کے سمجھا جاتا ہے کہ اچھے مسلمان ہونے یا دوسرے لفظوں میں صوفی مسلمان ہونے کے لئے ان کی مشق و مزاولت ایک پیشہ کی حیثیت رکھتی ہے اور بس۔ حالانکہ ان میں ہر مسئلہ قرآن کا تھا۔ جس کا انکار آدمی کو اسلام کے دائرہ سے خارج کر دیتا ہے۔ یہ غلط فہمی نہ ہونی چاہئے کہ عقائد کی کتابوں میں جن چیزوں کو عقائد کے ذیل میں علماء نے شریک فرمایا ہے۔ میں ان کو اعتقادات قرار دینے سے انکار کر رہا ہوں۔ بلکہ مجھے کہنا یہ ہے کہ مختلف زمانوں میں مختلف اغراض سے لوگوں نے بعض خاص چیزوں پر جو زور دے دیا تو اس کا آج یہ نتیجہ ہے کہ بہت سے اعتقادی امور ان کتابوں میں شریک نہ ہو سکے جو اسی لکھی گئی ہیں کہ مسلمان کا اس کے ہر مسئلہ پر اعتقاد رکھنا ضروری ہے۔ لوگوں کو غلط فہمی یہ ہو گئی کہ جو کچھ ان کتابوں میں نہیں گویا وہ اعتقادات سے تعلق ہی نہیں رکھتا حالانکہ جہاں تک میں سمجھتا ہوں یہ واقعہ نہیں ہے۔ کم از کم قرآن کی ہر تعلیم کی حیثیت تو یہی ہے کہ اس کا انکار کفر ہو جاتا ہے۔ خواہ وہ توکل کے سلسلے کی چیز ہو یا تسلیم و رضا و صبر و شکر کے باب کی ہو۔

﴿شہزادہ فرخ سیر کا بیدردانہ قتل﴾

میں اپنے مقصد سے بہت زیادہ دور ہٹتا چلا جا رہا ہوں۔ کہہ یہ رہا تھا کہ بالآخر سادات بارہ کے زمانے میں پھر اسی پرانے مسئلہ نے ہندوستان میں سر اٹھایا اور بالآخر اس کا

انجام اس پر ہو کہ ان ہی بادشاہ گیر سید بھائیوں کے ہاتھ فرخ سیر مقتول ہوا اور انتہائی بیدردی و شقاوت قلبی میں اس کی گردن کھینچ دی گئی۔ حضرت آصف جاہ اول کے استاد مرزا عبدالقادر بیدل عظیم آبادی نے تاریخ لکھی:-

﴿دید کی کہ چہ بادشاہ گرامی کردند صد جور و جفا ز رہ خانی کردند﴾

﴿تاریخ چوا ز خرد بکستم فرمود سادات بولے نمک حرامی کردند﴾

مغل بادشاہ کارباب حکومت کے ہاتھ سے مارا جانا غالباً یہ پہلا واقعہ تھا۔ جو ولی میں پیش آیا۔ حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ اس وقت جوان ہو چکے تھے۔

﴿شاہ عبدالرحیم کا ایک عجیب خواب﴾

”انفارس العارفین“ میں آپ نے فرخ سیر اور سید بھائیوں کے اس تنازعہ کا ذکر فرمایا ہے اور ایک خاص بات یہ لکھی ہے کہ آپ کے والد شاہ عبدالرحیم کی خدمت میں اس جھگڑنے کے قصے جب پیش ہوئے تو آپ نے فرمایا:-

﴿در واقعہ دیدم کہ گویا مسند فرخ سیر را مردمی خواہند کہ برہم زنند﴾
 ”میں نے (کشفی) واقعی میں دیکھا کہ فرخ سیر کی مسند کو لوگ الٹ دینا چاہتے ہیں۔“

اس کے بعد شاہ ولی اللہ نے جو واقعہ نقل فرمایا ہے ”عقلی دنیا“ اس کے ماننے کے لئے شاید تیار نہ ہو۔ لیکن جیسا کہ ابدالی اور مرہٹہ کی جنگ کا غیب میں کسی اور سے تعلق تھا۔ فرخ سیر کا ایک زمانے تک سید بھائیوں کے حملہ سے محفوظ رہنا اس میں جس کا ہاتھ کام کر رہا تھا۔ وہ شاہ ولی اللہ کی زبانی سنئے۔ فرماتے ہیں کہ میرے والد نے اُن لوگوں سے جو بادشاہ کی مسند الٹنا چاہتے تھے فرمایا کہ

﴿برائے سن ایں را ہم چنین بگزايد﴾ (ص ۶۲)

”میری خاطر اس بادشاہ (فرخ سیر) کو اسی حال میں چھوڑ دو (یعنی اس پر ظلم و زیادتی نہ کرو)“

شاہ ولی اللہ کا بیان ہے کہ جب تک ان کے والد زندہ رہے فرخ سیر پر آنچ نہ آنے پائی۔ لیکن جونہی ان کا انتقال ہوا۔ کل

﴿بعد پنجہ روز از وفات حضرت ایشاں اسیر شد﴾

”پچاس دن آپ کی وفات کے بعد فرخ سیر قید ہو گیا“

اور جیسا کہ میں نے عرض کیا اور تاریخوں میں اس کی تفصیل لکھی ہوئی ہے کہ فرخ سیر کا ان بھائیوں کے ہاتھ سے قتل ہونا تھا کہ ملک میں ایک ایسا زلزلہ برپا ہوا کہ پھر نہ تھا۔ شاہ ولی اللہ اپنی چشم دید شہادت یہ درج فرماتے ہیں:-

﴿ہرج و مرج عظیم دست داد﴾

”سخت کشت و خون کی گرم بازاری ہوئی“

خصوصاً تورانی امراء اپنے ہم مذہب بادشاہ کے اس دردناک مظلومانہ قتل سے سخت برہم ہوئے۔ جیسا کہ میں نے لکھا تھا۔ حضرت آصف جاہ رحمۃ اللہ علیہ نے ترک دنیا کر کے اسی ”جنون ترک مصیبا“ کو اختیار فرمالیا تھا۔ جو شاہ ولی اللہ کا مسلک تھا۔ لیکن اس واقعہ نے ان کی رگ حمیت میں جوش پیدا کر دیا اور لباس فقیری اُتار میدان میں اُتر آئے سادات بارہ نے بڑی کوشش کی کہ کسی طرح ان کو رام کر لیا جائے لیکن دلی چھوڑ کر وہ مالوہ اور دکن کے جنگلوں میں جوش انتقام میں بھرے ہوئے شیر زیاں کی طرح ڈکارتے پھرتے تھے۔ مظلوم بادشاہ کی تڑپتی ہوئی لاش ان کو چین لینے نہیں دیتی تھی۔ مشہور ہے کہ حسین علی خاں نے ایک خط بڑی منت سماجت کا ان کو مالوہ لکھا۔ جواب میں صرف یہ شعر لکھ کر حضرت آصف جاہ نے بھیج دیا

من بے وفا نیم بو فامی خورم قسم

من چو شام نیم بشما می خورم قسم

﴿رفیع الدرجات اور رفیع الدولہ کی تخت نشینی اور چند ہی روز میں ان

کے انتقال کے بعد محمد شاہ کا دور دورہ﴾

بہر حال فرخ سیر کو ختم کر کے ان بھائیوں نے پہلے رفیع الدرجات پھر رفیع الدولہ کو دلی کے تخت پر اپنے نوکر ہونے کی حیثیت سے تخت نشین کیا۔ چونکہ دونوں مدقوق تھے۔ تین چار

مہینے کے اندر اندر دونوں کا خاتمہ ہو گیا۔ تب سید برادران نے محمد شاہ بادشاہ کو اپنا نوکر بنا کر مغل تخت پر بٹھایا اور اسی کو حسین علی خاں اپنے ساتھ لے کر تورانیوں کے سردار آصف جاہ کو ختم کرنے کے لئے ایک فوج لے کر دکن کی طرف روانہ ہوا۔ جہاں آصف جاہ کو ختم کرنے کے لئے ایک فوج لے کر دکن کی طرف روانہ ہوا۔ جہاں آصف جاہ نے قبضہ جمالیا تھا مگر چند ہی منزل دلی سے آگے بڑھے تھے کہ آخر جس شاہین بلند آشیانہ کے شکار کے لئے نکلے تھے اس کی دعا ہائے نیم شبی کہیئے یا دعا کے ساتھ اس کی دوا کے بھی شکار ہو گئے۔ حضرت آصف جاہ کے چچا زاد بھائی محمد امین خاں کے اشارہ سے میر حیدر کاشغری نے حسین علی خاں کا کام تمام کر دیا۔ سفر میں جب حسین علی خاں کی بارگاہ لوٹی گئی تو طباطبائی کا بیان ہے کہ اس وقت خزانہ میں ایک کروڑ روپیہ تھا۔ اس بازو کا ٹوٹنا تھا کہ دوسرا بازو بھی ایرانیوں کا بظاہر ٹوٹ گیا۔ یعنی دوسرے بھائی حسن علی خاں الملقب بہ قطب الملک نے محمد شاہ کے ہاتھ گرفتار ہو کر قید خانہ میں آخری سانسیں پوری کیں۔ تورانی امیروں کی مغل دربار میں یہ بڑی کامیابی تھی۔ محمد شاہ جو شاہی کرنے کے لئے نوکر تھا اب اس کی جان میں جان آئی۔ کچھ دن تو محمد شاہ واقعی حضرت آصف جاہ کو وزیر اعظم بنا کر محمد شاہ بنے رہے لیکن یاروں نے اس غریب کو بجائے تورانیوں کے پھر ایرانیوں کے زیر اثر ڈال دیا۔ بادشاہ نے مذہب کو نہیں بدلا لیکن مشرب بدل دیا۔ ابرسیاہ ان کا نقیب قرار پایا۔ عام حکم تھا کہ ادھر ہمالیہ کے دامن سے گھٹا اٹھے، بادل گرے کہ میرا خیمہ، خرگاہ صحرا روانہ ہو۔ ہر طرف

اصبوح اصبوح یا اصحاب

ی دیدن کلمہ بستہ سحاب

المدام المدام یا احباب

ژالہ بارید بر رخ لالہ!

کا شور تھا۔ اسی لئے بیچارہ آخر میں رنگیلے کے نام سے بدنام ہو گیا۔ آصف جاہ دربار کے اس رنگ کو دیکھ کر پھر دکن کی پہاڑیوں اور جنگلیوں کی طرف روانہ ہو گئے۔

۱۔ کہا جاتا ہے کہ ڈاڑھی رکھنے والے اس تورانی امیر پر ضیغ القدر ایرانی اسرافت پرے چست کرتے تھے۔ قلعہ میں جب داخل ہوتے تو بڑا بندر کا مشہور لطیفہ اس نیکدل وقادار بزرگ کی شان میں استعمال کیا جاتا۔ سنا گیا ہے کہ جھلا کر ایک دن حضرت آصف جاہ نے فرمایا کہ مجھے جو کچھ کہنا چاہتے ہو کہہ لو لیکن میری آنکھیں اس دن کو دیکھ رہی ہیں جب لال قلعہ کی دیواروں پر بندرا چھلتے پھریں گے اور یہی فرمانے کے بعد دربار سے علیحدگی کا انہوں نے مصمم ارادہ فرمایا۔

حریف بظاہر بادشاہ سے ملے ہوئے تھے۔ لیکن ایرانیوں کو جو زخم تورانیوں سے پہنچا تھا۔ اس کی آگ اندر اندر بھڑکتی رہتی تھی۔ آخر وہ آگ بھڑکی اور ملے کر لیا گیا کہ اب اس تورانی امیر اور اس کے ساتھیوں ہم نواؤں کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ کر دیا جائے۔ تاریخ میں واقعات کو بکھیر کر بیان کیا گیا ہے۔ لیکن تاثر نے والے تاثر جاتے ہیں کہ اندرونی کارروائی کیا ہوئی۔ محمد شاہ کا عہد! بذات خود وہ کچھ بھی تھا۔ لیکن اگر شاہ عبدالعزیز کی یہ روایت صحیح ہے اور صحیح نہ ہونے کی وجہ ہی کیا ہو سکتی ہے کہ ان کی چشم دید گواہی کے قریب قریب ہے:-

”در عہد محمد شاہ بادشاہ بست و دو بزرگ صاحب ارشاد از ہر خانوادہ در دہلی بودند و اس چنیں اتفاق کم می شود“ (ملفوظات عزیز پم ۱۰۶)

”محمد شاہ کے زمانہ میں بائیس بزرگ صاحب ارشاد سلسلہ اور طریقہ کے دلی میں تھے۔ ایسا اتفاق کم ہوتا ہے“

ظاہر ہے کہ محض رسمی یا خاندانی پیرزادوں کے متعلقہ یہ بیان نہیں بلکہ بادشاہ صاحب کے خیال میں بھی جو واقعی ارشاد و ہدایت کے سزاوار تھے۔ ان کی محض دلی میں اتنی تعداد تھی۔ یقیناً اس قسم کا اتفاق کم ہوا کرتا ہے اور اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بائیس ہمہ رندی و خراباتی محمد شاہ میں ایک دوسری لٹک بھی ضرور تھی۔ کہ بہر حال حکومت کی قدردانیوں اور جو ہر شناسیوں سے اس قسم کے اجتماعات کو بہت کچھ تعلق ہے۔

خصوصاً حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ تو اسی رنگیلے نے وہ رنگین سلوک کیا ہے کہ اگر مسلمان اس غریب کو محض اس کی اسی خدمت کی بنیاد پر بخش دیں تو وہ اس کا مستحق قرار پاسکتا ہے۔ اس سے میرا یہ مطلب ہے کہ حضرت شاہ ولی اللہ جن مقاصد اور خیالات کو لے کر حجاز تشریف لے گئے اور حرمین کے جن ”فیوض“ سے مالا مال ہو کر وہ پھر ہندوستان واپس ہوئے اور کچھ ملے کر کچھ واپس ہوئے جیسا کہ ان کے اس و داعی بیان سے معلوم ہوتا ہے جو رخصت ہوتے ہوئے مدینہ منورہ میں اپنے استاد جدیث سے آپ نے ارشاد فرمایا تھا:-

”ہر چہ خواندہ بودم فراموش کردم الا علم دین (یعنی حدیث)“

(ملفوظات عزیز پم ۹۳)

”جو کچھ میں نے پڑھا تھا سب کچھ بھلا دیا۔ بجز علم دین یعنی حدیث کے“

اور اسی بنیاد پر جیسا کہ سب جانتے ہیں، حضرت شاہ صاحب ہی کی بدولت آج ہندوستان میں ”علم حدیث“ کا بحمد اللہ عینارہ اتنا بلند ہے کہ بلا مبالغہ اب اسلامی ممالک میں کوئی ملک اس حیثیت سے اس کی ہمسری نہیں کر سکتا۔ کسی معمولی آدمی کی نہیں بلکہ الازہر کے ہم وطن مشہور ناقد و بصیر عالم رشید رضا مرحوم مصری کی شہادت ہے اور ان کو مجبوراً واقعات کی بناء پر یہ اعترافات کرنا پڑا ہے کہ:-

﴿ولولا عناية اخواننا علماء الهند بعلوم الحديث في هذا

العصر تعضى عليها بالزوال﴾ (مقدمہ منہاج کنز الدین ص ۲)

”اگر ہمارے بھائی ہندوستان کے علماء کی توجہ اس زمانہ میں علوم حدیث کی طرف مبذول نہ ہوتی تو اس علم کے زوال اور فنا کا فیصلہ ہو چکا ہوتا“

اور ظاہر ہے کہ یہ ساری برتری براہ راست بلا شرکت غیرے حضرت ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کی رہنمائی میں ہے۔ آج ہندوستان میں جس طبقہ میں بھی جو کچھ حدیث کا چرچا پایا جاتا ہے ”ہمہ آوردہ اوست“ شاہ عبدالعزیز صاحب اسی بنیاد پر کبھی کبھی فرماتے:-

﴿علم حدیث پدر من از مدینہ آورد چارده ماه در حرین بورہ سند حاصل کردہ﴾ (ملفوظات ص ۹۳)

”میرے والد ہی مدینہ منورہ سے علم حدیث لائے چودہ ماہ حرین شریفین میں رہ کر آپ نے سند حاصل فرمائی تھی“

لیکن دنیا کو شاید یہ معلوم نہیں کہ شاہ صاحب نے مدینہ سے واپسی کے بعد جب درس حدیث کا افتتاح فرمایا تو اس وقت پرانی دہلی میں جہاں اب ان بزرگواروں کے مزارات ہیں۔ وہاں اپنے والد کے پرانے مکان میں پڑھانے کی جو مختصر سی جگہ تھی۔ اسی سے کام شروع کر دیا۔ لیکن چند ہی دنوں میں اطراف و اکناف سے طلبہ کھینچ کھینچ کر جب پہنچنے لگے تو ظاہر ہے کہ شاہ عبدالرحیم کی درسگاہ، مسند الوقت کے دارالعلوم بننے کا کام کیسے انجام دے سکتی تھی۔ اور یہ سعادت محمد شاہ بدنام کے نام قدرت نے لکھی تھی کہ اُس نے:-

﴿محمد شاہ نے شاہ ولی اللہ کے درس حدیث کیلئے عالی شان مکان دیا!﴾

”مولانا کو بلا کر شہر میں ایک عالیشان مکان دے کر آپ کو اندرون شہر رکھا قدیم جگہ غیر آباد ہو گئی۔“ (دارالحکومت دہلی ج ۲ ص ۲۸۶ مؤلفہ مولوی بشیر صاحب)

دلی کے پُرانے کھنڈروں کا یہ سب سے بڑا ماہر دوسری جگہ اسی محمد شاہی عطیہ کا ذکر ان لفظوں میں کرتا ہے:-

”یہ مدرسہ کسی زمانہ میں نہایت عالی شان اور خوبصورت تھا۔ اور بڑا دارالعلوم سمجھا جاتا تھا“

دارالعلوم کی پختگی اور استحکام کا اندازہ تو اسی سے ہو سکتا ہے کہ غدر تک وہ اپنی اصلی حالت پر قائم تھا۔ اگر اس کے ساتھ یہ واقعہ پیش نہ آتا کہ:-

﴿ولی اللہی دارالعلوم کی عمارت غدر میں برباد ہوئی﴾

”غدر میں مکانات لوٹ لئے گئے کڑی، تختے تک لوگ اٹھالے گئے“ تو آج بھی وہ شاید باقی رہتا۔ اس کی وسعت اور کشادگی، کاش! مکان موجود ہوتا تو صحیح رائے قائم ہو سکتی تھی۔ لیکن مولوی بشیر الدین صاحب کتاب مذکور کا یہ بیان کہ:-

”اب متفرق لوگوں کے مکانات اس جگہ بن گئے ہیں۔ مگر محلہ شاہ عبدالعزیز صاحب کے مدرسہ کے نام سے آج بھی پکارا جاتا ہے“

جس سے معلوم ہوتا ہے کہ کوئی بڑی جگہ تھی اسی لئے متفرق لوگوں کے مکانات اس میں بن سکے بلکہ جو محلہ ”مدرسہ شاہ عبدالعزیز“ کے نام سے مشہور ہے اگر اس کی کل آبادی اسی مدرسہ کی زمین پر قائم ہوئی ہے تو اس کے یہ معنی ہیں کہ وہ مکان بجائے خود ایک محلہ کی گنجائش اپنے اندر رکھتا تھا اور یوں بھی تو سمجھنا چاہئے کہ جس مکان میں شاہ ولی اللہ اور ان کے بعد شاہ عبدالعزیز اور آخر میں شاہ اسحاق تک کے مشہور عظیم ترین حلقہ کے طلبہ بھی اسی میں پڑھتے رہے۔ خیال کیا جاتا ہے کہ محمد شاہ کا دیا ہوا یہ مکان، مکان نہیں بلکہ غالباً کوئی بڑی ڈیوڑھی یا حویلی ہوگی۔ جس میں اتنی گنجائش پیدا ہو سکی۔

مغلی عہد کی حویلیوں اور ڈیوڑھیوں کا اندازہ موجودہ زمانے کے ہندوستانیوں کو نہیں ہو سکتا۔ تھوڑے بہت اس کے نشانات اب بھی حیدرآباد میں پائے جاتے ہیں کہ ایک ایک امیر کی بعض ڈیوڑھیاں اس وقت بھی بچھ اللہ شاید ایک ایک مربع میل سے کم زمین میں نہ ہوں گی۔ بہر حال مولوی بشیر الدین صاحب کتاب مذکور ہی نے لکھا ہے کہ:-

”شاہ ولی اللہ کے بعد ان کے چاروں صاحبزادوں نے وہی مشغلہ (درس و تدریس) کا جاری رکھا اور اس مدرسہ نے تعلیم و بینات میں وہ نام پایا کہ ہندوستان میں شہرہ ہو گیا جب شاہ صاحب کے صاحبزادوں میں کوئی نہ رہا تو مولانا محمد اسحاق (مہاجر کی) نے مدرسہ کی خدمت اپنے ذمہ لی“

جو لوگ حضرت شاہ عبدالعزیز اور بالخصوص شاہ اسحاق صاحب کے حلقہ درس کی وسعت سے واقف ہیں اور جانتے ہیں کہ ایک زمانہ ہندوستان پر وہ بھی گزرا ہے کہ جس طرح آج ہر صوبہ اور تقریباً ہر صوبہ کے ہر ضلع اور ہر ضلع کے ہر تعلقہ (سب ڈویژن) میں دیوبند کا کوئی نہ کوئی طالب علم ضرور پایا جاتا ہے۔ ٹھیک اسی طرح حضرت شاہ اسحاق صاحب کی درس گاہ کی بھی اپنے زمانہ میں یہی نوعیت تھی۔ وہ سمجھ سکتے ہیں کہ اس مدرسہ کی وسعت کیا ہوگی۔ اس کا پتہ تو نہ چلا کہ اس مدرسہ میں طلبہ کے قیام کا بھی بندوبست تھا یا نہیں۔ ظاہر تو یہی ہے کہ اس زمانہ میں جب مسلمانوں نے ہر طالب علم کے لئے قیام و طعام (لاجنگ بورڈنگ) کے مسئلہ کو فری (اور مفت) کر رکھا تھا تو اسی دستور کے مطابق طلبہ مساجد اور ان مقامات میں رہتے ہوں گے۔ جس کا نام اس زمانہ میں جاگیر تھا، تاہم شاہ عبدالعزیز صاحب کے ملفوظات میں ایک جگہ اپنے اسی مدرسہ کی مسجد کا حال بیان فرماتے ہوئے جو یہ فقرہ پایا جاتا ہے کہ:-

”دریں ہنگام بزرگانِ بسیار و اولیاء بسیار از یاران والد ماجد معتكف مسجد بودند“ (ص ۱۰۹)

”اس زمانہ میں بہت سے بزرگ اور بہت سے اولیاء اللہ والد ماجد کے دوستوں میں سے مسجد میں معتكف تھے“

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس مدرسہ کی خانقاہی حیثیت بھی تھی۔ رمضان کے مہینہ

میں بھی جو عموماً عربی تعلیم کی عطلت کا زمانہ ہے ”بزرگان بسیار و اولیاء بسیار“ اس مدرسہ کی مسجد میں معتکف ہوتے تھے تو عام داروین و صادرین کا اسی سے اندازہ ہو سکتا ہے۔

چونکہ محمد شاہ کی ایک اسلامی خدمت کا اظہار مقصود تھا اس لئے قصداً میں نے ذرا طول بیانی سے کام لیا۔ اور اس سے گو نہ شاہ صاحب کے مدرسہ کی حالت پر بھی روشنی پڑ گئی۔ نیز اسی مدرسہ کے کچھ حالات آخر مضمون میں بھی انشاء اللہ آئیں گے۔ اسی سلسلہ میں، میں یہ بھی کہنا چاہتا ہوں کہ جب خود محمد شاہ نے حضرت شاہ صاحب کو بلوا کر یہ مدرسہ حوالہ کیا تھا تو عقل کا تقاضا ہے کہ حکومت نے ان طلبہ کے لئے بھی ضروری وظائف منظور کئے ہوں گے جو اس مدرسہ میں دُور دُور سے آتے تھے۔ کیونکہ بادشاہ تو بادشاہ عام امراء کے خزانوں سے بہ مدد وظائف طلبہ میں کافی رقموں کے دینے کا عام دستور تھا۔

﴿حافظ رحمت خاں والی بریلی کا نجیب الدولہ کی خدمتِ علم دین﴾

حافظ الملک رحمت خاں والی بریلی کے متعلق ان کی سوانح عمری میں لکھا ہے کہ ماہوار سینکڑوں طالب علموں کو ان کی سرکار سے امداد ملتی تھی۔ نجیب الدولہ کی علم دوستی کا حال تو خود شاہ عبدالعزیز صاحب نے یہ بیان کیا ہے کہ

﴿نزد نجیب الدولہ نہ صد عالم بود ادنیٰ پنج روپیہ و اعلیٰ پانصد روپیہ﴾ (ص ۸۱)
”نجیب الدولہ کے پاس نو سو عالم رہتے تھے جن میں ادنیٰ درجہ کے علماء کو پانچ روپیہ اور اعلیٰ کو پانچ سو روپیہ ملتے تھے“

میرا اندازہ ہے کہ یہ پانچ اور پانچ سو روپیہ ماہوار نہیں بلکہ ”یومیہ“ تھا حیدر آباد دکن میں بحمد اللہ ان کی نشانیاں اب تک باقی ہیں اور جس زمانہ میں مسلمانوں کی دولت کا یہ حال تھا کہ زیادہ دن پہلے نہیں۔ بلکہ انگریزوں کے تسلط سے کچھ ہی پہلے دلی کا حال بیان کرتے ہوئے شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:-

﴿کہ بخانہ قمر الدین خاں عورات غسل اخیر از گلاب می کردند بخانہ دیگر نواب
سہ صد روپیہ کل و پان برائے عورات می رفت﴾

”قمر الدین خاں کے گھر میں عورتیں آخری غسل گلاب سے کرتی تھیں اور ایک دوسرے نواب کے ہاں تین سو روپیہ روز کا صرف پھول پان عورتوں میں جاتا تھا“

اور وہی ”سید برادران“ جن کا حال ابھی گزرا ان میں ان کے بڑے بھائی حسین علی خاں جب اورنگ آباد کن کے صوبہ دار تھے تو میر غلام علی آزاد بلگرامی کا بیان ہے:-
 ﴿مردم اورنگ آباد بالاتفاق بیان می کنند در عہد امیر الامراء اکثر مردم در خانہ خود طعام نمی بخشد طبایع خاں سرکار امیر الامراء حصہ خودی فروختند و قاب پلاؤ مکلف بچندل پل می داند﴾ (۱)

”اورنگ آباد کے لوگ بالاتفاق بیان کرتے ہیں کہ امیر الامراء (حسین علی خاں) کے زمانہ میں اکثروں کے یہاں کھانا نہیں پکاتا تھا۔ بلکہ امیر الامراء کی سرکار کے باورچی اپنے حصہ کا کھانا بیچ دیتے تھے پلاؤ کا ایک مکلف قاب چند پیسوں میں دیتے تھے“

خیر بات بہت طویل ہوئی جاتی ہے لیکن ”فائققص القصص“ بھی چونکہ عبادت ہے اور اس سے بھی زیادہ ”لعلہم یتفکرون“ (پہلوں کے حالات سن کر شاید پچھلوں میں چونک پیدا ہو) اس لئے اس معترضہ جملہ کے بیان کرنے میں مضائقہ محسوس نہ ہوا۔ اب اصل مدعا کی طرف آتا ہوں۔ تو قصہ یہ ہو رہا تھا کہ حجاز سے سید حدیث لے کر جب شاہ صاحب دہلی واپس ہوئے اور طلبہ کے عام رجحان کو دیکھ کر محمد شاہ نے آپ کو یہ حویلی کہیئے یا اس زمانے کی زبان میں دارالعلوم (کالج) قرار دیجئے حوالہ کیا تو شاہ صاحب اپنے منصوبوں کو دل میں لے کر اسکے مطابق سرگرم عمل ہوئے ہی تھے کہ اچانک ہندوستان خصوصاً دہلی پر نادر شاہ درانی کی مشہور مصیبت کا آسمان ٹوٹ پڑا۔

﴿حجاز سے واپسی پر شاہ صاحب کے اصل کام کا آغاز اور دہلی پر﴾

شاہ صاحب ۱۱۴۶ھ میں حجاز سے دہلی پہنچے تھے اور ۱۱۵۰ھ میں نادر گردی کی دہلی شکار

ہوئی۔

﴿خونی نادر کی یلغار اور اس کے اسباب و اثرات﴾

مورخین کا اس حملہ کے اسباب میں اختلاف ہے۔ میاں بشیر مرحوم نے تو آصف جاہ مرحوم کو نادر کا داعی قرار دیا ہے لیکن سچ یہ ہے اور واقعات اس کے مؤید ہیں کہ ایرانیوں کی قوت کو سادات کی تباہی سے جو کمزوری ہوئی تھی اسی کی تلافی کے لئے غریب تورانیوں پر نادر شاہ اکسا کر بلایا گیا تھا۔ اور بالفرض یہ سب نہ بھی ہو۔ جب بھی واقعہ یہ ضرور پیش آیا کہ ہمایوں نے ایرانی جراثیم کے لئے جو سوراخ پیدا کر دیا تھا۔ نادر گردی نے اس سوراخ کو وسیع سے وسیع تر کر دیا۔ یعنی اب تک ہندوستانی حکومت اپنے جذبہ منت شناسی کا اعتراف ایرانیوں کو مناصف و خدمات دے کر رہی تھی۔ لیکن نادر شاہی اور قزلباشی افواج کے عسکری اور سیاسی تفوق نے ہندوستانی دماغوں میں مرعوبیت کی اسی کیفیت کو پیدا کر دیا جس کا مشاہدہ آج مغربی حکومت کی مرعوبیت اور اس کے نتائج کی شکل میں ہم کر رہے ہیں۔

﴿سیاسی شکست کا لازمہ دماغی غلامی﴾

ہمارا ظاہر و باطن و اندر باہر صرف محکومیت اور تعبد کی تجلی گاہ بنا ہوا ہے مبالغہ نہیں بلکہ واقعہ ہے کہ ہمارا بال بال یورپ کی غلامی کے سحر سے مسحور ہے۔ سروں کے بال اور مونچھ ڈاڑھی کی تراش و خراش میں بھی ہماری آنکھیں اپنے مغربی آقاؤں کے چہروں کو تاکتی رہتی ہیں۔ اب ہم خود کچھ نہیں دیکھتے بلکہ جو یورپ دکھاتا ہے وہی دیکھتے ہیں۔ جو وہ سمجھاتا ہے وہی سمجھتے ہیں۔ جو وہ کھلاتا ہے وہی کھاتے ہیں جو کچھ وہ پلاتا ہے وہی پیتے ہیں۔ انتہا یہ ہے کہ ہم میں کتنے ہیں جو استنجا اور قضاء حاجات کی شکلوں میں بھی آج یورپ کی راہنمائی کا اپنے کو دست نگر بنائے ہوئے ہیں۔ یہ کوئی تاریخی واقعہ نہیں ہے بلکہ وہ تماشا ہے جو حکومت کی سحر طرازیوں ہمیں اس

عام تاریخ کی کتابوں میں لکھا ہوا ہے کہ آصف شاہ بہادر، نادر سے دوسرے دن مقابلے کی تیاریاں کر رہے تھے۔ بادشاہ محمد شاہ کو آپ نے یہی مشورہ دیا تھا۔ لیکن برہان الملک یعنی شاہان اودھ کے مورث نے ان کے منشاء کے خلاف تنہا لڑائی چھیڑ دی اور خود اپنے کو نادر کے ہاتھ گرفتار کرا کے نادر کو دئی لے گیا اور کرڈہا کر ڈر روپیہ تخت طاؤس کے ساتھ جو گیا سو گیا۔ لاکھوں انسانوں کا خون بھی بہا۔

وقت ملک کے ہر صوبہ اور ہر علاقہ بلکہ دور دست ریاستوں تک میں دکھلا رہی ہیں۔

﴿نادر کی حملہ سے ہندوستانی مسلمانوں کی مرعوبیت کا حال شاہ ولی اللہ کی زبانی﴾
 نادر سے ہندوستانیوں نے شکست کھائی تھی اور ایسی شکست کھائی تھی کہ جس کی نظیر کم از کم ہندی مسلمانوں کی آنکھوں نے اس سے پہلے نہیں دیکھی تھی۔ حضرت شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ سے جامع ملفوظات نے ایک موقع پر یہ نقل کیا ہے کہ شاہ صاحب نے ایک دن
 ﴿تذکرہ قتل نادر شاہی وعزم جو ہر شدن شرقا کہنہ وجواب والد ماجد وقصہ امام علیہ السلام﴾

”نادر شاہی قتل اور پرانی دلی کے شریفوں کے اس ارادہ کا ذکر فرمایا کہ وہ ”جوہر“ کا قطعی طور پر ارادہ کر چکے تھے۔ پھر والد نے جو جواب ان کو دیا اور امام علیہ السلام کے قصہ کو بیان فرمایا“

اس ”جوہر“ کی رسم سے شاید عام لوگ واقف نہ ہوں لیکن جاننے والے جانتے ہیں کہ یہ ہندوستان کی ایک قدیم رسم تھی۔ جب دشمن کا غلبہ اور تسلط اس حد کو پہنچ جاتا تھا کہ نجات و خلاصی کی راہ مسدود ہو جاتی تھی تو پاس ناموس و عزت کے لئے آگ کا لاؤ جوڑ کر عورتیں، مرد، بچے سب اس میں کود جاتے تھے۔

شاہ صاحب کی اس شہادت سے ثابت ہوتا ہے کہ ”نادر گردی“ کی دہشت اس حد تک پہنچ چکی تھی کہ پرانی دلی کے شرقا آگ میں پھاندنے کی تیاریاں کر چکے تھے۔ لیکن جیسا کہ آگے کے بیان سے معلوم ہوتا ہے۔ اس موقع پر شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے جب مسلمانوں کو واقعہ کر بلا اور حسین علیہ السلام کے مصائب یاد دلانے اور بتایا کہ وہاں بھی تو مال و جان کے ساتھ ساتھ اہل بیت کی عزت و ناموس خطرہ کی آخری شکل میں گھر چکی تھی لیکن حضرت امام نے ”جوہر“ کا فیصلہ نہیں فرمایا۔ بلکہ صبر و رضا کی راہ اختیار کی تو اس ارادہ سے لوگ باز آئے۔

بہر حال اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ دلی اور دلی کے ساتھ ہندوستانیوں کی ایرانیوں

سے مرعوبیت کا کیا حال ہوا ہوگا یہ خیال کرنا چاہئے کہ اس ”مرعوبیت“ نے ہندوستانیوں کے اندر صرف ایرانی اعتقادات اور دینی مسلک کے میلان کے راستہ کو صاف کیا بلکہ جیسا کہ میں نے عرض کیا ”محکومیت“ ہر قسم کے انفعالات و تاثرات کو اپنے ساتھ لاتی ہے۔ ہمایوں کے بعد ہندوستانی مسلمان یوں بھی ایرانی شاعری، ایرانی مفکرین اور ایرانی ارباب علم و دانش سے بہت کچھ متاثر ہو چکے تھے۔ مغل دربار زیادہ تر ایرانی شعراء حکماء اور فلاسفہ سے معمور تھا۔ جس کی تفصیل عام تذکروں اور تاریخ کی کتابوں میں پڑھی جاسکتی ہے ورنہ مغل حکومت سے پہلے اگر ”ولایت“ یعنی ”بیرون ہند“ سے ہر قسم کے لوگوں کا اس ملک میں تانتا بندھا ہوا تھا۔ اور ان میں اکثر تھوڑی کدو کاوش کے بعد اپنی اپنی صلاحیتوں کی بنیاد پر کسی نہ کسی عہدہ اور مرتبہ تک پہنچ ہی جاتے تھے۔ لیکن اس میں ان ”ولایتی ممالک“ میں سے کسی خاص ملک کی تخصیص نہ تھی۔ ترکستان، خراسان، ایران، عرب بلکہ روم وغیرہ تک کے لوگ آتے رہتے تھے اور اگر کچھ غلبہ حاصل تھا تو خراسانی اور تورانی ممالک کے اہل علم و فضل کو تھا اور چونکہ ان علاقوں میں زیادہ تر تصوف فقہ و اصول فقہ کا چرچا تھا۔ اسی لئے مغل عہد سے پہلے ہندوستان میں ان ہی علوم کا زیادہ چرچا پھیلا ہوا تھا۔ فلسفہ منطق کی طرف لوگوں کا کم میلان تھا۔ لیکن ہمایوں کے بعد ہم بتدریج ہندوستان کے علمی مذاق میں ایک جدید تغیر محسوس کرتے ہیں یعنی آہستہ آہستہ فلسفہ اور منطق کو اہمیت حاصل ہوتی جاتی ہے اور اس کے بعد ان دونوں ”علموں“ کے ساتھ ہمارا ملک جس شدت سے چٹ گیا اس کا حال کس کو معلوم نہیں۔

﴿ہندوستان کے علماء پر منطق و فلسفہ کے تسلط کی تاریخ﴾

اس تغیر کی تاریخ یہ ہے کہ جہانگیر اور شاہجہاں کے عہد میں ایران میں خاص دل و دماغ کے کچھ لوگ پیدا ہو گئے تھے جن میں عجیب و غریب شخصیت میر باقر داماد نامی ایک ملا کی تھی۔

﴿میر باقر داماد کا کچھ تعارف﴾

یہ اتر آباد کار رہنے والا تھا۔ مشہد میں تعلیم حاصل کی تھی اور اصفہان میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ شاہ عباس صفوی اس کا بڑا قدر دان تھا اور اسی کی قدر دانیوں نے اس کو شہرت و عزت

کے اس مقام پر پہنچایا تھا۔ لیکن یہ صحیح نہیں ہے جو ہمارے مدرسوں میں مشہور ہے کہ ”باقرداماد“ بادشاہ کا داماد تھا۔ اسی لئے داماد کے لقب سے مشہور ہوا۔ بلکہ داماد دراصل ان کے والد کا لقب تھا جن کا نام سید محمد تھا۔ سید محمد کی شادی اس زمانے کے ایک بڑے فقیہ شیخ علی بن عبدالعالی کی لڑکی سے ہو گئی تھی۔ اسی لئے لوگ سید محمد کو سید محمد داماد کہنے لگے۔ سید محمد کے بعد یہی لقب دامادی کا اُن کے بیٹے میر باقر کو وراثت میں ملا۔ بہر حال باقر داماد جیسا کہ میں نے عرض کیا ایک خاص قسم کا آدمی تھا۔ جہاں تک میرا خیال ہے اس کو فلسفہ سے زیادہ ادب میں مہارت حاصل تھی۔ وہ فطرتاً شاعر تھا اور اگرچہ عام طور پر لوگوں کو معلوم نہیں۔ لیکن فارسی زبان میں وہ شاعری بھی کرتا تھا۔ اشراقی تخلص تھا مگر بیچارے کے لئے دشواری یہ ہو گئی تھی کہ پیدا ہو گئے تھے ملا گھرانے میں جس کے لئے شعر و شاعری کے مشاغل کسی طرح مناسب نہ تھے آخر ان کی فطرت نے ایک دوسری راہ بتائی۔ دینیات اور مذہبیات سے تو اس شخص کو کبھی دلچسپی نہ ہوئی۔ اگرچہ برائے نام بعض مختصر رسالے دینی موضوع پر بھی لکھے ہیں۔ لیکن اپنے دماغ کو فلسفہ الہیات کی طرف پھیر دیا اور اسی زمانہ کی ایرانی ادبیات میں الہیات کا جو سرمایہ تھا۔ خصوصاً متاخرین کے لفظی جھگڑوں نے بات کا بٹنگلڑ بنا کر ادہام کی جو بھول بھلیاں تیار کر دی تھیں۔ میر باقر نے ان ہی چیزوں کو لے کر ایک خاص قسم کے ادیبانہ رنگ میں جس میں لغت کے نامانوس غریب الفاظ، عربی زبان کے ایسے مصادر جن کا عام بول چال میں کم استعمال ہوتا ہے مثلاً باب انشیشاں، الجواذ، احرنجام، تشرار وغیرہ کے وزن پر زبردستی الفاظ کو تراش تراش کر لانا، نون تاکید اور باب تفصیل کی تشدید سے کلام میں زور پیدا کرنا، ایسی چیزوں کی جمع بنانا جن کی طرف بآسانی ذہن منتقل نہ ہو سکے مثلاً عام طور سے منطقی اور کلامی طبقوں میں ”لانسلم“ (ہم یہ نہیں مانتے) یا لم لایکون کذا (آخر ایسا کیوں نہیں ہو سکتا) وغیرہ الفاظ کا استعمال بکثرت کیا جاتا ہے۔ خصوصاً ار باب جدل و مناظرہ کی ربانوں پر تو گویا یہ الفاظ بطور سخن تکیہ کے چڑھے رہتے ہیں۔ میر باقر نے ان لوگوں کا نام ہی ”لانسلمیون“ اور ”لم لایکربنون“ رکھ دیا۔ ظاہر ہے کہ اس جمع کو دیکھ کر بآسانی کسن کا دماغ ان کے مفردات کی منتقل ہو سکتا ہے۔ بہر حال اس زمانہ کے مروج و حواشی خصوصاً دوانی اور صدر معاصر نے شرح تجرید کے حاشیوں میں قدیم، جدیدہ، اجد و غیرہ کے ناموں سے بے معن مباحث کا جو طوفان

پیدا کیا تھا اور اس پر مرزا جان اخوند یوسف، آقا حسین خونساری وغیرہ نے جو ”کوہ کندن کاہ برادر دن“ کی خدمتیں انجام دی تھیں۔ میر باقر نے ان ہی سب کو سامنے رکھ کر اپنے جدید انشاء اور ادب کا ان کو تختہ مشق بنایا۔ گویا ایک قسم کی منطقی اور الہی ادب کی اس نے ایجاد کی۔ اسی کے ساتھ میر داماد نے اپنی کتابیں جن میں تقریباً ایک ہی قسم کے مضامین ہیں ان کے نام بھی عجیب و غریب قسم کے رکھے۔ جن کے سننے کے ساتھ ہی آدمی پر ایک رعب سا چھا جاتا ہے مثلاً الافق البین، الصراط المستقیم، ایمانات، تقدیسات، قلبیات ازیں وقیل اور بھی چند کتابیں ہیں۔

غرض میرے نزدیک تو میر باقر پر بجائے فلسفہ اور منطق کے فی الحقیقت ادب و شعر ہی غالب تھا۔ اس کا اندازہ علاوہ ان تدبیروں کے اس سے بھی ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں نظامی گنجوی کی پانچ نظم کی کتابوں کا شمار فارسی شاعری کے جواہر پاروں میں تھا اور ”جواہر خمسہ نظامی“ کے نام سے یہ مجموعہ عام طور پر مشہور ہے۔ میر باقر نے بھی اپنی پانچ کتابوں کو ”جواہر خمسہ“ کے نام سے ملقب کیا۔

﴿میر باقر کے ایک شاگرد صدر شیرازی﴾

میر باقر کے بعد ان کے شاگردوں میں ایک اور صاحب قلم (بلکہ ”صاحب قلم“ سے زیادہ ”صاحب سیاہی و روشنائی“ کا خطاب ان کو دیا جائے تو زیادہ موزوں ہوگا) پیدا ہوئے یعنی ملا صدر الدین شیرازی جن کی کتاب شرح ہدایت الحکمتہ صدر کے نام سے مدرسوں میں آج بھی مشہور ہے۔ یہ شخص بلا کا لکھنے والا تھا۔ ہزار ہا صفحات کی بیسیوں کتابیں مثلاً تعلیقات شفا یا حواشی شرح حکمت الاشراق ”شواہد ربوبیت“ وغیرہ کے علاوہ ایک بسیط کتاب اسی لفظی فلسفہ کے متعلق چار ضخیم جلدوں میں اس شخص نے تیار کی۔ جس کا نام ”اسفار اربعہ“ ہے اس کے

۱۔ حکومت آصفیہ کے دارالترجمہ نے فلسفہ کی اس ضخیم کتاب کا اردو میں ترجمہ کر دیا جس کی پہلی جلد کا ترجمہ خاکسار نے اور باقی جلدوں میں سے ایک حصہ کا مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے اور دوسرے حصہ کا مولوی میرک شاہ کشمیری نے کیا ہے۔ دنیا کی کسی زبان میں فلسفہ کی اتنی بڑی کتاب شاید ہی موجود ہوگی۔ اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ فلسفہ چونکہ نام ہی دوسرے کا ہے مشرقی ہو یا مغربی لیکن اگر علم اس کا نام ہے تو صدر شیرازی کا یہ ایسا کام ہے جس میں ڈھونڈنے والے فلسفہ کے ہر کتب خیال والوں کے خیالات تلاش کر کے نکال سکتے ہیں۔

زمانہ تک لایعنی مباحث کا جو ذخیرہ جمع ہو چکا تھا سب کو تلاش کر کے اس نے اپنی کتاب میں جمع کیا اور اس کے ساتھ بعض مسائل میں اپنے خاص نظریات بھی قائم کئے۔ استاذ سے ان کا رنگ اس اعتبار سے جدا ہے کہ ثقیل و غریب لفظوں کے طمطراق ہے ان کی کتابیں خالی ہیں صرف اسفار کے عنوانوں میں میر باقر کی کچھ جھلک پائی جاتی ہے مثلاً ”لمعہ اشراقیہ“ حکمت عرشہ وغیرہ۔

بہر حال جس وقت ہندوستان میں عہد شاہجہانی و عالمگیری گزر رہا تھا ایران کی زمین ان لفظی فلسفوں کی علمی جلالت شان کے غلغلوں سے گونج رہی تھی اور ہندوستان وہی ہندوستان جس نے ہمایوں کی راہ سے اپنا رشتہ ایران سے جوڑ لیا تھا۔ اس میں ان غلغلوں کی صدائے بازگشت آ کر ٹکراتی تھی۔ اب تک کسی میدان میں اسلامی ہند نے چونکہ شکست کی رسوائی نہیں اٹھائی تھی اس لئے ایران کی ان آوازوں سے اتنا تو متاثر نہیں ہوا جتنی کوئی محکوم مفتوح متاثر ہو سکتی ہے۔ لیکن میل ملاپ اور احسان مندی کے جذبات نے ہندوستان کو اتنا منفعل ضرور کر دیا کہ جو ملک اب تک صرف تصوف و فقہ کی جولان گاہ تھا اب ان علوم سے ہٹ کر آہستہ آہستہ اس کا میلان ایرانیوں کے ان لفظی گورکھ دھندوں کی طرف فلسفہ اور منطق یا عقلیات کے پر شوکت ناموں سے بڑھنے لگا۔ زیادہ دن نہیں گزرنے پائے کہ بالآخر پرانے ذوق پر یہ جدید شوق غالب آ گیا اور ایسا غالب آیا کہ عالمگیری کے عہد کے ایک مشہور عالم جو عالمگیری فوج میں ایک بڑی مذہبی خدمت یعنی فریضہ احتساب پر ملازم تھے۔ جس کا براہ راست تعلق فقہ اور فقہی مسائل کی تفصیلات ہی سے ہے۔ فقہ اور اس کے جزئیات سے جو پورے طور پر واقف نہ ہو۔ صحیح طور پر اس فریضہ کا انجام پانا اس سے مشکل ہے۔ میری مراد مرزا زاہد سے ہے جو اس وقت تک عربی مدارس میں اپنے ”زواہد ثلثہ“ کی بدولت خاصی شہرت رکھتے ہیں اور منطق و فلسفہ میں حضرت شاہ ولی اللہ کے والد حضرت شاہ عبدالرحیم کے استاد ہیں ان ہی میرزا زاہد صاحب کے متعلق جو آگرہ میں صدر محتسب عسا کر عالمگیری تھے۔ مولانا شاہ عبدالعزیز راوی ہیں کہ:-

﴿میرزا زاہد ہروی اور علم فقہ میں اُن کی کمزوری﴾

ایک امیرزاہد سے شرح وقایہ پڑھتا لیکن فقہ میں میرزاہد کو اپنے اوپر چونکہ اعتماد نہ

تھا۔ اس لئے جب تک

﴿امیرے شرح وقایہ می خواند بے حضور جد بزرگوار سبق نمی فرمود﴾ (ملفوظات)
 ”دادا (حضرت شاہ عبدالرحیم) نہ آ جاتے۔ میر صاحب سبق نہیں پڑھاتے
 تھے۔“

شرح وقایہ پڑھانے میں تو محتسب صاحب کا یہ حال تھا۔ لیکن اسی کے مقابلہ میں معقولات سے آپ کے تعلق کی جو نوعیت تھی شاہ عبدالعزیز ہی نے ان کا یہ دلچسپ فقرہ نقل کیا ہے کہ مرزا جان اور اخوند یوسف جن کے دوانی کے حواشی پر حواشی ہیں۔ ان کے متعلق مرزا زاہد کہا کرتے :-

﴿معقولات میں مرزا صاحب کا غلو﴾

﴿تقریر مرزا جان جان من است﴾ (تقریر اخوند جان جان من است ص ۸۳)
 ”مرزا جان کی تقریر تو میری جان ہے اور اخوند کی تقریر میری جان جان ہے۔“

اور یہ اس زمانہ میں کچھ بیچارے مرزا زاہد ہی کا حال نہ تھا۔ تقریباً علماء کے اکثر افراد پر یہی کیفیت طاری تھی تاہم ”حملہ نادری“ سے پہلے ہندوستان کے علماء ایرانی فضلاء میں فانی نہیں ہوئے تھے ان کے اعتراف فضل و مہارت کے ساتھ اپنی کمتری کا احساس ان میں نمایاں نہ ہوا تھا اسی لئے بجائے تقلید جامد کے ان کے انفعالی تاثرات بظاہر مقابلہ کے رنگ میں ظاہر ہوتے تھے میر باقر نے اپنی کتاب ”الافق المسبین“ کا نام قرآن سے انتحال کیا تھا ٹھیک اسی کے توڑ پر شاہجہان کے عہد میں جو نیور کے مشہور فلسفی ادیب ملا محمود جو نیوری نے بالکل اسی طمطراقی طرز پر تو نہیں جو ملا باقر کی خصوصیت ہے۔ لیکن اچھے خاصے بلند انشائی رنگ میں فلسفہ کی ایک

مگر بادیو اتنی معقولیت کے اس زمانہ کے معقول کا یہ حال تھا کہ شاہ عبدالرحیم صاحب کی میرزا زاہد نے رمضان میں ایک دن دعوت کی اس عرصہ میں ایک کبابی نے کبابوں سے بھرا ہوا خواجہ مرزا کے پاس لا کر رکھا کہ ”نیا ز آوروہ ام“ مرزا نے کہا ”اے عزیز پیر تو غلام! استاد تو نہ ام نیاز چی معنی؟ آ خر روکد کے بعد معلوم ہوا کہ اس کی دکان کو مرزا کے سپاہی غلط جگہ پر ہونے کی وجہ سے اٹھانا چاہتے ہیں اسی کی رشوت میں لایا ہے آ خر دام دیکر لینا طے ہوا لیکن ڈھائی روپے کے کباب آٹھ آنے میں دے رہا تھا۔ مرزا کو معلوم ہوا سخت برہم ہوئے اور پورے دام ادا کئے۔ ۱۲۔ انفاس ص ۳۳

کتاب تصنیف کی اور انہوں نے بھی قرآن مجید ہی سے اس کا نام ”الشمس البازغہ“ اقتباس کیا۔ اسی طرح اورنگ زیب کے عہد میں ملا محبت اللہ بہاری نے اپنی مشہور دونوں درستی کتابوں یعنی مسلم و مسلم کے نام میں بھی ایک ادیبانہ پہلو ملحوظ رکھا اور دونوں کتابوں میں ڈھلے ڈھلائے ترشے ترشائے فقرے جہاں تک میرا خیال ہے میرا قریبی سے شعوی یا غیر شعوی اثر پذیری کی بنیاد پر داخل کئے گئے ہیں مگر اب تک دونوں ممالک کے فضلاء گویا ایک حد تک ”رقیبانہ“ تعلقات رکھتے تھے مگر سچ ہے کہ غیر محسوس طور پر ایران کے تفوق کو وہ اپنے طرز عمل سے گونا تسلیم کرتے جاتے تھے۔

﴿نادری حملہ کے بعد یہاں کے﴾

لیکن ”نادری حملہ“ نے تو اس نامحسوس کو محسوس اور غیر شعوی انفعال کو

﴿علماء ایرانی علوم و نظریات سے بُری طرح متاثر ہوئے﴾

شعوی بنادیا بلکہ جیسا کہ تمام مفتوح ہزیمت خوردہ اقوام کا قاعدہ ہے انہوں نے اپنے اس انفعال و تاثر کو سرمایہ صد افتخار اور موجب ہزار نازش و امتیاز قرار دیدیا جس کا اندازہ ہندی علماء کی ان کتابوں سے ہو سکتا ہے جو ”حملہ نادری“ کے بعد ہندوستان میں لکھی گئیں۔ میرا قریب کا نام اسی کے بعد ”خیر اللکھہ بالہمرہ“ سید الاذکیا اور خدا جانے کیا کیا ہو گیا۔

اس بحث میں ذرا زیادہ ببط سے میں نے قصداً کام لیا ہے۔ کیونکہ آئندہ جیسا کہ معلوم ہوگا حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے قلم نے جہاں اور کام انجام دیئے ہیں ایران کی اس ذہنی مرعوبیت کے رد عمل میں بھی اس نے کامیاب کوشش کی ہے۔ حضرت کی اس خدمت کا صحیح اندازہ اس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک اس عہد کی اس ذہنی و علمی کیفیت کا کم از کم اجمالاً حال لوگوں کو معلوم نہ ہو جس کا میں نے اس وقت ذکر کیا۔ اب میں پھر اصل بحث کی طرف توجہ کرتا ہوں کہ نادر ہندوستان سے لے جانے کو تو جو کچھ بھی لے گیا لیکن اسی کے ساتھ ایک مصیبت بھی چھوڑ گیا۔ یعنی ایران کے دینی رجحانات اور ذہنی اور دماغی میلانات میں قدرتا مفتوح ہندوستانیوں میں جو پہلے سے بھی بہت کچھ متاثر تھے۔ اور بھی شدت پیدا ہو گئی بلکہ نادر

شاہ اگریوں ہی مار پیٹ اور تاخت و تاراج کر کے نکل بھاگیا تو شدید عداوت و بغض کی وجہ سے کوئی دوسری کیفیت پیدا ہوتی۔ لیکن ہوا یہ کہ:-

﴿نادر شاہ کا بے پناہ رعب﴾

ساری خواری و ذلت اور بربادی و تباہی کے باوجود سب سے ہوئے بادشاہ محمد شاہ نے نادر شاہ کی باضابطہ ہفتوں مہمانی کی۔ دربار کے بڑے بڑے امراء نادر شاہ کی خدمت پر مقرر ہوئے۔ عمدۃ الملک جیسا امیر و کبیر بے چارہ نادر کو قہوہ پلاتے پر مامور ہوا تھا اور یہی حال دوسرے امیروں کا ہوا تھا ”بہر حال محمد شاہ ضیافت نادر شاہ بکمال تکلف قرار داد“ اور بات اسی پر ختم نہ ہوئی بلکہ اسی کے ساتھ نادر شاہ نے

﴿نادر شاہ کے لڑکے کے نکاح میں شاہجہان کی پوتی﴾

﴿دخترے از احفادہ شاہجہان پادشاہ در حبالہ نکاح پسر کوچک خود نصر اللہ مرزا کہ ہمراہ داشت در آور۔﴾ (سیر ص ۴۸۵)

”شاہجہان بادشاہ کی پوتیوں میں سے ایک لڑکی نادر کے چھوٹے لڑکے نصر اللہ مرزا کے نکاح میں دے دی جو اس کے ساتھ ایران سے ہندوستان آیا تھا۔“

ہندوستانی امراء بلکہ خود شاہی خاندان والوں سے صدیوں کے ناز و نعم نے حمیت و غیرت کی حرارت یوں بھی بجھادی تھی اب یہ عزیز داری کا رشتہ جوش انتقام کو فرو کرنے کے لئے ان کے بزدل قلوب کے لئے بہانہ مل گیا اور یوں بزدلی کے رذیلہ پر جذبہ رواداری اور وسعت چشمی کی چادر اڑھادی گئی۔ نادر نے جو کچھ کیا دھرا تھا سب بھلا دیا گیا۔ ”آقا خوش آمدید“۔ ساتھ ہر ایرانی کا ہندوستان میں خیر مقدم ہونے لگا۔ ان کی کتابیں شوق سے پڑھی جانے لگیں۔ ان کے علماء کی باتیں دلچسپی سے لوگ سننے لگے اور اس کے جو نتائج ہو سکتے ہیں وہ ظاہر ہے۔

✽ نادر شاہی کے طفیل ہندوستان میں

روہیلہ پٹھانوں کا سیلاب ✽

لیکن معاملہ یہیں پر ختم نہیں ہو جاتا ہے ظاہر ہے کہ نادر کابل و قندھار کے راستہ سے ہندوستان میں داخل ہوا تھا۔ راستہ میں ان علاقوں کے باشندوں نے مزاحمت کی۔ لیکن باوجود اپنی مشہور جلالت و شجاعت کے قزلباشوں کی ضرب کی تاب نہ لاسکے۔ ہر جگہ ان کے پاؤں اکھڑتے چلے گئے اور نہ صرف کابل و قندھار بلکہ سرحد کے آفریدی و مہندی و مسعودی اور دوسرے جاں باز جان فروش قبائل بھی نادر کے ہلے کور و کئے میں کامیاب نہ ہو سکے۔ ایسا عجیب و غریب واقعہ کیسے پیش آیا۔ تاریخ کا یہ اہم سوال ہے اور ہماری بحث سے خارج ہے تاہم بعض اشارات تورانی و ایرانی تنازعات کے قصہ میں مل سکتے ہیں غور کرنے والے شاید ان کی مدد سے صحیح نتیجہ تک پہنچ سکتے ہیں۔

بہر کیف یہ واقعہ تھا کہ ہر جگہ کابل و قندھار و سرحد کے پٹھانوں کو بھی نادر کے مقابلہ میں رک اٹھانی پڑی اور ہر جگہ ”خونی نادر“ نے ان پر عافیت تنگ کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہزیمت خوردہ پراگندہ قوم اپنے علاقوں سے بھاگ بھاگ کر ہندوستان میں پناہ ڈھونڈنے لگی اور

✽ جمعے ازاں قوم پراگندہ بہ ہندوستان در آمدہ۔ در ہر جاکنی و اکثر در سرکارات ملازم شدہ داخل شدہ گشتہ پرا۔ (سیر ص ۲۸۰)

”اس پراگندہ پریشان قوم کا ایک حصہ ہندوستان پہنچا اور ہر جگہ انہوں نے سکونت اختیار کی اور ملک کی مختلف سرکاروں (علاقوں) میں انہوں نے ملازمت اختیار کر لی۔“

اور مختلف سرداروں کی ماتحتی میں جتھے بنا بنا کر انہوں نے چند دونوں میں اپنے مختلف مرکز قائم کر لئے۔ خصوصاً

✽ محمد خاں معروف بہ روہیلہ مورد التفات اعتماد الدولہ گرویدہ بعضے جاگیرات و خالصہ را بطور ملکیت قابض و متصرف بہ توجہات وزیر گشت۔ ✽

”محمد خاں جو روہیلہ کے نام سے مشہور ہے وہ اعتماد والدولہ (امین خاں) کی نظر التفات سے سرفراز اور اسی وزیر کی توجہ سے بعض جاگیرداروں و خالصہ وغیرہ پر بطور مالک ہونے کے قابض ہو گیا۔“

چوں صاحب جرات و شخص صاحب ارادہ و شعور بود ہمیں افغانان دروہیلہ ہائے گریختہ قندھار و اطرافش را با خود رفتی ساخته بنام روہیلہ اشتہار و از اجتماع آنها اقتدار یافت۔ ملک بسیارے را مثل آنولہ و سنہیل و مراد آباد و بدایوں و بریلی وغیرہ متصرف گشت ﴿ص ۳۸۰﴾

”چونکہ محمد خاں جرأت و ہمت والا آدمی تھا اور ارادہ و عزم اور تمیز و شعور کا بہرہ رکھتا تھا۔ اس نے قندھار اور اس کے گرد و نواح کے بھاگے ہوئے روہیلوں کو اپنے ساتھ کر لیا روہیلہ کے نام سے اس کی شہرت ہوئی اور ان لوگوں کے جمع ہو جانے سے اس شخص کو اچھی خاصی قوت حاصل ہو گئی ملک کا ایک بڑا علاقہ مثلاً آنولہ، سنہیل، مراد آباد، بدایوں، بریلی وغیرہ کو اپنے تصرف میں لے آیا۔“

یہ مطلب نہیں ہے کہ اس سے پہلے اس علاقے کے باشندے ہندوستان میں نہیں پائے جاتے تھے، بلکہ مقصد یہ ہے کہ اپنے ملک کے بے سروسامانی کے ساتھ روہیلوں کی ایک بڑی تعداد یکا یک جو ہندوستان کے بالائی علاقوں اور خصوصاً دہلی میں پھیل گئی تو اس کا سبب یہی نادر اور اس کی عجیب و غریب لشکر کشی تھی۔ اب ہوا یہ کہ ایک طرف نادر کی وجہ سے ایرانی اور ایرانی مذہب و ذہنیت رکھنے والوں کو ملک میں تفوق حاصل ہوا اور ان ہی کے ساتھ ایک جدید عنصر بالکل ان کے مقابلے یعنی روہیلوں کا بھی اقتدار بتدریج جڑ پکڑنے لگا۔ تیسرا عنصر تورانیوں کا تو پہلے ہی سے موجود تھا کہ حکومت ہی تورانیوں کی قائم کی ہوئی تھی۔ جیسا کہ میں نے عرض کیا آخر زمانہ میں اورنگ زیب کے بعد تورانی اور ایرانی سوال میں کافی شدت پیدا ہوتی چلی جاتی تھی۔ جس کے بظاہر تعبیر تورانی و ایرانی سے کی جاتی تھی۔ لیکن دراصل یہ مقابلہ سنیوں اور شیعہوں میں تھا۔ سنیوں کا نام تورانی رکھا گیا تھا اور شیعہوں کو کبھی ایرانی اور کبھی ”سادات“ کے نام سے

خصوصاً ”سیر المتاخرین“ کے مصنف جو خود شیعہ ہیں یاد کرتے ہیں۔ ایک موقع پر طباطبائی نے ان تورانی بے چاروں کے متعلق جن میں شہب سے زیادہ بدنام آصف جاہ بہادر کا خاندان تھا ان کے خاص چچا زاد بھائی اعتماد الدولہ کے متعلق طباطبائی لکھتے ہیں:-

﴿اعتماد الدولہ تورانیان کہ عداوت سادات راسرماہ سعادت خود دانستہ﴾

(۴۷۸)

”اعتماد الدولہ وغیرہ تورانی جو سادات کی دشمنی کو اپنی سعادت کی پونجی خیال کرتے ہیں۔“

الغرض یہ دو متقابل عناصر تو ہندوستان میں پہلے ہی سے موجود تھے اور گو طباطبائی دونوں فرقوں کی باہمی عداوتوں کو بہت بڑھا چڑھا کر بیان کرتے ہیں۔ لیکن سچی بات یہ ہے تورانی جن لوگوں کا نام رکھا گیا تھا یہ عموماً ترکستان یعنی بخارا، سمرقند، تاشقند، خیوہ، کاشغر وغیرہ کے لوگ تھے اور جن لوگوں کو ان ممالک کے حالات کا خصوصاً جس زمانہ سے ہم بحث کر رہے ہیں علم ہے وہ جانتے ہیں کہ اس وقت اس ملک کے مسلمان بہ نسبت فقہاء اور علماء کے زیادہ تر حضرات صوفیہ کرام کے زیر اثر تھے اور تصوف لی لوگ جو کچھ بھی خرابیاں بیان کریں۔ لیکن اتنا تو ہر شخص کو ماننا پڑے گا کہ صوفیانہ مسلک رکھنے والے نفوس بجائے تنگ چشم ہونے کے وسیع المشرَب ضرور ہوتے ہیں۔ حتیٰ کہ اسی بنیاد پر ”الصوفی لاندہب لہ کا مقولہ مشہور و معروف ہو گیا ہے۔ بلکہ بعضوں کا تو خیال ہے کہ صوفیوں اور شیعوں میں بجائے تخالف اور تصادم کے توافق کے جہات زیادہ ہیں اور اسی لئے سمجھا جاتا ہے کہ تصوف کا بہت کچھ میلان تشیع کی طرف رہا ہے۔ جس کی ایک مثال شاید خود حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی ذات گرامی بھی ہو سکتی ہے۔ کہ مسئلہ خلافت کے متعلق کہا تو آپ کی رائے یہ ہے کہ عام اشاعرہ جو

﴿تقریری کنند کہ خلافت ایشاں بہ نص نیست مطلقاً یا بہ نص جلی نیست بلکہ

امرا اجتہادی است کہ اہل عصر بنا بر اجتہاد بر آں اتفاق نمودند﴾

یہ کہتے ہیں کہ (حضرات خلفاء) کی خلافت مطلقاً کسی نص سے ثابت ہی

نہیں ہے یا نص صریح واضح سے ثابت نہیں ہے۔ بلکہ ایک اجتہادی بات

ہے۔ اس زمانہ کے لوگ اپنے اجتہاد اور غور و فکر سے ان لوگوں کی خلافت پر متفق ہو گئے۔“

تو اشاعرہ کا یہ خیال شاہ صاحب کے نزدیک درست نہیں ہے بلکہ ﴿آنجحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ازاں علم شریف نصاذا اشارۃ خبر داوندنا آنکہ تکلیف عبازا بتخلاف ایں بزرگواراں عملاً واعتقاداً مستحق شد و پردہ از روئے کار برانداخته گشت۔﴾

”آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس شریف علم کی نص اور اشارہ ہر طریقہ سے خبر دی ہے حتیٰ کہ اسی بنیاد پر اللہ کے بندے اس بات کے مکلف ہوئے کہ ان بزرگوں کو خلفیہ مقرر کریں اور عملاً واعتقاداً یہی بات واجب ہوئی۔“

یہ اس ازالۃ الخفاء کے مصنف علام کی رائے ہے جس کو پڑھ کر وہی نہیں جو خاندان ولی اللہ کے حلقہ بگوشوں میں ہیں بلکہ وہ بھی جن کے متعلق مشہور کیا گیا ہے کہ بجائے عقیدت و نیاز کے ہمیشہ نسل بعد نسل اپنے کو وہ علم کے اس سلسلہ اور خانوادہ کے حریف مقابلہ سمجھا کئے میری مراد مولانا فضل حق خیر آبادی سے ہے۔ اُن کے بڑے مداح شاگرد مولانا محسن بہاری رحمۃ اللہ خود اپنی براہ راست سنی ہوئی۔ شہادت ادا کرتے ہیں کہ جب الور میں مولانا فضل حق سے وہ پڑھا کرتے تھے تو اسی زمانہ میں

﴿کتاب ازالۃ الخفاء فکان اولع بها و یکثر النظر فیہا اوان فراغۃ من ارسہ و سائر ما شغلہ من شانہ فلما وقف علی شی کثیر منها تال بحضر من الناس و کنت فیہم الذی صنف ہذا الکتاب لبحر ذخارہ یری لہ ساحل﴾ (الانص ۹۳ مطبوعہ علی رجال الطحادی)

”مولانا فضل حق کے ہاتھ ازالۃ الخفاء کا ایک نسخہ کہیں سے لگا مولانا اس کے مطالعہ کے حریص تھے اور جب درس و تدریس یا دوسرے مشاغل سے فرصت ملتی تو بکثرت اسی کتاب کے مطالعہ میں مصروف رہتے جب مولانا اس کتاب

کے بڑے حصہ کو پڑھ کر فارغ ہوئے تب آپ نے سب کے سامنے جن میں بھی شریک تھا یہ فرمایا کہ جس شخص نے یہ کتاب تصنیف کی ہے وہ تو ایک دریائے بے کراں ہے جس کے ساحل کا پتہ نہیں چلتا۔

مگر اسی ”ازالۃ الخفاء“ کے مصنف نے فیوض الحرمین میں جو یہ لکھا ہے کہ ﴿ان طبیعتی وفکرتی اذا ترکنا وانفسنا فضلنا علیا کرم اللہ وجہہ واجتہاہ اشد محبة﴾

”میری طبیعت اور میری فکر کو جب اپنے حال پر چھوڑ دیا جائے تو دونوں حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو فضیلت دیں اور دونوں کو حضرت سے شدید محبت ہے۔“

تو کیا آپ کی طبیعت و فکر کا یہ رنگ اسی تصوف کا نتیجہ نہیں ہے جس کے آپ ”کابرا عن کابر“ وارث تھے وہ تو غنیمت ہوا کہ دربار رسالت سے جیسا کہ وہ خود لکھتے ہیں ”الوصاۃ تفضیل الشیخین“ یعنی شیخین (حضرت ابو بکر و عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما) کو فضیلت دینے کی وصیت ہوئی اس لئے فرماتے ہیں کہ یہ تفصیل شیخین کا اعتقاد۔

﴿شیء طلب منی التعبد بہ خلاف المشتہی و ہیئات ہذہ المناقضات منی لولا ان شلۃ الجامعیۃ ہی التی او قعتنی فی ذالک﴾ (فیوض الحرمین ص ۶۵)

”ایک ایسی چیز ہے کہ میری ذاتی خواہش کے خلاف مجھے اس کے ماننے اور عبادت خدا سمجھ کر ماننے کا حکم دیا گیا ہے افسوس مجھ میں یہ کس قسم کی مناقص

۱۔ شاہ صاحب کو طبیعت کا یہ میلان اسی قسم کا تھا۔ جیسا کہ عموماً لوگوں کو اپنے روحانی بزرگوں کے اعزہ و اقارب خصوصاً ان کی اولاد کی طرف ہوتا ہے جو صرف ”طبیعت“ ہی کا اقتضا ہوتا ہے اور امور دین میں طبیعت کے اس اقتضا کو کوئی دخل نہیں، بلکہ یہاں اصل چیز کتاب و سنت کے دلائل ہیں تو چونکہ دلائل کا فیصلہ تفصیل شیخین کے حق میں تھا جیسا کہ خود شاہ صاحب نے ہی ازالۃ الخفاء اور قرۃ العین میں پورے شرح و بسط کے ساتھ اس کو ثابت فرمایا ہے اس لئے شاہ صاحب نے اپنی ذاتی چاہت اور طبیعتی میلان کے خلاف اسی کو اختیار فرمایا پھر روحانی مکافدہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے بھی آپ کو تفصیل شیخین ہی کی وصیت ہوئی۔ ۱۲

اور متضاد باتیں ہیں لیکن مجھ میں شدید جامعیت کا جو رنگ پایا جاتا ہے اسی نے اس حال تک مجھے پہنچایا ہے۔“

خیر یہ تو بیچ کا ایک جملہ معترضہ تھا۔ میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ ہمایوں کے بعد مغل دربار میں تورانیوں اور ایرانیوں یا دوسرے لفظوں میں سنیوں اور شیعہوں دونوں کی آمد ہو رہی تھی۔ دونوں طبقوں کے امراء حکومت کی مشین میں داخل ہو ہو کر اپنی اپنی فراخورتا بلیت کے لحاظ سے پرزے بنتے چلے جاتے تھے۔ اور گوان دونوں میں رقابتیں ضرور رہتی تھیں۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ محض سنی ہونے یا شیعہ ہونے کی وجہ سے اس اختلاف نے کبھی کسی سخت خطرناک فساد کی شکل اختیار نہیں کی۔

جہاں تک واقعات سے معلوم ہوتا ہے اولاً تو باہم مذہبی مناقشوں کا کوئی ایک دوسرے کو موقع ہی نہیں دیتا تھا۔ بلکہ حتی الوسع ہر ایک دوسروں کے جذبات کا عموماً خیال کرتا تھا اور گاہے بگاہے اگر کوئی ناخوش گوار گفتگو اس سلسلہ میں ہو بھی جاتی تو اسے غیر معمولی اہمیت نہیں دی جاتی تھی۔ اور بات وہیں رفع دفع ہو جاتی تھی اور خواہ مخواہ اس کو جماعتی جھگڑا بنانے کی کوشش نہیں کی جاتی تھی۔ باقی پچھلے دنوں میں ”سادات بارہ“ کا جو قضیہ نامرضیہ پیش آیا اس میں شک نہیں کہ یاروں نے اس میں ایک حد تک شیعہ سنی کے اختلاف کا رنگ ضرور بھرا اور خوب بھرا۔ امیر الامراء حسین علی خاں کے قتل پر مرہٹے لکھے گئے اور بڑے دردناک مرہٹے لکھے گئے۔ گویا اس واقعہ کو کر بلا ثانی ٹھہرایا گیا میر عبد الجلیل بلگرامی کا مرثیہ تو اسی مشہور مصرعہ سے شروع ہوتا ہے۔۔۔

آثار کر بلاست عیاں از زمین ہند

اس باب میں اتنے غلو اور مبالغے سے کام لیا گیا کہ جب جانشہ کی جنگ میں حسین علی خاں کے ایک عزیز سیف الدین خاں لڑتے ہوئے کام آئے۔ تو طباطبائی جیسے روشن خیال بزرگ نے بھی اس کے واقعات بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ جن دنوں یہ واقعات پیش آئے۔۔۔

ہوا از معتمدان مسموع افتادہ کہ در آں ایام علی التواتر سرخی شفق صبح و شام بمرتبه

از دیاداشد او داشت کہ گویا دامن فلک جہار کار آلودہ خون مظلوماں و دیدہ لیل

و نہار بر ماتم آں ابرار خون فشاں ست ﴿﴾ (صفحہ ۱۷۴۸ ج ۱)

”معتبر لوگوں سے یہ بات سنی گئی کہ ان دنوں میں مسلسل صبح و شام شفق کی سرخی

اتنی زیادہ تیز ہو جاتی تھی کہ گویا فلک کا دامن مظلوموں کے خون سے آلودہ

ہو رہا ہے اور دن رات کی آنکھیں ان عزیزوں کے ماتم میں خون فشاں ہیں۔“

لیکن جو اصل واقعات سے واقف ہیں اور اجمالاً میں بھی کچھ پہلے ذکر کر چکا ہوں۔

کیا۔ اُن کے دیکھنے والے ایک لمحہ کیلئے بھی ”سادات بارہ“ کے جھگڑوں کو واقعی کسی مذہبی سوال کا

نتیجہ قرار دے سکتے ہیں؟ تاریخ اسلام میں یہ کوئی نئی بات نہیں تھی۔ اس سے پہلے بھی مختلف

مواقع پر جاہ و اقتدار کے متوالوں نے اپنے اپنے ہم خیالوں میں ہمدردی کا نشہ پیدا کرنے کے

لئے اپنی اپنی خواہشوں پر مذہب کا نقاب چڑھایا تھا۔ (القصة بطولھا)

بہر حال میں یہ کہہ رہا تھا کہ نادر شاہی تلوار کی شرر باریوں اور برق افشانیوں نے

روہیلوں کی ایک بڑی تعداد کو جب اپنے اپنے علاقوں سے منتشر اور پراگندہ کر کے ہندوستان

کی طرف دھکیل دیا۔ تو ایرانی و تورانی عناصر کے ساتھ اب تلک اور دربار دونوں میں ایک جدید

موثر عناصر کا اضافہ ہو گیا اور بات اسی پر ختم نہیں ہو گئی بلکہ نادر شاہ کی واپسی اور راستہ میں اچانک

اُس کے قتل کی وجہ سے جب شاہ ابدالی کو کابل و قندھار کے علاقوں میں تسلط حاصل ہوا۔ اور

مختلف اسباب و وجوہ کی بنیاد پر ایک دفع نہیں بلکہ مسلسل تھوڑے تھوڑے وقفہ کے ساتھ صرف

روہیلوں کے جرگوں کو ساتھ لے کر شاہ ابدالی نے ہندوستان پر سات حملے کئے جن میں آخری

حملہ وہی تھا جو ”پانی پت کی مرہٹہ جنگ“ کے نام سے مشہور ہے۔ جس کا اجمالاً ذکر میں پہلے

کر چکا ہوں۔ اس طرح نادر شاہ کے ستائے ہوئے خانہ برباد روہیلوں کے لئے شاہ ابدالی نے

زمین تیار کر دی کہ وہ ہندوستان کی اس حکومت میں جس پر عالم سکرات طاری تھا اور ہر طرف

طوائف الملوکی کا دور دورہ تھا اپنے لئے مواقع فراہم کریں۔ علی محمد روہیلہ تو پہلے ہی سے ایک

مرکز تیار کر چکا تھا۔ اور وہی علاقہ جو آج روہیل کھنڈ کے نام سے موسوم ہے۔ ان کے تسلط کی

آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ ان کے تفوذ اور اثر کا اندازہ اسی سے کیا جاسکتا ہے کہ یہ علاقہ اُن ہی کے نام مشہور ہو گیا اور اب تک اسی نام سے پکارا جاتا ہے۔ خصوصاً ”مرہٹی فتنہ“ کے استیصال کے بعد شاہ عالم (جو اس وقت ساہزادہ عالی گہر کے نام سے مشہور تھے) یہ تو بادشاہ رہیں گے اور امیر الامرائی کی خدمت نجیب الدولہ روہیلہ کو اور وفات کا چارج نواب وزیر اودھ کے سپرد ہوا۔ اس سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ روہیلوں کا ملک پر ایسا اقتدار قائم ہو چکا تھا۔ جن سے قطع نظر ناممکن تھا اور جیسا کہ میں نے عرض کیا۔ اب ملک میں تین عنصر پیدا ہو گئے تھے۔ یعنی ایرانی، تورانی، روہیلہ، اسی لئے شاہ ابدالی نے بادشاہی تو تورانیوں میں رکھی کہ وہی اب تک اس کے خاندانی طور پر مستحق تھے۔ وزارت ایرانیوں کو کہیے یا شیعوں کو دی گئی اور امیر الامرائی کا عہدہ ایک روہیلہ امیر نجیب الدولہ کے سپرد ہوا۔

روہیلوں کا حکومت دہلی کے ایسے جلیل منصب پر اقتدار حاصل ہونے کا لازمی نتیجہ تھا کہ روہیلے جواب تک اپنا ماویٰ بلجا زیادہ تر روہیل کھنڈ کو بنائے ہوئے تھے۔ اب دلی میں بھی اقتدار و قوت کے مظہرین بن کر اپنے وجود کو محسوس کرانے لگے۔ علامہ محسن البہاری الترمذی ”الیانغ“ میں لکھتے ہیں:-

﴿لما استولى احمد لابلدالى المعروف بالدرانى احد الملوک
جبال الافاغنة على وهلى وکثرنى سککها جماعات من قومہ و
اکثر حصى من شعرات غنه کلب﴾

”جب احمد شاہ ابدالی جو درانی کے لقب سے مشہور ہیں اور افغانی کو ہستانوں کے بادشاہوں میں سے ایک بادشاہ ہیں ان کا تسلط دہلی پر ہو گیا اور دلی کی گلیوں میں بکثرت ان کی قوم کے لوگ بھر گئے اور یہ لوگ قبیلہ کلب کی بکریوں کے بالوں سے بھی زیادہ تعداد میں تھے۔“

اسی کا ذکر تھا کہ بریلی میں حافظ الملک رحمت خاں، نجیب آباد میں نجیب الدولہ اور اُن کے سوا اور بھی دوسرے دوسرے مقامات میں روہیلوں کی چھوٹی بڑی ریاستیں قائم ہو گئیں۔ حتیٰ

کہ اس وقت تک رام پور، ٹونک، بھوپال، ان ہی روہیلوں کی یادگار میں نیم آزاد ریاستوں کی صورت میں موجود ہیں۔ بہر حال نادر شاہ نے دشمن بن کر اور شاہ ابدالی نے دوست بن کر ان روہیلوں کو ہندوستان خصوصاً بالائی علاقوں میں بھر دیا۔ ظاہر ہے کہ روہیلے عموماً صرف سنی مسلمان ہی نہیں، بلکہ کچے حنفی بھی ہوتے ہیں۔ اور اس کے ساتھ یہ اپنے اندر چند مخصوص قومی خصوصیات رکھتے تھے۔ جن کی وجہ سے یہ ان دونوں قدیم عناصر تورانی و ایرانی سے الگ نظر آتے تھے اور مختلف وجوہ و اسباب نے ایک حد تک ان کو ایک الگ عنصر کی حیثیت سے ملک میں قائم کر دیا تھا۔ خصوصاً ان کے مزاج میں فطرتاً جو ایک قسم کی سختی اور کرخشگی پائی جاتی ہے جو نہ ایرانیوں میں تھی اور نہ تورانیوں میں اور اسی کے ساتھ باوجود سنی مسلمان ہونے کے تورانیوں اور ان میں ایک نمایاں فرق یہ تھا جیسا کہ میں نے پہلے بھی عرض کیا ہے کہ تورانی زیادہ تر صوفی مشرب اور حضرت صوفیائے کرام و اولیائے عظام کے زیر اثر تھے۔ ۱۲ ان کے برخلاف روہیلے مسلمانوں پر بجائے صوفیوں اور ارباب باطن، زیادہ تر تنگ نظر ظاہر بین ”جزئیاتی فقہا

کا پنجہ سختی سے جما ہوا تھا۔ پشتہا پشت سے وہ اپنے ان ہی مذہبی پیشواؤں کے زیر اثر جنہیں یہ ملا کہتے ہیں زندگی گزار رہے تھے۔ صاحب الیالغ الجنی لکھتے ہیں:-

﴿وكانوا اشد قوم عصبية لما يتخلونه من آراء فقهاء لها رحمهم

الله تعالى و اشد الناس جموداً عليها﴾

”جن فقہاء رحمہم اللہ کی آرا کی پیروی کو ان لوگوں نے اپنا مشرب اور مسلک

۱۔ انگریزوں کے تسلط کے بعد سنبھل کے ایک پٹھان امیر خاں نے اسی ”اکثر حصی سن شعرات غم کلب“ کے لوگوں کو جمع کر کے جن میں مختلف امراء کے خیل یا فوج کے سپاہی بھی شریک ہو گئے تھے۔ مختلف علاقوں میں خصوصاً راجپوتانہ، مالوہ کی ریاستوں پر چھاپ مارنا شروع کیا۔ آخر امیر خاں سے انگریزوں نے ایک معاہدہ کر لیا اور راجپوتانہ مالوہ کی ریاستوں سے اضلاع کاٹ کاٹ کر ایک ریاست بنا دی گئی جن کا مرکز حکومت ٹونک سے، جاوہ کی ریاست بھی امیر خاں ہی کے ایک رفیق عبدالغفور خان کو حاصل ہوئی۔ ۱۳

۲۔ اس وقت کتاب تو میرے سامنے نہیں ہے لیکن نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی مدظل العالی نے ظہیر الدین بابر پر جو مقالہ لکھا ہے اس میں بابر کے باپ کا ایک واقعہ درج ہے کہ حضرت عبداللہ احرار کی مجلس میں ایک دن حاضر ہوا اور نوٹلی ہڈی پر اتفاق سے بیٹھ گیا۔ گھنٹوں یہ ہڈی چبھتی رہی لیکن ادباً اپنی جگہ سے ہلا بھی نہیں۔ ۱۴

قرار دیا تھا ان کے معاملہ میں اپنے اندر سخت تعصب رکھتے ہیں اور اس پر جمعے

رہتے ہیں روہیلے سخت ترین قوموں میں ہیں۔“

یہ تو بے چارے کسی شاعر نے شاعری کی ہے کہ اس کے معشوق کی محفل میں بات پر

یان زبان کشتی ہے۔“

لیکن اس قوم کا یہ واقعہ ہے کہ کیدانی جیسی معمولی کتاب کی ایک فقہی روایت یعنی چاہئے کہ تم شہد میں اہل حدیث کے مانند شہادت کی انگلی نماز نہ اٹھائے۔“ اس مسئلہ نے صدیوں بلکہ سنتے ہیں کہ اب تک یہ اہمیت حاصل کر لی ہے کہ اگر اتھاقا نماز میں کسی کی انگلی اٹھ گئی۔ اسی وقت میں اس کی انگلی تراش دی جاتی تھی۔ علامہ رشید رضا مصری نے مغنی کے مقدمہ میں اپنا یہ بیان درج کیا ہے:-

﴿سمعتہ بأذن من بعض طلاب الافغانین فی مسجد لاہور

الجامع فی ہند وقل سالتہم عن صحمتہ مانقل عن بعض

بلاوہم فی ذالک فقالوا نعم وعللہ بانہ عقاب علی مخالفتہ

الرسول وترك منة.﴾

”میں نے اپنے کان سے بعض افغانی طلبہ سے لاہور کی جامع مسجد میں

جو ہندوستان میں واقع ہے یہ سنا ہے میں نے دراصل اُن سے دریافت کیا تھا

کہ (انگلی تراستے کا قصہ) کیا صحیح ہے؟ اُس کے جواب میں ہاں کہا اور اسکی

توجیہ یہ کی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت اور ترک سنت کی یہ سزا دی

جاتی ہے۔“

تمباکو جیسی غیر منصوص چیز کی حرمت وحلت پر جو جھگڑا یہاں کے ملاؤں میں چھڑا، سنا

جاتا ہے کہ پچھلے چند سالوں تک یہ قصہ ختم نہیں ہوا تھا۔ بے چارے کوٹہ ملانے تمباکو کی حلت کا

فتویٰ دے دیا تھا۔ پھر کیا تھا۔ مختلف جوگوں کے ”مجاہد“ دینی حمیت وغیرت کے نشہ میں چور اپنے

ملاؤں کے زیرِ کمان باضابطہ مسلح ہو ہوا کر کوٹہ ملا پر چڑھ دوڑے۔ راستہ میں اس ”دینی جہاد“ کی

مہم پر جو رجز پڑھا جاتا تھا۔ میرے ایک دوست نے ہم سے بیان کیا تھا کہ وہ یہ تھا۔ ع

کوٹہ ملا کا پردی جو ساک شدہ ہم کا پردی
(یعنی) کوٹہ ملا کفر ہے اور جو اس کے ساتھ ہے وہ بھی کافر ہے۔

میرے ایک اور سرحدی ہم سبق کہتے ہیں کہ تمباکو کی حرمت کے جو لوگ قائل تھے اُن کا تشدد اس حد تک بڑھا ہوا تھا کہ جس کھیت میں تمباکو بویا جائے اس کھیت کے اطراف سے بیلوں پر غلہ لا کر جو کوئی گزرے گا اس کا غلہ بھی حرام ہو جاتا ہے۔ بہر حال اس قوم کے اسی فطری ”بطش شدید“ اور ”ملاکیشی“ کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوستان اور مغلی حکومت جس میں ایرانی و تورانی اب تک گو نہ روادی اور باہمی مدارات کے ساتھ زندگی گزار رہے تھے۔ اس میں روہیلوں کی شدید ملایانہ ذہنیت نے بتدریج تلخی اور تندی کا اضافہ کرنا شروع کر دیا۔ یہ تو ظاہر ہے کہ واقعی طور پر سرحدی پٹھان یا روہیلے نہ کبھی خارجی تھے نہ کبھی ہوئے اور نہ اب تک ہیں۔ لیکن ان کی ”صوفیانہ سنیت“ نہیں بلکہ شدید ملایانہ ”سنیت“ کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ حضرت سے شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ جیسے بزرگ جو آج تک شیعوں میں اپنی مشہور کتاب ”تحفہ اثنا عشریہ“ کی وجہ سے بدنام اور حد سے زیادہ بدنام ہیں جس دن سے یہ کتاب لکھی گئی ہے۔ نہ صرف ہندوستان بلکہ سنا گیا ہے کہ ایران میں بھی اس کے جواب دینے کی بارہا کوشش کی گئی۔ لکھنؤ کے مجتہد مولوی سید محمد صاحب کے متعلق معتبر لوگوں سے معلوم ہوا ہے کہ انہوں نے بہت سی جلدوں میں اس کا جواب لکھا ہے اور بھی بہت سے چوٹی کے مجتہدوں نے اس کے جواب لکھنے کی کوشش کی اور آج تک یہ کوششیں ہو رہی ہیں۔ بہر کیف شاہ صاحب کا سنیت کی حمایت میں جو شہرہ ہے وہ محتاج بیان نہیں۔ لیکن خود شاہ عبدالعزیز صاحب اپنا ذاتی واقعہ بیان کرتے ہیں کہ روہیلہ پٹھان جن کا نام حافظ آفتاب تھا اور شاہ صاحب کے وہ شاگرد تھے۔ ”وہ ہمیشہ حاضر درس می شد“ فرماتے ہیں کہ

روزے ذکر حضرت امیر علیہ السلام بو و چنانچہ عادت ماسنیاں است کہ ہر
صحابی کہ اند بجان و دل مناقب و فضائل او بیان می کنم، ہم چنین کردم ﴿﴾
”ایک دن حضرت امیر علیہ السلام کا تذکرہ تھا۔ پھر جیسا کہ سنی لوگوں کی
عادت ہے کہ جو صحابی بھی ہوں دل و جان سے ان کے فضائل اور مناقب کو

بیان کرتے ہیں۔ حسب دستور اس تذکرہ میں بھی میں نے یہی کیا۔“
 لیکن شاہ صاحب کے اس روزانہ حاضر باش روہیلہ تلمیذ رشید کا حال سنئے کہ محض اس لئے کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے ساتھ اس وقت شاہ صاحب نے دوسرے اصحاب و خلفاء کے مناقب و محامد کا چونکہ ذکر نہیں فرمایا تھا۔ اسی لئے باوجود سنی ہونے کے اور کسی کو نہیں بلکہ شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق بے تحاشہ اُس نے ”شیعہ“ ہونے کا فتویٰ صادر کر دیا۔ خود شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ:-

﴿بندہ را شیعہ فہمیدہ﴾

”بندہ کو اس نے شیعہ سمجھ لیا۔“

اور اسی پر بس نہیں کیا بلکہ اس کی ”ملائی سنیت“ نے شاہ صاحب کی جانب سے ایسی شدید نفرت اس کے دل میں پیدا کر دی کہ

﴿آمدن درس موقوف کرد﴾

”کہ درس میں آنا بھی اُس نے بند کر دیا۔“

یہ فتویٰ تو ”تحفہ اثنا عشریہ“ کے مصنف پر اس روہیلہ پٹھان نے لگایا ”ازالہ الخفاء“ اور ”قرۃ العینین“ وغیرہ کتابوں کے مصنف حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ بھی ان کے ”ناوک تعصب“ سے محفوظ نہ رہ سکے شاہ عبدالعزیز صاحب ہی کی روایت ہے فرماتے ہیں:-

﴿ہم چنین شخصے از والد ماجد مسئلہ تکفیر شیعہ پر سید آنحضرت اختلاف حنفیہ کہ

دریں باب ست بیان کروند﴾

”یوں ہی ایک شخص نے والد ماجد سے شیعہوں کے کافر قرار دینے کے لئے

متعلق فتویٰ پوچھا۔ حنفی فقہاء کا اس باب میں جو اختلاف

ہے (والد ماجد نے) اس کو بیان فرمایا۔“

”ملاکیش“ غریب روہیلہ پہلی دفعہ تو یہ سن کر چپ ہو رہا۔ اور پھر دہرا کر ذرا اصرار

یہ اپنے منشاء کو ظاہر کرتے ہوئے۔

﴿چوں مکرر پرسید ہماں شنید﴾

”جب اس نے دوبار وہی بات پوچھی تو جواب میں پھر وہی سنا۔“
 دوسری دفعہ اس کا یہ سننا تھا کہ آگ بگولا ہو گیا۔ جن کو وہ قطعی کافر سمجھتا تھا۔ ان کے کفر کے متعلق اختلاف کا سننا اور دوبارہ پوچھنے کے بعد بھی سننا ناقابل برداشت ہو گیا۔ تھا خود حضرت سے فتویٰ پوچھنے لیکن الٹ کر خود مفتی بن بیٹھا۔ شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ:-

﴿شنیدم می گفت ایں شیعی ست﴾

”میں نے سنا وہ کہتا تھا کہ یہ (یعنی شاہ ولی اللہ) شیعی ہے۔“

اور یہ حالت تو ہمارے سرحدی اور افغانی بھائیوں کی ”سنیت“ کی تھی۔ باقی رہی اُن کی ”حفیت“ سوا اس کا کچھ انداز ”رفع سبابہ“ اور ”بتناک“ کے مذکورہ بالا مسائل ہی سے ہو سکتا ہے۔ ”الیانع اطبی“ کے مؤلف تحریر نے حضرت شاہ ولی اللہ کے زمانہ کے ان حنفی روہیلوں کی ”حفیت صلبہ“ یا سنگین ملایانہ حفیت کی تصویر ان الفاظ میں کھینچی ہے۔

﴿فكانوا اذا قرع صاحبهم ما يناديهم الذي استطابها غذا كان احدهم يكاد ليسطر بالذي خرجت منه القولة وامتلاء عليه غيظاً قد انتفخت اوراجه و احمرت و جنتاه كانهما ضرام العرفج.﴾ (ص ۸۳)

ان کا حال یہ تھا کہ جب ان کے کان میں کوئی ایسی بات پہنچتی۔ جو ان کے اس تقلیدی امر کے خلاف ہوتی جسے کل وہ اچھا سمجھتے تھے تو ان میں جو کوئی ہو۔ قریب ہوتا کہ اس شخص پر چڑھ بیٹھے جس کے منہ سے ایسی مخالف بات نکلی ہوتی غصہ ہے اس کے مقابلہ میں بھر جاتا اس بے گروں کی رگیں پھول جاتیں۔ اس کے رخسار سرخ ہو جاتے اور ایسا معلوم ہوتا کہ جھاؤ کی لکڑی کے انگارے ہیں۔

ہندوستان میں رہ پڑنے کے بعد اگر چہ اب ان کی پچھلی نسلوں میں نسبتاً وہ ک سختی اور تصلب تو باقی نہیں رہا ہے جس میں کچھ تو اس ملک کی آب و ہوا کا اثر ہے۔ نیز اس کے سوا اور اسباب بھی ہیں جن کا کچھ ذکر شاید آئندہ آئے۔ ورنہ جواب تک ان ہی پتھر یلے کوہستانوں میں رہتے ہیں۔ ان کی دینی سختی کا حال جیسا کہ سید رشید رضا مصری نے لکھا ہے وہی ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔

﴿وَمِنْ ذَلِكَ أَنَّ بَعْضَ الْخَفِيلَةِ مِنَ الْأَفْغَانِينَ سَمِعَ رَجُلًا يَقْرَأُ
الْفَاتِحَةَ وَهُوَ بِجَانِبِهِ فِي الصَّفِّ فَضْرَبَهُ بِمَجْمُوعِ يَدِهِ عَلَى
صَدْرِهِ ضَرْبَةً وَقَعَ بِهَا عَلَى ظَهْرِهِ فَكَادَ يَمُوتُ، فَبَلَغَنِي أَنَّ
بَعْضَهُمْ كَسَرَ سَبَابَةَ مَصْلٍ لِرَفْعِهِ إِيَّاهُ فِي التَّشْهَدِ.﴾

(ص ۱۶ مقدمہ معنی)

”ان کی سختیوں کی داستانوں میں ایک قصہ یہ ہے جو بعض افغانی خفیوں کے
متعلق سنا جاتا ہے کہ اس نے جماعت میں اپنے برابر والے کو دیکھا کہ وہ
سورۃ فاتحہ (امام کے پیچھے) پڑھ رہا ہے تو اس افغانی نے اس بیچارے فاتحہ
پڑھنے والے کو سینے پر اس زور سے دو ہٹ مارا کہ وہ بیچارہ پیٹھ کے بل زمین
پر گر پڑا اور قریب تھا کہ مر جائے اور مجھے یہ خبر بھی ملی ہے کہ ایسے ہی ایک شخص
نے تشہد کی انگلی نماز میں اٹھائی تو بعض افغانوں نے اس کی انگلی توڑ دی۔“

بہر حال فتنوں والی تاریک راتوں کی جس خونی موج کے آغوش اور اسلامی ہند کے شدید
طوفانی عہد کے ذکر کو میں نے ناصیہ مضمون پر ثبت کیا ہے۔ غالباً اہل نظر کے سامنے اگر چہ جیسا
کہ چاہئے میں کوئی تفصیلی بیان نہ پیش کر سکا۔ لیکن ایک مجلاتی مقالہ میں اس تصویر کے جتنے خط
و خال کو نمایاں کیا جاسکتا تھا۔ اپنے محدود معلومات اور کوتاہ رسائی کی حد تک ممکنہ کوشش کی گئی
ہے۔ کیونکہ بغیر اس کے سچی بات یہی ہے کہ اس ”ورتا بندہ“ کی حقیقی قدر و قیمت قطعاً نہیں
پہچانی جاسکتی۔ جس نے ابتلاء و امتحان کی ان ہی خونی موجوں میں پرورش پائی اور طوفان
کے ان ہی ہنگاموں میں انتہائی دانائی و فرزانگی کے ساتھ وہی جس کی محبت میں وہ ہر چیز کی محبت
سے دست بردار ہو چکا تھا اسی کی ملت مقدسہ اور امت مرحومہ کی کشتی کو اپنی وسعت و طاقت کی
حد تک منجھدار سے نکالنے میں قطعاً کامیاب ہوا۔

(صلی اللہ تعالیٰ علی نبینا و نبیہ و رسولنا و جزاہ اللہ و عن امنہ خیر الجزاء)

﴿یہاں تک کہ تاریخی مباحث کا مقصد اور حاصل﴾

میرا مطلب یہ ہے کہ گزشتہ بالا اوراق کے پڑھنے والے اب صحیح طور پر اندازہ کر سکتے ہیں کہ حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ جس زمانہ میں پیدا ہوئے اور جن دنوں میں وہ سرزمین ہند میں زندگی گزار رہے تھے۔ اس وقت ہر چار طرف سے اسلام نرغہ میں گھرا چلا جا رہا تھا شمال مغربی علاقوں میں سکھوں کی آتشیں قوت سر اٹھا رہی تھی۔ جنوبی ہند سے مرہٹوں کا سیلاب ٹھاٹھیں مارتا ہوا ملک کے ”اعزہ“ کو ”اذلہ“ بنانے میں بے دردی سے سرگرم تھا۔ دونوں قوتوں میں باہم جو کچھ بھی اختلاف ہو لیکن محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مآثر و نشانات ان کے نام لیووں اور وابستوں حلقہ بگوشوں کا بانگلیہ قلع قمع کرنے پر دونوں ادھار کھائے بیٹھے تھے۔ تیسری طرف خلیج بنگال کے ساحلی علاقوں سے مغربی قوتیں بتدریج اپنا پنجہ ملک پر جماتے ہوئے آگے بڑھ رہی تھیں اور یہ تو بیرونی فتنے تھے اندر ایرانیوں اور تورانیوں پھر ان کے ساتھ بروہیلوں کے باہمی تصادم اور مختلف اغراض و مقاصد کی کشمکش سے ”اسلامی حکومت ہند“ کی قبا تار تار ہو رہی تھی۔ ان سیاسی مقاصد کے ساتھ ساتھ صوفیاء کے غلط تصوف اور فقہاء کے غلط تفقہ حد سے گزری ہوئی عصبیت اور جاہلی حیمیت نے امت کے شیرازوں میں الگ انتشار پیدا کر رکھا تھا۔ اسی کے ساتھ ساتھ ایرانی علماء اور شعراء و ادباء کا جو دباؤ مختلف وجوہ سے ہندوستان علماء ارباب فکر و نظر اور تعلیم و تدریس و تصنیف و تالیف کے نظام پر پڑ رہا تھا۔ اس کی وجہ سے آہستہ آہستہ یہاں کے اہل علم کا تعلق قرآن و حدیث تحقیقی فقہ و اصول فقہ اور عقائد و کلام سے ہٹ کر بے معنی لاطائل و جہنی اور لفظی مباحث کے گھور کھدھندوں میں الجھ الجھ کر ”خسر الدنیا و الآخرہ“ کی صورت پیدا کر رہا تھا کہ ان لا حاصل مساعی کا کوئی نتیجہ نہ ان کو دنیا میں مل سکتا تھا اور نہ آخرت میں خصوصاً ایک ایسے زمانہ میں جب ”مغل دربار اور مغل دربار کے امراء جوان لفظی نکتہ نوازیوں اور دماغی عیاشیوں کے قدردان تھے اور ان سے گو نہ محفوظ بھی ہوتے تھے۔ خود ان غریبوں کا اقتدار ہی اندر اندر کھوکھلا ہوتا چلا جا رہا تھا۔ ان کے تختے خود ہی الٹ رہے تھے۔ پھر وہ بے چارے دوسروں کی قدردانی کیا کرتے اور ملک میں جوئی قوتیں ابھر رہی تھیں۔

ان کے سامنے ان ایرانی نثر ادلفظی کج بحثیوں کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔

غالباً ان حالات کو سب دیکھ رہے تھے۔ کیونکہ سکھوں کے سامنے گزر رہا تھا لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کا جو کچھ انجام ہونے والا تھا وہ مشکل ہی سے کسی کو سوچھ رہا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اپنے عقل و حواس کو معطل کر کے ہر ایک اسی دھارے پر بہا چلا جا رہا تھا۔ جدھر زمانہ کے پھیڑے انہیں بہائے لئے جا رہے تھے لیکن حیرت نہ کرنی چاہیے۔ خصوصاً اسلامی تاریخ مطالعہ کرنے والوں کو ششدر نہ ہونا چاہیے کہ پہلی دفعہ نہیں بلکہ تیرہ سو سال سے اسلامی حدود کے جس علاقہ میں اس قسم کے واقعات پیدا ہوتے ہیں۔ تو کائنات کی وہی آخری قوت جس کے پیغام کا نام اسلام ہے اور جس پر خدا نے اپنی پیامبری کے سلسلوں کو ہمیشہ کیلئے ختم فرمایا ہے۔ اسی کا کوئی معجزہ ضرور ایسے وقت میں ظاہر ہوا ہے اور ان منصوبوں کو خاک میں ملا دیا ہے جو دشمن اپنے دلوں میں سوچا کرتے اور جن کا خیال کر کر کے ایمان والے سہے جاتے تھے۔ یہی واقعہ ہندوستان میں بھی پیش آیا۔

﴿فتنوں کے اس دور میں شاہ ولی اللہ کی آمد﴾

ایک ایسے باپ سے جو مشرباً صوفی اور تعلیماً مشہور معقولی و منطقی عالم میرزا زابدؒ ہروی

تقریباً دوڑھائی سو سال سے اس ہراتی ہندی عالم کی تین کتابیں ہندوستان بخارا کاہل وغیرہ کے مدارس میں داخل نسب ہیں ان کتابوں کو اتنی اہمیت حاصل تھی کہ عالم ہی نہیں سمجھا جاتا تھا جب کہ مرزا زابدؒ کی کتابوں میں سے کسی ایک پر یا سب پر کوئی حاشیہ نہ رکھتا ہو۔ مبالغہ نہیں ہے کہ ان تین کتابوں کے حواشی کی تعداد ہزاروں تک پہنچی ہوئی ہوگی۔ ہندوستان دراصل مرزا زابدؒ کے والد قاضی اسل ہرات سے عہد جہانگیر میں آئے۔ بادشاہ نے قاضی القضاۃ کے عہدے پر قاضی اسلم کا تقرر کر دیا تھا قاضی اسلم ملا قاضل کے اور وہ مرزا جان شیرازی مشہور منطقی عالم کے شاگرد تھے۔ بہر حال ان ہی قاضی اسلم کے صاحبزادے کا نام مرزا زابدؒ ہے معلوم نہیں کہ عام مدارس میں بجائے مرزا زابدؒ کے میرزا زابدؒ کیسے مشہور ہو گیا۔ غالباً یہ شخصی غلطی ہے یا لوگوں نے اس غلطی پر دوسری غلطی یہ کی کہ ”قال البد الزابد“ اور ”قال السید السد“ وغیرہ لکھنا شروع کیا۔ مرزا زابدؒ بچپن ہی سے بڑے ذہین تھے کل تیرہ سال کی عمر میں فارغ التحصیل ہو گئے۔ عالمگیر کے زمانہ میں مختلف خدمتوں پر بحال ہوئے۔ شاہ عبدالرحیم جس زمانہ میں ان سے پڑھتے تھے آگرہ میں فوج کے محاسب تھے۔ علاوہ زابدؒ کے مرزا زابدؒ کا ایک حاشیہ شرح تجرید پر بھی ہے اور اشرافیوں کی کتاب ”بیا کل النور“ پر بھی ایک شرح لکھی ہے۔ شاہ ولی اللہ نے لکھا ہے ”از مشرب صافی صوفیہ غیر بہرہ تمام داشتہ اند۔“

صاحب ”زواہد ثلثہ“ کے رشید شاگردوں میں تھے اور کیسے رشید شاگرد کہ شاہ ولی اللہ نے خود اپنے والد کی زبانی نقل کیا ہے کہ

﴿ایشاں بامن التفات بسیاری کروند جدی کہ اگر می گفتم کہ امروز مطالعہ نہ کردہ ام می گفتند یک سطر یا دو سطر خوانید کہ ناغہ نشو﴾ (انفاس ص ۳۲)
 ”مرزا زاہد کی توجہ میری طرف اس حد تک مبذول تھی کہ میں کہتا کہ آج میں نے مطالعہ نہیں کیا اس لئے نہیں پڑھوں گا تو مرزا کہتے کہ ایک یا دو سطر ہی پڑھ لو۔ تاکہ ناغہ تو نہ ہو۔“

مرزا زاہد کی سب سے بڑی معرکتہ الآراء تصنیف حواشی امور عامہ شرح مواقف کے متعلق شاہ ولی اللہ کا بیان ہے:-

﴿ظاہر اتسود حاشیہ شرح مواقف بہ تقریب قراۃ حضرت ایشاں بود﴾
 ”حاشیہ شرح مواقف کی مسودہ نگاری کا کام مرزا نے اسی سلسلہ میں کیا جب والد ان سے یہ کتاب پڑھتے تھے۔“

بہر حال اسی معقول فلسفی کے ایک صوفی شاگرد کے صلب مبارک سے حق تعالیٰ نے محض اپنے فضل و کرم سے بڑے سخت وقت اور کٹھن گھڑی میں ہندی مسلمانوں کو وہ گرامی ہستی عطا فرمائی۔ جس کا نام حضرت سیدنا الامام مولانا الشاہ ولی اللہ دہلوی قدس سرہ العزیز ہے۔

﴿شاہ ولی اللہ کے والد شاہ عبدالرحیم کی شخصیت﴾

اگرچہ واقعہ یہ ہے کہ شاہ ولی اللہ جو کچھ ہونے والے تھے اور ہندوستان میں جس دینی و علمی موسم کو ان کی مخلصانہ کوششوں نے پیدا کیا۔ اس موسم کی بہار کی ابتدا خود ان کے والد ماجد حضرت شاہ عبدالرحیمؒ سے ہو چکی تھی۔ پہلی بازی جو شاہ عبدالرحیمؒ نے جیتی وہ اس وقت کی بات ہے جب وہ طالب علم تھے اور فتاویٰ عالمگیری کو تدوین ہو رہی تھی۔ ان کے ایک ساتھی جن کا نام شیخ حامد تھا۔ ان کے بھی کام کا کچھ حصہ دفتر تدوین سے عطا ہوا تھا۔ براہ محبت و دوستی شیخ حامد نے شاہ عبدالرحیم صاحب کو شریک کار کر کے کچھ یومیہ (تنخواہ) کی امید دلائی لیکن جو کسی آنے

والے سال نو کی بہار تھا۔ اس نے ملتی ہوئی تنخواہ سے انکار کر دیا۔ اس انکار کی خبر جب شاہ عبدالرحیم کی بیوہ والدہ کو ہوئی تو برہم ہوئیں اور اصرار کر کے حکماً نوکری قبول کرنے پر مجبور کیا تو نوکر ہو گئے مگر جب اس ملازمت کی خبر آپ کے مرشد خلیفہ ابوالقاسم کو ہوئی تو اب یہ برہم ہوئے اور ترک ملازمت پر قدغن شروع کیا۔ شاہ صاحب نے والدہ کے حکم کا عذر پیش کیا۔ لیکن ”پیر“ نے اپنے حکم کی پیروی کا فیصلہ صادر فرمایا۔ پھل جانے کا شاید موقع تھا۔ لیکن شاہ عبدالرحیم سنبھل گئے اور مرشد سے عرض کیا کہ آپ ہی دعا فرمادیں کہ نوکری چھوٹ جائے ورنہ یوں چھوڑوں گا تو والدہ کی سخت آزر دگی کا اندیشہ ہے۔ حصول ملازمت کے لئے نہیں بلکہ ترک ملازمت کی دعا کرائی گئی اور کی گئی قبول ہوئی عالمگیر کے تدوین فتاویٰ کے ملازموں کی فہرست وقتاً فوقتاً پیش ہوتی رہتی تھی حسب دستور پیشی کا عالمگیر نے حکم دیا اور بلا وجہ شاہ عبدالرحیم کے نام پر قلم پھیر دیا۔ مگر امتحان کی ایک منزل باقی تھی اور نگ زیب نے تنخواہ بند کر کے اس سے بھی بڑا القمہ پیش کیا۔ فرمان ہوا کہ۔

﴿گر خواستہ باشد۔ ایں قد زریں بدہید﴾

”اگر چاہیں تو اتنی زمین ان کو دی جائے۔“

نوکری چھوٹی جاگیر دار بنائے گئے۔ قدرت جس کا ارادہ کچھ اور تھا اس کی توفیق نے پھر ان کے بازو تھام لئے۔ شاہ عبدالرحیم صاحب سے شاہی فرمان کے بموجب جب استصواب کیا گیا تو باوجود تنگی معاش اور محض بے وسیلہ ہونے کے خود فرماتے ہیں۔

﴿قبول نہ کردم و شکرانہ بجا آوردم و حمد خدا تعالیٰ گفتم﴾

”میں نے قبول نہیں کیا اور شکر ادا کیا اور حق تعالیٰ کی حمد کی۔“

۱۔ شاہ عبدالرحیم کے اس قول سے بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو اور آپ کے خاندان والوں کو جیسا کہ اس زمانہ کا عام دستور تھا حکومت سے کسی قسم کی کوئی جاگیر منصب و وظیفہ مد معاش وغیرہ نہیں ملی تھی۔ شاہ ولی اللہ کے متعلق میں نے بہت تلاش کیا مگر اس حوالی کے جو درجہ کے لئے محمد شاہ بادشاہ نے آپ کو پیش کی تھی اور کسی حکومتی امداد کا پتہ نہیں چلا۔ شاہ عبدالرحیم تک تو یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ آپ کے خاندان میں قدیم سے طبابت کا پیشہ چلا آتا تھا۔ لیکن جیسا کہ شاہ عبدالعزیز کے ملفوظات میں ہے۔

(بقیہ اگلے صفحہ پر)

نوکری چھوٹی جاگیر سے محروم ہوئے لیکن اس پر بھی ”حمد خدا تعالیٰ“ گفتم جس کا یہ مقام ہو۔ اگر اس کا اور اس کی ذریت طیبہ کا قدرت کس اہم خدمت کیلئے انتخاب کر لے تو۔

﴿لَنْ شُكْرْتُمْ لَا زِيلَ لَكُمْ﴾

”اگر تم شکر کرو گے تو میں تمہیں بڑھاتا چلا جاؤں گا۔“

کے وثیقہ محکمہ اور وعدہ موکدہ والے سے اور کس بات کی توقع کی جاسکتی تھی۔ زیادہ تو نہیں لیکن اتنا حال تو ہمیں بھی معلوم ہے کہ اس امتحان سے کامیاب ہونے کے بعد شاہ عبدالرحیم کے مرشد خلیفہ ابوالاقاسم جو آگرہ میں رہتے تھے اور شاہ صاحب بھی ان دنوں آگرہ ہی میں تھے۔ خلیفہ صاحب نے شاہ صاحب کو حکم دیا کہ شاہ عظمت اللہ نامی بزرگ کے پاس جا کر حاضری

(حاشیہ پچھلے صفحہ کا)

”حکمت ہم در خاندان ماعول بود۔ چنانچہ جد بزرگوار دم فقیر دوا می کروند والد ماجد بند موقوف ساخته۔“
شاہ ولی اللہ کے بعد بھی خاندان میں کوئی جاگیر وغیرہ آئی۔ اس کے متعلق صرف امیر شاہ خاں صاحب کی امیر الروایات میں ایک روایت ہے کہ ضلع بلند شہر تحصیل سکندرہ میں حسن پور نامی ایک گاؤں اس خاندان کا تھا۔ امیر شاہ خاں نے اس گاؤں کو خود بھی دیکھا ہے فرماتے ہیں کہ اچھا خاصا بڑا گاؤں ہے ان ہی خاں صاحب کا بیان ہے کہ عمو مال گزاری وغیرہ وصول کرنے کیلئے مولانا اسماعیل شہید جایا کرتے تھے۔ ایک دفعہ مولوی موسیٰ بن مولانا رفیع الدین بھی گئے تھے۔ امیر الروایات میں دوسری جگہ یہ بھی لکھا ہوا ہے کہ ”انگریزی عہد میں شاہ اسحاق و شاہ یعقوب سے حکومت نے یہ جاگیر ضبط کر لی۔ بیان کیا جاتا ہے کہ اس دن دونوں بھائی جتنے سرور دیکھے گئے کبھی اس حال میں لوگوں نے آپ کو نہیں پایا تھا۔“ بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ گاؤں غالباً شاہ عبدالعزیز کے زمانہ میں کسی ذریعہ سے اس خاندان میں آیا تھا ورنہ اس سے پیشتر ان حضرات کا معاشی ذریعہ وہی توکل تھا جس پر سلفا عن خلف عمو مابل اللہ کا مدار رہا ہے اگرچہ ادھر کچھ دنوں سے مغرب زدوں کے فقروں سے تنگ آ کر لوگوں میں اس سے گونہ کراہیت پیدا ہوتی چلی جا رہی ہے تاہم میں صحابہ کرام کو پیش کیا جاتا ہے۔ جن کی ظاہر ہے کہ حیثیت مریدوں کی تھی لیکن مشائخ و اکابر صوفیہ جس ذات گرامی کی نمائندگی کرتے ہیں۔ سوال ان کے متعلق ہے کہ نبوت کے بعد اور فتوحات سے پہلے درمیانی زندگی حضورؐ نے جو گزاری کیا اس کے لئے آپ نے کوئی کسب اختیار فرمایا تھا اصل یہ ہے کہ مشائخ ان فتوحات سے دینی مہمات میں کام لیتے تھے اب اگر کوئی ان کو اپنے لڈائڈ نفسانی پر صرف خرچ کرتا ہے تو اس کا وہ خود ذمہ دار ہے لیکن محض اس غلط استعمال کی وجہ سے فتوحات مشائخ کے عدم جواز کا فتویٰ صادر کرنا کیا صحیح ہو سکتا ہے کچھ بھی ہو میرے نزدیک تو اس زمانہ کی چند بازیوں اور اس کی خوار یوں سے پہلے زمانہ کی فتوحات سازیوں کی عزت بہر حال بہتر تھی چند گریڈروں کی ریس میں جو مادی یا مشائخ فتوحات سے کاسد ہیں۔ استبل لون الذی حوادنی بالذی و خیر کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے۔ ۱۲ منہ

دو۔ جو سلسلہ طریقہ چشتیہ کے ایک کہنہ سال معمر ترین بزرگ اس زمانہ میں آگرہ میں تھے۔ مرشد کے بار بار اصرار کے بعد آخر ایک دن شاہ عبدالرحیم عظمیٰ اللہ شاہ صاحب نے پاس حاضر ہوئے وہ بیمار تھے۔ پلنگ پر لیٹے لیٹے باتیں کرتے رہے۔ سلسلہ گفتگو میں شاہ عبدالرحیم صاحب نے اپنا خاندانی تعلق ”شیخ عبدالعزیز شکر ہار“ سے ظاہر کیا۔

معاً عظمیٰ اللہ شاہ صاحب نے یہ سنت ہی پلنگ سے زمین پر آگئے اور شاہ عبدالرحیم کو گلے سے لگایا۔ پھر ایک سوال کیا۔ جواب پایا۔ اس کے بعد شاہ عظمیٰ اللہ صاحب نے یہ قصہ کہنا شروع کیا کہ ”میرے دادا صاحب کو شیخ عبدالعزیز شکر ہار نے وصیت فرمائی تھی اور کچھ تبرکات دیتے تھے اور کہا تھا کہ میری اولاد میں سے اگر کوئی تمہارے پاس آ کر فلاں سوال کا جواب دے تو میرے یہ تبرکات اس تک پہنچا دینا۔ یہ تبرکات دادا کے زمانہ سے اس وقت تک اسی وصیت کے ساتھ محفوظ چلے آ رہے ہیں۔ شاہ عظمیٰ اللہ نے فرمایا کہ چونکہ سوال کا جواب تم نے دے دیا اس لئے وصیت پوری کرنے کا وقت آ گیا۔ یہ کہہ کر شاہ عبدالرحیم کے سر پر انہوں نے عمامہ باندھا اور اپنے طریقہ کی اجازت بھی عطا فرمائیں۔ جب چلنے لگے تو کچھ مٹھائی اور نقد روپے بھی ساتھ کر دیئے۔ شاہ عبدالرحیم صاحب وہاں سے ان سب چیزوں کو لئے ہوئے اپنے مرشد خلیفہ ابوالقاسم کے پاس پہنچے اور مٹھائی روپے خلیفہ صاحب کے آگے رکھ دیئے۔ ماجرا بیان کیا۔ ”بہ بشاشت قلبی و تلتی کروند۔“ اور آخر میں خلیفہ ابوالقاسم نے شاہ عبدالرحیم صاحب کو یہ

۱۔ انفاں میں ہے کہ ایشاں جد اعلیٰ حضرت والد بزرگوار انداز جہت والدہ ایشاں یعنی یہ شاہ عبدالرحیم کے نانا تھے۔ شیخ عبدالعزیز کے والد کا نام حسن تھا۔ حسن کے والد کا نام طاہر تھا۔ شیخ طاہر اگرچہ اوچھ ملتان کے رہنے والے تھے لیکن شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ ”ناحیہ“ یورپ اقامت گاہ ایشاں شد۔“ یورپ سے کیا مراد ہے۔ صاف طور سے معلوم نہ ہو سکا۔ البتہ شیخ طاہر کی تعلیم اور شادی کا ذکر فرماتے دئے شاہ ولی اللہ نے لکھا ہے کہ تحصیل علم ایشاں بہ بلدہ بہار کہ مجمع علماء بود“ میں ہوئی اور نہ بعد فراغت قاضی بہار صبیحہ خود ایشاں را داد“ شاہ عید الحق محدث دہلوی نے اختیار الاخیار میں لکھا ہے کہ شیخ طاہر از ملتان بہ طلب علم بایں دیار افتاد و مدت در بلدہ بہار سکونت کرد و پیش شیخ بدھ حقانی تحصیل علم نمود و ہم در بہار شیخ حسن از خلوت عدم یہ مہمان سرائے وجود رسید۔“ صفحہ ۱۹۵۔ جس کے یہی معنی ہوئے کہ شاہ عبدالرحیم کے نانا کے والد بہار ہی میں پیدا ہوئے تھے اور غالباً ”قاضی بہار“ جس کی لڑکی سے شیخ طاہر کی شادی ہوئی وہ شیخ بدھ حقانی“ ہیں۔ واللہ اعلم بالصواب ۱۲۔

آخر میں شیخ عبدالعزیز اپنے مرشد قاضی ظفر آبادی کے حکم سے دلی آئے اور موسس قوانین ارشاد گشت ۱۲۔

بشارت سنائی:-

﴿اشارت بہ جمعیت ظاہر و عمامہ اشارت بہ اجازت و جمعیت باطن﴾
 ”روپیہ تو ظاہر حال کے اطمینان اور فراغ بالی کی طرف اشارہ ہے اور عمامہ
 باطنی اطمینان اور فراغ بالی اور اجازت کا اشارہ ہے۔“

اس جمعیت ظاہر کی بشارت کے بعد خود شاہ عبدالرحیم کا بیان ہے کہ معاشی پراگندگی کا
 سوال ان کی زندگی میں سرے سے کبھی پیدا ہی نہیں ہوا۔ اور نہ ”جمعیت باطن کی اس خوشخبری
 کے بعد انہیں“ معازی حیات“ کے لئے کبھی دشواری اٹھانی پڑی۔ ”فتوحات“ کی یہی شکل کہ
 دل سے نکال دینے کے بعد آنکھوں کے سامنے آئے تب تو واقعی فتوحات ہیں لیکن جو لوگ بہ
 ظاہر ان سے آنکھیں چراتے ہیں لیکن ان کے دلوں میں چوبیس گھنٹے ان ہی فتوحات کے بت
 براجمان ہیں۔ یہی ہوتا یہ فتوحات نہیں عقوبات ہیں۔ قرآن کی اس آیت کا ایک مصداق اگر یہ
 ”فتوحات“ بھی ہو تو کیا تعجب ہے۔

﴿ان کثیرا من الاجار والرهبان لیاکلون اموال الناس بالباطل
 ویصدون نسیئہ سبی اللہ والذین یکنزون الذهب والفضة ولا
 ینفقو نہافی سبی اللہ فبشرهم بعذاب الیما یوم یحییٰ علیہا فی
 نار جہنم فتکویٰ بہا جہاہم و ظہورہم ہذا ما کنزتم
 لانفسکم ندوقوبما کنتم تکنزون﴾

”قطعاً بہت سے اجار (علماء یہود) اور رہبان (مناخ نصاریٰ) لوگوں کے
 مال باطل راہ سے کھاتے ہیں اور روکتے ہیں۔ اللہ کی راہ سے اور جو سونے
 چاندی کو سنیت سنیت کر رکھتے ہیں اور اللہ کی راہ میں اسے خرچ نہیں کرتے
 ایسے لوگوں کو دکھ بھرے عذاب کی بشارت سنا دو جس دن تپایا جائے گا۔
 چاندی سونے کو جہنم کی آگ پر پھر داغی جائے گی۔ پیشانی ان کے پہلو اور
 ان کی پیٹھ یہ وہی ہے جو تم نے جمع کیا تھا اپنے لئے پس لو چکھو عذاب اس کا
 جو جمع کیا تم نے انفاس العارفین اور بعض دوسری کتابوں میں شاہ عبدالرحیم کی

جس صاف ستھری زندگی کے پڑھنے سے دل کو راحت ملتی ہے۔
 اسی سے اندازہ ہوتا ہے کہ ”ولی اللہی حقیقت“ دراصل قدرت کے اس قانون کا مظہر
 ہے جو کسی شاعر نے کہا ہے۔

کذا لک تنساع یسنة هو عرتھا
 وحسن نبات الارض من کرم البذر

﴿شاہ ولی اللہ کی ولادت سے پہلے شاہ عبدالرحیم کو ان کے کمالات کی بشارت﴾
 بلکہ شاہ ولی اللہ نے خود بھی اور دوسروں نے بھی لکھا ہے کہ شاہ ولی اللہ اور ان کے کمالات
 و مقالات کی بشارت شاہ عبدالرحیم کو پہلے سے مل چکی تھی۔ ایک واقعہ انفاس العارفین میں درج
 ہے اس سے تو معلوم ہوتا ہے کہ محض شاہ ولی اللہ کی ولادت کیلئے شاہ عبدالرحیم نے کسی غیبی اشارہ
 کے ماتحت ہی ساٹھ سال کی عمر میں دوسری شادی کی تھی بعض لوگوں کو اس پر اعتراض بھی ہوا
 کہ:-

﴿دریں عمر کدخدائی مناسب نہ بود﴾
 ”اس عمر میں شادی مناسب نہ تھی۔“
 شاہ عبدالرحیم نے سن کر فرمایا کہ:-

﴿مدتے دراز از عمر من باقیست و فرزند ان بوجود خواہند آمد﴾

”میری عمر کا بڑا حصہ ابھی باقی ہے اور انشاء اللہ چند لڑکے ابھی اور پیدا ہوں گے۔“

شاہ ولی اللہ صاحب لکھتے ہیں کہ اس کے بعد والد سترہ سال زندہ رہے اور دو لڑکے
 حضرت کے تولد ہوئے۔ جن میں ایک خود شاہ صاحب ہیں اسی طرح انفاس ہی میں ہے کہ تہجد
 کی نماز شاہ عبدالرحیم اور شاہ ولی اللہ صاحب کی والدہ پڑھ رہی تھیں۔ نماز کے بعد شاہ عبدالرحیم
 نے دعا کے لئے ہاتھ اٹھایا اور بیوی صاحبہ سے آمین کہنے کیلئے کہا دعا ہو رہی تھی کہ ابھی شاہ ولی
 اللہ عالم وجود میں آئے تھے۔ بہر حال عین دعا کی حالت میں

﴿درمیاں ابشانان دو دست دیگر ظاہر شد﴾

”ان دونوں کے درمیان میں دو ہاتھ اور ظاہر ہوئے۔“

شاہ عبدالرحیم نے فرمایا کہ:-

﴿ایں دوست فرزند مانند﴾

”یہ دونوں ہاتھ ہمارے لڑکے کے ہیں۔“

شاہ ولی اللہ فرماتے ہیں کہ سات سال کی عمر میں اپنے والدین کے ساتھ نماز تہجد میں ٹھیک اسی شکل کے ساتھ دعا کرنے کا موقع میسر آیا۔ وہذا تاویل رویائی قد جعلہ ربی حقاً۔ شاہ ولی اللہ جس لئے پیدا ہوئے تھے اس کا اشارہ بچپن ہی میں ان کے والد نے ایک خاص طرز سے فرمادیا تھا۔ خود ہی لکھتے ہیں۔

﴿ایں فقیر بہ موافقت احیاء و اقرباء روزے بہ ثفرج بوستانے رفت چوں باز آمد حضرت ایثاں فرمودند اے فلا نے دریں شبانہ روز چہ حاصل کردی کہ باتو باقی ماند۔﴾

”فقیر اپنے دوست احباب اور بعض عزیزوں کے ساتھ ایک دن ایک باغ کی سیر کو گیا جب واپس ہوا تو حضرت (والد) نے فرمایا۔ اے فلاں رات دن میں تم نے کیا چیز حاصل کی جو تمہارے ساتھ باقی رہے؟“

”چہ حاصل کردی کہ باتو باقی ماند“ والد بزرگوار کے سوال کا یہی تیر تھا جو سعادت مند فرزند کے قلب صالح میں جا کر ترازو ہو گیا اور ایسا ترازو ہوا کہ پھر عمر بھر نہ نکلا۔ خود فرماتے ہیں:-

﴿بجز دایں کلام دل فقیر از تفرج بوستانہا سر و شد باز مثل ایں داعیہ بوجہ دنیا مد﴾
”بس اتنی بات کے سننے کے ساتھ ہی فقیر کا دل باغوں کے سیر سپاٹے سے سرد ہو گیا۔ پھر کبھی اس قسم کی خواہش پیدا نہ ہوئی۔“

﴿کل اکسٹھ ۶۱ سال کی عمر میں شاہ ولی اللہ کا محیر العقول کام﴾

اور واقعہ یہ ہے کہ کل اکسٹھ سال کی عمر میں شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے ”از تو باقی ماند“

والے جو کام کئے ہیں کم از کم ہندوستان کی اسلامی تاریخ میں اس کی نظیر موجود نہیں ہے لکھنے پڑھنے کے بعد ”از تو باقی ماند“ کے خدمات کا یہی ذوق تھا جس نے ان کو اس دھارے میں بہتے ہوئے نہ چھوڑا۔ جس میں ان کے ابناء عصر تقریباً ہر طبقہ کے بہہ رہے تھے۔ جس کی وجہ کچھ نہ حضرت کے والد کی تربیت تھی۔ ماسوا اس کے شاہ صاحب فطرتاً ”رسم عام“ کی پابندی سے نفور تھے۔ حتیٰ کہ ائمہ مجتہدین تک کی تقلید جس پر انہوں نے اپنی مختلف کتابوں میں مختلف حیثیت میں محض خوش اعتقادی کے طور پر نہیں بلکہ تحقیقی نقطہ نظر سے زور دیا ہے لیکن بایں ہمہ اپنے فطری میلان کا حال بیان کرتے ہوئے ایک جگہ لکھتے ہیں کہ:-

﴿و جبلتی تابی التقليد و نائف منه راساً﴾ (فیض الحرمین)

”تقلید سے میری جبلت اور سرشت انکار کرتی ہے اور بالکل اس سے بھڑکتی ہے۔“

مگر وہی آپ کی ”نسبت اولیٰ“ اس فطری میلان کے صحیح استعمال میں کام آئی خود فرماتے ہیں کہ حضرت رسالت پناہی صلی اللہ علیہ وسلم سے مجھے براہ راست جن امور کی وصیت کی گئی (جن میں سے ایک کا ذکر پہلے کر چکا ہوں) ان میں ایک چیز یہ بھی تھی کہ:-

﴿التقلید بهذه المذاهب الاربعة لا اخج منها والتوفیق ما استطعت﴾

”ان چار مذاہب مروجہ کی تقلید سے کبھی باہر قدم نہ رکھوں اور جہاں تک ممکن ہو سب میں تطبیق کی کوشش کروں۔“

پھر شاہ صاحب ترک تقلید کے متعلق اپنے نفسی میلان اور طبعی رجحان کا ذکر کرنے کے بعد اپنی مجبوری کو اس طرح بیان فرماتے ہیں کہ:-

﴿ولکن طلب منی التعبد به بخلاف نفسی﴾

”لیکن میں کیا کروں کہ میرے اقتضائے نفسی کے خلاف ان مذاہب اربعہ کی

پابندی ہی کا مجھ سے مطالبہ ہے اور اس بارے میں مجھے سر نیاز جھکا دینے ہی کا حکم ہے۔“

آگے چل کر اپنے میلان نفس بسوئے عدم تقلید اور وصیت نبوی دربارہ اختیار تقلید کے اصل راز کے متعلق صرف اتنا فرماتے ہیں کہ:-

﴿وہہنا نکتۃ طویۃ ذکرہا وقد تفتنت بحمد اللہ بسر ہذہ

الجبلة وهو الوصاة﴾ (فیوض ص ۶۵)

”یہاں ایک باریک راز ہے جس کے ذکر کو میں نے بالقصد قلم انداز کر دیا ہے

اور خدا کا شکر ہے کہ اپنی فطرت اور آنحضرتؐ کی اس وصیت کے اس راز کو

میں نے سمجھ لیا ہے۔

جب شاہ صاحب نے ہی اس نکتہ کا ذکر نہیں فرمایا تو میں کیا کہہ سکتا ہوں۔ لیکن اتنی بات

تو سمجھ میں آتی ہے کہ آپ کے اس فطری میلان اور طبعی رجحان کا یہ نتیجہ ہوا کہ آپ کے سامنے دو

چیزیں مسلسل آتی رہیں۔ جن سے آپ کے معاصرین غافل تھے۔ سب سوئے ہوئے تھے۔

لیکن خدا نے آپ کو بیدار رکھا۔ اسلام اور مسلمانوں کی جو حالت اس ملک میں ہو رہی تھی۔ اس

کے تمام پہلوؤں پر آپ کی نظر پہونچی۔ دماغ نے مخلصی اور نجات کی راہ ڈھونڈنی شروع کی۔ یہ

ہو سکتا تھا کہ کفر کے اس غلبہ و استیلا اور ارباب حکمت کی خود غرضیوں اور نااہلیوں کو دیکھ کر آپ

آستین چڑھا لیتے اور ایک آستین چڑھا کر ”الجہاد ثم الجہاد“ کا نعرہ لگا کر مسلمانوں کی کسی

جماعت کو اپنے ساتھ لے کر سیاسی کشمکش میں مبتلا ہو جاتے اور جب دنیا کے نام پر مختلف گوشوں

سے مختلف قوتیں اپنے گرد لوگوں کو جمع کر رہی تھیں تو دین کے نام پر نیم مردہ مسلمانوں کو بھی کیوں

نہ زندہ کیا جاسکتا تھا۔ خصوصاً جب ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ شاہ صاحب کا خاندانی تعلق جس قبیلہ

اور نسل سے تھا۔ علم و تصوف کے ساتھ اس خاندان کے لوگ فوجی کاروبار میں بھی یگانہ روزگار

تھے بلکہ شاہ عبدالرحیم سے پہلے تو شاہ صاحب کے خاندان میں علم و تصوف کی محض ثانوی حیثیت

تھی۔ اصلی کام اس خانوادہ کا جہاد ہی تھا۔

﴿(جملہ معترضہ) شاہ صاحب کے جدا مجد شاہ

وجیہ الدین کی تاریخی شجاعت﴾

آپ کے براہ راست جدا مجد یعنی شیخ وجیہ الدین کے واقعات تو خود شاہ صاحب نے اپنی مختلف کتابوں میں درج کئے ہیں۔ جن کو سن کر حیرت ہوتی ہے۔ عالمگیر کی فوج جب شاہ شجاع سے نبرد آزما ہوئی اور شجاع نے ہاتھیوں سے حملہ کیا تو شاہ صاحب کے ان دادا ہی نے گھوڑے پر بیٹھ کر ان زرہ پوش ہاتھیوں پر حملے کئے اور ان کی سوئڈ کاٹ ڈالی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بھگوڑے ہاتھیوں نے شجاع ہی کی فوج کو کچل کے رکھ دیا۔ ایک اور موقع پر مسلسل تین مرد میدان راجپوتوں کو ایک ایک وار سے ختم کیا۔ یہ تینوں راجپوت حقیقی بھائی تھے قتل ہونے کے بعد ان کی ماں شیخ وجیہ الدین سے آکر ملی اور اپنا منہ بولا بیٹا بنایا۔ جسے شاہ وجیہ الدین نے بھی تسلیم کر لیا۔ شاہ عبدالرحیم صاحب فرماتے تھے کہ۔

﴿سن بارہا بخانہ فتم اور اجده می گفتم ودے در شفقت دقیقه فردی گزاشت
بلکہ من جدہ خود را ندیدہ بودم و در صغری دانستم کہ مرا بجز این عجوزہ جدہ دیگر
بودہ است۔﴾

”بارہا میں اس بڑھی کے گھر جاتا تھا۔ اور اس کو میں دادی دادی کہتا تھا وہ بھی مہربانی اور شفقت میں کوئی دقیقہ نہ اٹھا رکھتی تھی بلکہ اپنی واقعی دادی کو چونکہ میں نے نہیں دیکھا تھا اس لئے بچن میں اس بڑھی کے سوا میں اپنی دادی کسی اور کو نہیں جانتا تھا۔“

ایک مشہور بہادر سید شہاب الدین نے آپ سے بد معاہدگی کی۔ شاہ عبدالرحیم کا بیان ہے کہ میرے والد نے اسے ایک طمانچہ رسید کیا۔ جس سے وہ بے ہوش ہو کر گر گیا۔ بہر حال شیخ وجیہ الدین کا مدت العمر مشغلہ یہی فوجی خدمت تھی۔ اگرچہ آخر عمر میں نوکری چھوڑ دی تھی۔ لیکن بڑھاپے میں پھر گھوڑا خرید کر جہاد کیلئے دکن روانہ ہوئے اور راہ میں شہادت میسر آئی۔ بیان کیا جاتا ہے کہ جس پر بائیس گہرے زخم تھے۔ سر کٹ جانے کے بعد بھی ایک غلیل کی زد تک

آپ کی بے سرلاش دشمن کا تعاقب کرتی رہی۔ تقریباً یہی حال شاہ ولی اللہ نے اپنے پردادا معظم کا لکھا ہے اور پشت ہاپشت تک ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ خاندان فوجی مہمات میں نام آور اور دیدہ و زر ہا ہے۔ شاہ ولی اللہ خود اپنے والد کے متعلق لکھتے ہیں کہ۔

﴿ایشاں باخلاق سلیمہ مرضیہ از شجاعت و فراست و کفایت و غیرت بوجہ اتم متصف بودند﴾

”حضرت دیگر اخلاق سلیمہ پسندیدہ کے ساتھ شجاعت بہادری اور غیرت و غیرہ صفات سے بوجہ اتم موصوف تھے۔“

اگرچہ شاہ عبدالرحیم صاحب کو فوجی خدمت انجام دینے کا کوئی موقع اپنے اسلاف کے مطابق نہ ملا لیکن اس فقرہ سے ان کی شجاعت اور بہادری کا حال بھی معلوم ہوتا ہے۔ اور خود شاہ ولی اللہ صاحب کے متعلق تو مشہور ہی ہے کہ ترجمہ قرآن کی بنیاد پر دلی کے بعض پرانے خیال کے مولویوں نے جب آپ سے اختلاف کیا اور اختلاف کو اس حد تک پہنچا دیا کہ عوام میں کافی بدظنی و برہمی پیدا ہوئی۔ اسی سلسلہ میں بیان کیا جاتا ہے کہ فتح پوری کی مسجد میں تقریباً سو سو سو لچوں اور بد معاشوں کو لے کر بعض ملاؤں نے آپ کو گھیر لیا۔ شاہ صاحب کے ساتھ صرف چند رفقاء اور آپ کے ہاتھ میں صرف ایک پتلی لکڑی تھی۔ اس لکڑی کو لے کر اس خونی مجمع میں جو باضابطہ تلواروں اور دوسرے ہتھیاروں سے مسلح تھا۔

”غیر معمولی جوش کی حالت میں اللہ اکبر کا ایک نعرہ مارا اور اس جماعت کو چیرتے پھاڑتے نکلے چلے گئے۔“ (حیات طیبہ)

یوں بھی شاہ صاحب کو سیاسی مسائل اور حکومتی نظامات کے متعلق جو دلچسپی تھی۔ اس کا اندازہ ان کی مختلف کتابوں مثلاً ازالۃ الخفا اور حجتہ اللہ وغیرہ کے سیاسی مباحث سے ہوتا ہے۔

۱۔ سیرت سید احمد شہید کے مقدمہ میں علامہ سید سلیمان ندوی بد ظلمہ نے شاہ عبدالرحیم صاحب ہی کے تذکرہ میں ارتقا فرمایا ہے کہ

”شاہ عبدالرحیم کے مجاہدانہ جذبات کا پتہ ان کے خطوط سے ملتا ہے ان کے مکاتیب کا ایک نسخہ جامع عثمانیہ حیدرآباد کے کتب خانہ میں میری نظر سے گزرا ہے اس میں ان کا خط نظام الملک آصف جاہ اول کے نام سے ہے جس میں انہوں نے نواب مرحوم کو مرہٹوں سے جہاد کی ترغیب دی ہے۔ ۱۲ منہ

سیاسیات میں ان کی رائے کتنی عمیق اور دور رس ہے۔ افسوس ہے کہ اس کے لئے مستقل مضمون کی ضرورت ہے جس کی یہاں گنجائش نہیں۔ شاہ صاحب کے عام متداول کتابوں میں اس کا کافی مواد موجود ہے۔ کوئی چاہے تو ان کو موجودہ اصلاحات اور تعبیروں کے قالب میں ڈھال کر بیان کر سکتا ہے۔ ممکن ہے کہ اگر فرصت ہمدست ہوئی تو شاید اس کام کو میں ہی کبھی انجام دوں۔ بالفعل صرف ان کی طرف اشارہ کر کے میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ باوجود ایسے ماحول اور اسباب کے شاہ صاحب نے سنائی اور سیفی مجاہدہ کی راہ کیوں اختیار نہیں کی۔ یہ تو قطعاً غلط ہے کہ وہ اس مسئلہ کے متعلق جس پر ماضی اے یوم القیمہ (یعنی جہاد کا قانون قیامت کے لئے نافذ ہے) کی مہر نبوت کندہ ہے۔ اس قانون کو شاہ صاحب خدا نخواستہ کسی خاص زمانہ تک محدود سمجھتے تھے۔ بلکہ اپنے اجداد کے حالات کو درج فرماتے ہوئے جہاں اپنے جد امجد کی بہادری کے واقعات لکھنے لگے ہیں۔ تو اس سے پہلے آپ نے یہ بھی ارقام فرمایا ہے۔

﴿کہ چندے ازیں باب دریں کتاب می نویسم کہ تمجیے باشد اہل ایں﴾
 ”چند واقعات میں اسی لئے اس کتاب میں درج کرتا ہوں تاکہ اس خاندان کے لئے وہ بیداری کا پیغام اور سبب ہوں۔“

اور کون کہہ سکتا ہے کہ دوسری ہی پشت میں حضرت شاہ صاحب کے گھرانے سے جو وہ مرد غازی مولانا اسمعیل شہید اٹھے اور ایک مدت تک بجائے قلم کے تلوار کو کمر سے لگا کے رکھا تا ایں کہ اسی راہ میں بالآخر جان عزیز بھی نذر کی۔ یہ شاہ صاحب کی کسی اندرونی تربیت کا نتیجہ نہ تھا۔ جس کا رواج ان کے خاندان میں چلا آ رہا تھا۔

باوجود ان تمام باتوں کے پھر بھی میں صحیح طور پر نہیں کہہ سکتا کہ شاہ صاحب نے آخر یہ راہ خود کیوں اختیار نہیں فرمائی۔ مجھے اب تک ان کے کلام میں کوئی چیز صراحتہ نہیں ملی ہے آئندہ اگر کوئی چیز ہاتھ آئی تو انشاء اللہ پیش کی جائے گی۔ بالفعل ان کے مسلک کے متعلق اس بات میں جن وجوہ تک پہنچ سکا ہوں انہیں درج کرتا ہوں۔ فیوض الحرمین میں شاہ صاحب

۱۔ حضرت شاہ صاحب نے تہذیبات الہیہ میں ایک جگہ ”جہاد بالسیف“ کے بارہ میں بھی اپنی قابلیت کو خود ہی بیان فرمایا ہے۔ ملاحظہ ہو تہذیبات ص ۱۰۷ اور وہیں سے یہ بھی معلوم ہو سکتا ہے کہ آپ نے یہ راہ کیوں اختیار نہیں کی۔ ۱۲

نے ”تحقیق شریف“ کے عنوان سے ایک مضمون لکھا ہے اگرچہ کچھ طویل ہے لیکن جب تک پورا مضمون نقل نہ کیا جائے۔ مطلب سمجھ میں نہیں آسکتا۔ میرے نزدیک شاہ صاحب نے اس مضمون میں خدمت دین کا جذبہ رکھنے والوں کیلئے خاص ایسے وقت کے واسطے جب کہ کسی وجہ سے اعلا کلمۃ الحق کے لئے ”جہاد بالسیف“ کا امکان نہ ہو کام کا پورا پروگرام پیش کر دیا ہے۔ ارقام فرماتے ہیں۔

﴿خلافت ظاہرہ للامتہ خلافت باطنہ المرحومة اسوة حسنة برسولہ صلی اللہ علیہ وسلم لا صاحب بالخلافة الظاہرة اعنی المتین باقامة الحدود وادار دوا تالجهاد و سد الثغور و اجازة الوفود و جیایة الصدقات و الخراج تفریقہا علی مستحقہا و فصل الاقضية و النظر فی الیتیمی و اوقاف المسلمین و طرقہم و مساجدہم و اشباہ هذه الامور فمن كان مشغلا بهذه الامر فسمیة بالخليفة الظاہرة لهم اسوة حسنة برسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فیما سو فی هذا الباب بالتفصیل المذكور فی کتب الحدیث و لا صاحب بالخلافة الباطنية اعنی المعتین بتعلیم الشائع و القرآن و السنن و الامرین بالمعروف و النہایین عن المنکر و الذین یصل بکلام نصرۃ الدین اما بالمجارلة کالمتکلمین او بالموعظة لخطباء الاسلام او بصحبہم کمشائخ الصوفیة و الذین یقیمون الصلوة و الحج و الذین یدلون علی طریق اکتساب الاحسان و الرغبون فی النسک و الزہد و القائمون بهذا الامرهم للذین نسیمقم بالخلفاء الباطنین لهم اسوة حسنة برسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فیما سر من هذا الباب بالتفصیل المذكور فی کتب الحدیث﴾

”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی امت مرحومہ کے لئے اسوہ اور نمونہ ہے (پھر اس نمونہ کی تقسیم یوں کرتے ہیں) ظاہری خلافت والے یعنی جو شرعی حدود اور جہاد کے ساز و سامان کی تیاری اور سرحدی علاقوں کی ناکہ بندی و حفاظت اور وفود کو اکرام و انعام دینے کی خدمت اور صدقات، محصول، مالگزاری وغیرہ کی وصولی پر ارباب استحقاق پر ان کے تقسیم، مقدمات کے فیصلے، یتیموں کی نگرانی، مسلمانوں کے اوقاف کے انتظام، نیز راستوں، سڑکوں اور مساجد وغیرہ کی تعمیر اور کسی قسم کے اور کاموں کیلئے مقرر ہیں غرض مسلمانوں میں جو ان خدمات اور مشاغل میں مصروف ہیں انہیں کو میں خلافت ظاہری قانون کے نام سے موسوم کرتا ہوں۔ ان لوگوں کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان امور کے متعلق جاری فرمایا اور حدیث کی کتابوں میں جن کی تفصیل مذکور ہے اور جو لوگ باطنی خلافت والے ہیں یعنی جو اس کام پر مقرر ہیں کہ شرائع اور قوانین اسلامی قرآن اور سنن و آثار کی تعلیم دیں اور معروف یعنی اچھی باتوں کا لوگوں کو حکم دیں بری اور منکر باتوں سے روکیں اسی طرح وہ لوگ جن کے کلام سے دین کی تائید ہوتی ہے خواہ مناظرہ اور مباحثہ کی راہ سے جیسا کہ متکلمین اسلام کا حال یا وعظ و پند کے طریقہ سے جیسا کہ اسلام کے مقررین اور خطباء جس خدمت کو انجام دیتے ہیں یا وہ لوگ جو اپنی صحبت اور توجہ و ہمت سے اسلام اور مسلمانوں کی خدمت کرتے ہیں جیسا کہ مشائخ صوفیہ کا حال ہے۔ اسی طرح جو نمازیں قائم کراتے، حج کراتے ہیں اور جو احسان (دوام حضور) کے حصول کی راہ لوگوں کو بتاتے ہیں اور زاہد و تقویٰ کی طرف لوگوں کو راغب کرتے ہیں بہر حال جو لوگ ان دینی خدمات کو انجام دیتے ہیں۔ ان ہی لوگوں کو ہم خلفاء باطنی کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی میں ان لوگوں کیلئے بھی بہترین نمونے ہیں یعنی اس باب میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

نے جو طریقہ عمل اختیار فرمایا اور حدیث کی کتابوں میں جس کی پوری تفصیل موجود ہے۔“

اس کے بعد شاہ صاحب نے خلافت کی دونوں صورتوں اور ان کے لوازم و آثار سے بحث کی ہے۔ جس کے درج کرنے کی سر دست ضروری نہیں ہے۔

شاہ صاحب کی مذکورہ بالا عبارت ہی سے یہ بات معلوم ہو جاتی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نیابت و نمائندگی اور ”خلافت“ کا انحصار محض سیاسی اقتدار کے مظاہر کی حد تک محدود نہیں ہے بلکہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کی جو نمائندگی کرتے ہیں ان کو ”خلافت“ کا ایک حصہ ملا ہے۔ جیسے سیاسی اقتدار رکھنے والوں اور حکومتی خدمات انجام دینے والوں کو بھی اس کا ایک ہی شعبہ ملتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاہ صاحب کے نزدیک قدرت نے جس کسی کو جس قسم کی خلافت اور نیابت نبوت کے مظہر بننے کا موقع عطا فرمایا ہے وہ اسی اعتبار سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نمونوں کو اپنے سامنے رکھ کر اپنے کاروبار کی تنظیم کرے اور اسی شعبہ کے اسوہ نبوی کو شمع راہ بنا کر اپنے فرائض خلافت کو انجام دے۔ گویا یوں سمجھنا چاہیے کہ اسلام نے امراء کو بھی مخاطب کیا ہے اور غرباء کو بھی تندرستوں کو بھی اور بیماروں کو بھی، احرار کو بھی اور عباد امراء کو بھی، ظاہر ہے کہ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ان سب کے فرائض بالکل یکساں ہیں بلکہ امراء جنہیں قدرت نے مال و دولت عطا کی ہے ان ہی کے ساتھ ان احکام کا تعلق ہے جو مالیات سے متعلق ہیں اور جو صحت کی دولت سے سرفراز ہیں ان ہی تک وہ احکام محدود رہیں گے۔ جن کی ادائیگی صحت کے ساتھ مشروط ہے پس اس طرح گو قرآن نے ہر قسم کے احکام کی تبلیغ کی ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی جامع زندگی سے تقریباً ہر حکم کے متعلق تشریح کے نمونے پیش فرمائے ہیں لیکن اس کا مقصد یہ نہیں ہے کہ قرآن کہ ہر حکم اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہر نمونہ کی اتباع ہر مسلمان مساوی طور پر مجبور کیا گیا ہے بلکہ جو خوش بخت خلافت ظاہرہ کے اسباب و ادوات سے سرفراز ہیں وہ اس بات میں تکلف ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے طرز حکومت اور طریقہ سیاست کو اختیار کریں اور اس کو دنیا میں سر بلند کرنے کیلئے تدابیر عمل میں لائیں۔ علیٰ ہذا جس کسی کو خلافت باطنہ کا جو

حصہ عطا ہوا ہے وہ اسی پہلو میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اتباع کرے۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ ”تفہیمات الہیہ“ میں شاہ صاحب نے اپنے جس طرح خطاب سے مسلمانوں کو خطاب فرمایا ہے جس کا ترجمہ پہلے درج کر چکا ہوں اس میں آپ نے مسلمانوں کے مختلف طبقات کو الگ الگ کر کے پکارا ہے۔ اور بجائے اس کے کہ ہر مسلمان پر اس عام دعوت کو پیش فرماتے خصوصیت کے ساتھ ملوک اسلام کو مخاطب کر کے فرماتے ہیں۔

﴿إياها الملوك المرضى عند الملاء الاعلى في هذا الزمان ان تسلموا اليرف ثم لا تغمدوها حتى يجعل الله فرقانا بين المسلمين والمشركين و حتى يلحق مروة الكفارو الفساق بضعفا لهم لا يستطيعون لا نفسهم شياء وهو قوله تعالى وقاتلوهم حتى لا تكون فتنة ويكون الدين كله لله﴾

”بادشاہو املاء اعلیٰ کی مرضی اس زمانہ میں تمہارے متعلق یہ ہے کہ تم لواریں سونت لو۔ پھر انہیں نیام میں نہ کرو۔ جب تک اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو مشرکوں سے بالکل جدا نہ فرمادے اور کفار کے سرکش افراد نیز فساق کمزوروں میں جا کر شریک نہ ہو جائیں اور خود اپنے لئے ان میں کچھ کرنے کی سکت باقی نہ رہے۔ یہی مطلب ہے اللہ تعالیٰ نے اس قول کا جنگ کرو کافروں سے اس حد تک کہ فتنہ باقی نہ رہے اور ”دین“ ”قانون“ صرف اللہ کیلئے مختص ہو کر رہ جائے۔“

الغرض خصوصیت کے ساتھ بجائے عام مسلمانوں کے اس خطاب میں شاہ صاحب نے ملوک یعنی ان ہی لوگوں کو مخاطب کیا ہے جو کسی نہ کسی حیثیت سے سیاسی اقتدار اور عسکری قوت کے مالک ہیں پھر آپ نے ان کو صرف اس ”سلبی کام“ ہی کا مخاطب نہیں بنایا ہے بلکہ اس کے بعد حکومت کے ایجابی احکام کا مکلف بھی ان ہی کو قرار دیتے ہیں۔ فرماتے ہیں۔

﴿فاذا ظهر الفرقان فرضاء الملاء الاعلى ان تنصبوا في كل ناحية و في كل ميسره ثلثة ايام و اربعة ايام امير عاد لا ياخذ

للمظلوم حقه من الظالم و یقیم الحدود و یجتهد ان لا یحصل
 فیہم بغی و لا قتال و لا ارتداد و لا کبیرة و یغشوا الاسلام و
 تظهر شعائره و یاخذ بغرائضه کل احد و یرکل بلد
 شوكة یقدر بها علی اصلاح بلده و لا یکن له شركة یتمتع
 سببها و یضعی علی السلطان و ینصب فی کل اقلیم کبیره ایر
 یقلده القتال فقط یرکل جمعد اثنا عشر الغامن المجاہدین لا
 یخافون فی اللہ لرمة لا مم یقاتلون کل بغ و عاد فاذا کان
 ذالک فرما الملا الا علی ان یفتش خنید من النظامات
 المنزلیہ والعقود و نحره حتی لا یكون شیء الا موافق الشرع
 حتی یامن الناس من کل وجهه ﴿تہمات الہیہ ص ۲۱۶﴾

”جب مسلم و کافر میں اس طرح جدائی پیدا ہو لے تو اس کے بعد ملاء اعلیٰ کی
 رضایہ ہے کہ تم اے بادشاہ ہو! ہر علاقہ اور تین دن یا چار دن کی ہر مسافت پر
 ایک صاحب عدل امیر کو مقرر کرو۔ جو ظالم سے مظلوم کا حق لے سکتا ہو اور
 شرعی حدود قائم کر سکتا ہو اور اس کی کوشش کرے کہ ان کی طرف سے پھر سر
 کشی اور فساد پیدا نہ ہو اور ارتداد اور کبیرہ کا ارتکاب نہ کر سکیں، اسلام بالکل
 فاش اور علانیہ ہو جائے اس کے شعار کھلم کھلا ظاہر ہوں اور اپنے منصبی فرائض
 کو ہر شخص اختیار کر لے۔ چاہئے کہ ہر شہر کے امیر کے پاس اتنی قوت و شوکت
 ہو جس کے ذریعہ سے اپنے شہر کی اصلاح پر وہ قابو پاسکے۔ مگر اتنی شوکت و
 قوت اس کے پاس نہ ہو کہ ان سے خود نفع اٹھانے لگے اور بادشاہ وقت سے
 سرکشی کرنے لگے چاہئے کہ ہر اقلیم (صوبہ) میں ایک بڑا امیر بھی مقرر ہو جس
 کے ذمہ فقط جنگ کی ذمہ داری عائد کی جائے کہ چاہئے کہ اس کی فوجی جمعیت
 ایسے بارہ ہزار مجاہدوں کی ہو جو اللہ کی راہ میں کسی ملامت سے خوفزدہ نہ ہوں
 اور ہر سرکش باغی سے جنگ کر سکتے ہوں جب یہ ہو چکے تب چاہئے کہ منزلی

نظامات (اور معاشری قوانین) اور عقود و معاملات کی جانچ پڑتال کی جائے اور اسی قسم کی دوسری باتوں کی (پھر ایسی صورت اختیار کی جائے) کہ کوئی بات ایسی باقی نہ رہ سکے جو شریعت کے مطابق نہ ہوتا کہ لوگ ہر لحاظ سے امن و عافیت کی زندگی بسر کرنے لگیں۔“

اس قسم کے خاص خاص خطابات اور مخصوص دعوات کا ذکر شاہ صاحب کہ کلام میں دوسرے مقامات پر بھی ملتا ہے۔ لیکن میں سر دست اسی پر اکتفا کرتا ہوں شاہ صاحب کا اس کے بعد جو مسلک متبع ہوتا ہے میں اب اس کی اس سے زیادہ تصریح نہیں کرنا چاہتا اور نہ اب مزید کی ضرورت ہے۔

﴿سیاست اور اسلام کا واقعی تعلق شاہ صاحب کی نظر میں﴾

آج جب دنیا کا ہر طبقہ ایک قسم کے سیاسی بحران میں مبتلا ہے اور انسانیت کے اول و آخر ظاہر و باطن میں اب بجز سیاست کے اور کچھ نہیں رہ گیا ہے جس کا نتیجہ ہے کہ مسلمانوں میں بھی ایک طبقہ پیدا ہو گیا ہے جو اسلام کو صرف سیاست اور ”سیاست“ کو صرف ”اسلام“ قرار دینے پر مصر ہے۔ گویا ان کے غلامان کے نزدیک ہر شخص کے اسلام و ایمان دینی خدمات کی بھلائی و برائی کا سارا دار و مدار اسی پر رہ گیا ہے۔ ان کے خیال میں اب ”خیر“ بلکہ ایمان بھی صرف اس میں ہے جو موجودہ سیاسی قصوں میں اپنا کچھ نہ کچھ پارٹ ادا کرتا ہو اور جو بنے چارے کسی وجہ سے (اگرچہ آج کل کی سیاست کی گندگی ہی کی وجہ سے) ان ”سیاسی مشاغل“ سے محروم ہیں خواہ دوسرے نقطہ نظر سے یعنی شاہ ولی اللہ کی اصطلاح میں خلافت باطنیہ کی راہ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اسوہ حسنہ کے بہترین نمونے کیوں نہ پیش کرتے ہوں۔ وہ بزدل، ناکارہ اور بعضوں کے نزدیک تو مخدول و مردود ہیں۔ بلکہ ان کی موت بھی ان کے خیال میں جاہلیت کی موت ہے اور ان کی زندگی بھی جاہلیت کی زندگی ہے۔

مجھے اس سے بحث نہیں کہ ارباب سیاست کا یہ اجتہاد واقعی اسلامی نصوص و نبوی آثار و سنن اور فقہاء اسلام کے مجتہدات پر کس حد تک منطبق ہے بلکہ کہنا یہ ہے کہ حضرت شاہ ولی اللہ کا نقطہ نظر

جیسا کہ ان کی مذکورہ بالا تصریحات سے معلوم ہوتا ہے اس باب میں جو ہے اس کو دیکھ کر کیا یہ حضرات اپنے اس طرز عمل میں کچھ تغیر فرما سکتے ہیں؟

اسی طرح جو لوگ ہندوستان یا بیرون ہند کی بعض بچی کھچی ملوک اور سیاسی قوتوں کے بالکل استیصال یا فک کل نظام کا مشورہ محض اس لئے دے رہے ہیں کہ ان کے یہاں مغربی نظامات اور عقود و معاملات یا دوسرے لفظوں میں بعض معاشرتی اور معاشی قوانین ایسے مروج ہیں جو شریعت اسلامیہ کے دفعات پر منطبق نہیں ہیں۔ اگرچہ زیادہ تر ان مشوروں کا محرک اس زمانہ میں شریعت کا درد نہیں بلکہ مغربی مکاتب خیال میں سے کسی مکتب خیال کے تاثر و انفعال کا یہ نتیجہ ہے خواہ اس تاثر کا دماغوں کو شعور ہو یا نہ ہوتا ہم یہ مان بھی لیا جائے کہ ”انقلاب“ بالکل انقلاب کے ان نقیبوں کی چیخ و پکار کے پیچھے شریعت محمدیہ ہی کا درد اور اسی کے اعتلاء کا صادق جذبہ کار فرما ہے لیکن سوال یہ ہے کہ شاہ صاحب نے دعوت کی جو ترتیب پیش کی ہے اور یہی آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے طرز عمل سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے عیسائی بادشاہوں اور مجوسی ملوک و عظماء کو شروع ہی میں شریعت کے منزلی نظامات اور عقود و معاملات کی پابندی کی دعوت نہیں دی اور نہ ان کے جمہوری یا شخصی نظامات حکومت کی تبدیلی کا ابتداء مطالبہ کیا۔ بلکہ آپ کی اول دعوت توحید اور اسلام تھی۔ یقیناً حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہی نقطہ نظر تھا کہ اگر وہ اسلام کو قبول کریں گے تو ان کی زمین جا سید ادا اموال و خراج سے فوری طور پر کوئی تعرض نہ کیا جائے گا۔ البتہ بتدریج ان کے معاشرتی اور معاشی مفاصل کی اصلاح کی جائے گی۔ آخر نجاشی ابی سینا کا عیسائی باشندہ جیسا کہ کہا جاتا ہے۔ مسلمان ہو گیا تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کے ساتھ جو طرز عمل اختیار فرمایا تھا۔ کیا ہمارے لئے کوئی اسوہ حسنہ نہیں ہے؟ کیسی عجیب بات ہے کہ آج جن علاقوں میں مسلمانوں کو تھوڑی بہت سیاسی قوت خواہ وہ کسی حال میں ہو باقی ہے مسلمانوں کو ان کے متعلق مشورہ دیا جاتا ہے کہ ان حکومتوں کے بعض معاشرتی اور معاشی قوانین چونکہ شرعی قوانین سے مختلف ہیں۔ اس لئے چاہیے کہ ان کا تختہ الٹ دیا جائے اور کوئی مسلمان ان کے ساتھ کسی قسم کی ہمدردی نہ رکھے ان کا وجود عدم برابر ہے اور پھر اسلام کے ان احکام و ادا امر جن کی تعمیل کیلئے خلافت ظاہرہ یا سیاسی قوت کی ضرورت ہے۔ عمل

پیرا ہونے کا مطالبہ ان غریب مسلمانوں سے کیا جائے۔ جو بے چارے قدرتنا ان کی سرانجامی سے مجبور ہیں گویا اس کے معنی یہ ہوئے کہ امراء چونکہ اپنے اموال شرعی طریقوں پر خرچ نہیں کرتے۔ اس لئے بجائے اس کے

﴿اس باب کی ایک اور غلطی پر انتباہ﴾

ایسے ہی میرے خیال میں جو لوگ آج کل یہ تعبیر پھیلا رہے ہیں کہ اسلام صرف حاکموں کا مذہب ہے۔ محکوم ہو کر زندہ رہنے کی اسلام میں گنجائش نہیں ہے اور دلیل میں اسلام کے ان قوانین وادامہ کو پیش کرتے ہیں۔ جو بغیر حکومت کی قوت کے سرانجام نہیں پاسکتے۔ ان کی مثال ایسی ہے کہ زکوٰۃ و عشر کے احکام دکھا کر اعلان کر دیا جائے کہ غریب ہو کر جینے کی اسلام میں قطعاً گنجائش نہیں یا روزہ حج وغیرہ کے فرائض کو دیکھ کر دعویٰ کر دیا جائے کہ بیماروں اپاہجوں کے وجود کا اسلام روادار نہیں کیونکہ غریب اسلام کے اہم احکام مثلاً ”اتوا الزکوٰۃ“ کی پیما ”قلیصمہ“ ”با“ ”لله علی الناس حج البیت“ کی تعمیل نہیں کر سکتا۔ میرا ہرگز اس سے یہ منشاء نہیں ہے کہ اسلام کو محکومی مطلوب ہے یا حکومت و اقتدار کو اسلامی نظامی میں کوئی خاص اہمیت حاصل نہیں ہے۔ نیز یہ بھی میرا مطلب نہیں ہے کہ جو مسلمان امراء اسلامی و دینی نظام اور اسلامی احکام کے پابند نہیں ہیں۔ ان کے اس حال کی اصلاح کی بھی ضرورت نہیں ہے۔ بلکہ میرا مطلب صرف اس قدر ہے کہ دوسرے معاملات کی طرح ان چیزوں میں بھی غلو نہ کیا جائے اور مغربی احوال و تحریکات سے متاثر ہونے اور ان کے طریق کا اتباع کرنے کے بجائے۔ اسوہ حسنہ نبویؐ ہی کو ان کاموں میں بھی شمع راہ بنایا جائے۔ میں یہاں ان معاملات میں اپنی کوئی خاص رائے پیش نہیں کر رہا ہوں۔ اور سچی بات یہ ہے کہ ان امور میں کسی رائے کے قائم کرنے کا مجھے مقام بھی حاصل نہیں۔ بلکہ میں تو حضرت شاہ صاحبؒ کے کلام سے جو بات سمجھ میں آرہی ہے۔ صرف بطور تشریح اس کا اظہار کر رہا ہوں اور وہ بھی اس بنیاد پر کہ اب تک اس کے خلاف مجھے ان کی کتابوں میں کوئی دوسری چیز نہیں ملی ہے اور خود آپ کی زندگی میں بھی اس کے سوا کسی دوسرے پہلو کی شہادت نہیں ملتی۔ ممکن ہے کہ یہ میرے محدود

معلومات اور قلت فکر و نظر کا نتیجہ ہو۔ لیکن میں اب تک یہی سمجھے ہوئے ہوں کہ ”اسوۂ حسنہ نبوت کبریٰ“ کی پیروی کو شاہ صاحب صرف ”خلافت ظاہرہ“ کے اور اس کے مظاہر و آثار کے ساتھ وابستہ نہیں سمجھتے تھے بلکہ اسی کے ساتھ ان کے نزدیک اسوۂ حسنہ کی پیروی کی ایک دوسری راہ خلافت باطنہ کے ذریعہ سے بھی تھی اور انہوں نے اپنے گرد و پیش کے واقعات اپنے ماحول خود اپنی اندرونی اور بیرونی صلاحیتوں کا صحیح اندازہ کر کے بجائے ”خلافت ظاہرہ“ کے میدان میں اترنے کے ”خلافت باطنہ“ ہی کی راہ سے اسوۂ حسنہ کی پیروی کے امکانات اپنے لئے پیدا کئے اور ان ہی طریقوں سے اپنی وسعت و طاقت کی حد تک وہ اسلام اور مسلمانوں کی خدمت کیلئے آستین چڑھا کر حق تعالیٰ کی غیبی نصرتوں کے بھروسہ پر تیار ہو گئے۔ پھر اس سلسلہ میں ان کے متوازن دماغ اور معتدل مزاج نے اس کی اجازت نہیں دی کہ خلافت باطنہ کے جتنے شعبے ابتدائاً تاریخ اسلام سے ان کے زمانہ تک کھلے ہوئے تھے اور جن میں سے ہر ایک کا اسوۂ ”حقیقت جامعہ محمدیہ“ (علی صاحبہا الف سلام و تحیہ) میں پایا جاتا تھا۔ ان میں سے کسی شعبے کی واقعی قدر و قیمت کا انہوں نے انکار کیا ہو اور جیسا کہ عموماً ہر طبقہ کے غلام اور تشدد پسندوں کا عام شیوہ ہے کہ اپنے وہی کے سوا ہر ایک کے دماغ کی ترشی کا ڈھنڈورا پیٹتے رہتے ہی۔ متکلم صوفی کو خشک دماغ بتلائے مایخو لیا قرار دیتا ہے۔ صوفی متکلم کو حقائق و اسرار کی دنیا سے اندھا و محروم ٹھیراتا ہے فقیہ محدث پر تیوریاں چڑھاتا ہے۔ ایسے ہی محدث فقیہ پر تنگ نظری اور تقلید جامد کا الزام لگاتا ہے مگر حضرت شاہ صاحب سب کی تصحیح فرماتے ہیں۔ ہر ایک کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی باطنی خلافت کا حصہ دار سمجھتے ہیں۔

﴿شاہ صاحب کی جامعیت﴾

اور یہ شاہ صاحب کی ”اسی جامعیت“ اور ہمہ گیر فطر کا ثمرہ ہے جو خدائے بخشندہ نے ان کو بخشی تھی جس کا ذکر پہلے بھی آچکا ہے۔ یعنی

﴿رہیہات هذه المناتضات منی لولا ان شدة الجامعية او
تعتنی فی ذالک﴾ (فیوض الحرمین)

”اے! کہ میری فطرت میں یہ متضاد دو متناقض امور پائے جاتے ہیں لیکن کیا کروں میری ہمہ گیر جامعیت نے مجھے اس حال میں مبتلا کیا ہے۔“
 غالباً یہ ہر جہتی مناسب شاہ صاحب کو اپنے والد سے ترکہ میں ملی تھی۔ ”انفاس العارفين“ میں ایک موقع پر حضرت شاہ عبدالرحیم کے متعلق ابرقام فرماتے ہیں۔

﴿شاہ عبدالرحیم کی جامعیت﴾

﴿از ہر علم بہرہ معتمد بہ داشتند و بہ ترک مناسبت بغنے از فنون طبع ایشان رضائی داد﴾۔ (ص ۴۴)

”ہر علم سے کافی مقدار کے حصہ دار تھے اور فنون میں سے کسی فن کے متعلق مناسبت ترک کرنے پر آپ کی طبیعت راضی نہ تھی۔“

﴿شاہ عبدالعزیز کی جامعیت﴾

سنا جاتا ہے کہ حضرت شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ تک جامعیت کا یہ ذوق اس خاندان میں باقی رہا۔ ملفوظات عزیز یہ کے جامع نے تو براہ راست شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ ایک کتاب کا ذکر ہو رہا تھا۔ اس وقت حضرت نے ارشاد فرمایا۔

﴿حلمے کے دیدہ ام و یاد ہم بقدر خوردارم یک صد و پنجاہ علم است﴾
 ”جن علوم کا میں نے مطالعہ کیا ہے اور اپنی وسعت بھر مجھے یاد بھی ہیں ان کی تعداد ایک سو پچاس ہے۔“

پھر اس میں دینی علوم کی خصوصیت نہ تھی۔ خود شاہ صاحب کی زبانی اس کی تشریح منقول ہے کہ۔

﴿نصف آں مردماں سابق و نصفش دریں امت تصنیف شدہ﴾

”ان علوم میں سے آدھے تو ایسے علوم ہیں جو گزشتہ امتوں اور قوموں میں پیدا ہوئے اور نصف وہ ہیں جو اسلامی امت کی تصنیف ہیں۔“

طالب علم کا دائرہ کتنا وسیع تھا۔ اس کا اندازہ اس واقعہ سے ہو سکتا ہے جو جامع ملفوظات

سے نقل کیا ہے۔ یعنی حسب دستور شاہ صاحب پیادہ پاٹھلتے ہوئے جارہے تھے۔ کسی مکان سے گانے کی آواز آرہی تھی فرمایا ”دھناسری“ ہے۔ (یہ ہندی راگ کی کوئی قسم ہے) آگے ایمن ملتائی وغیرہ راگوں اور گیتوں کا ذکر فرماتے جاتے تھے اور آخر میں ارشاد ہو کہ:

”سابق مرادیں فن دخلے بسیار بود چنانچہ ناموراں اس فن برائے تحقیق می آمدند حالانکہ موقوف کردم لیکن می آئندہ حالاً مرا ضرری کند قلب جوش می کند و بعد ازاں مرض ہم حائل گرد۔“

”پچھلے دنوں میں اس فن (موسیقی) میں مجھے بڑا دخل تھا چنانچہ اس فن کے نامور لوگ اس فن کے مسائل کی تحقیق کیلئے میرے پاس آتے تھے۔ لیکن اب میں نے اس سلسلہ کو موقوف کر دیا ہے مگر پھر بھی لوگ میرے پاس آتے ہیں۔ مگر اب مجھے اس کا اشتعال ضرر پہنچانا ہے یعنی دل میں جوش پیدا ہو جاتا ہے اور اس کے بعد بیماری بھی حائل ہو جاتی ہے۔“

غرض ”اس خانہ تمام آفتاب است“ کا مصداق فضل و علم کا یہ گہرا بنا رہا ہے۔ سچ یہ ہے کہ اس کی نظیر ہند کیا۔ بیرون ہند کی اسلامی دنیا میں بھی مشکل سے میسر آ سکتی ہے۔ طوالت جواب حد سے زیادہ متجاوز ہو رہی ہے اس کا خوف نہ ہوتا تو کچھ دوسروں کا بھی اس سلسلہ میں ذکر کرتا۔

غلط فہمی نہ ہونی چاہیے کہ شاہ صاحب اپنی زندگی کے کس دور میں ایجاز باللہ ان مکروہات شرعیہ میں مبتلا تھے۔ ملفوظات میں ہے کہ کس نے دریافت کیا۔ میل حرام گاہے۔ فرمودہ اند ”جواب میں ارشاد فرمایا گیا۔“ ارے دوبار آچہ بود کہ در جوانی شنیدم کہ قصہ خوانی خوش گو آمدہ است بہ ترغیب احیاء قصد کردم ناگاہ آواز مزاحیہ و رقص در گوش رسید خستم کہ زیور دیوار نشست شہیدہ را ہی مقصد شوم مجرد تشستن خواب غلبہ کرو چوں چشم باز کردم صبح بود باز و گر ہمیں ماجرا پیش آمد ص ۹۹

اس سے یہ سمجھا جاسکتا ہے کہ رقص و سرود کی مجلس میں نہیں بلکہ سرود ہمسایہ کے طور پر بھی آپ اس میں شریک نہ ہوئے اسی ملاحظہ سے پہلے شاہ صاحب کا ایک فتویٰ یہ بھی ہے۔ ”از وقت شباب از رقص وغیرہ منوعات نفرت طبعی داشتم ص ۹۹۔“

لہذا مطلب یہ ہے کہ فن موسیقی کو شاہ صاحب علمی طور پر جانتے ہیں۔ ۱۲۔

بہر حال میں گفتگو شاہ صاحب کے توازن صادق اور اعتدال صحیح کے متعلق کر رہا تھا کہ اسی کی بدولت اسلام کے علمی و دینی خادموں کے ہر طبقہ کی صحیح قیمت وہ پہچان سکے۔ دوسروں کی طرح انہوں نے اپنے طبقہ کے سوا اوروں کو نا کارہ نہیں ٹھہرایا۔ ان کے نزدیک فقیہ و صوفی اور محدث و متکلم سب کے سب آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے باطنی خلفاء ہیں۔ البتہ اسی کے ساتھ ”طول آمد“ کی وجہ سے قدرتا دلوں میں جو ایک قسم کی بے حرمتی یا تساوت پیدا ہو جاتی ہے۔ اس نے ہندوستان ہی میں نہیں بلکہ دوسرے اسلامی خطوں میں بھی ہر شعبہ کو ”اسوۂ حسنہ“ کے حدود سے بہت آگے نکال دیا تھا اور اس کی شکایت شاہ صاحب کو ہر طبقہ سے ہے جس کی کچھ مثالیں ہیں اور بیان کر آیا ہوں۔

﴿علماء دین میں شاہ ولی اللہ کی امتیازی شان اور آپ کے خاص کارنامے﴾
اب تک میں جو کچھ لکھ چکا ہوں۔ ان میں متفرق و منتشر امور نے میرے دل میں اس خیال کو پیدا کیا ہے کہ عام اہل علم یا ارباب درس و تدریس و تالیف و تصنیف کے مساعی کی جو نوعیت ہوتی ہے۔ حضرت شاہ ولی اللہ کے علمی خدمات کی نوعیت ان سے مختلف ہے۔ میں نے تمہید ہی میں عرض کر دیا تھا کہ شاہ صاحب کی علمی سرگرمیوں خصوصاً ان کے تصنیفی کاروبار کے پیچھے بعض اہم مقاصد اور اغراض کم از کم مجھے چھپے ہوئے نظر آتے ہیں۔ یہ مقصد اور منصوبے ان کے دل میں جن اسباب و علل سے پیدا ہو سکتے تھے۔ دراصل اس وقت تک اجمالاً ان ہی کا ذکر کیا گیا۔ اب میں شاہ صاحب کے ”ہر منصوبے“ اور اس منصوبہ یا نصب العین کے لحاظ سے جو کام کر کے وہ چلے گئے ہیں ترتیب کے ساتھ ان سب سے بحث کرنا چاہتا ہوں۔ لیکن یہ بحث کوئی واقعی تفصیلی بحث نہ ہوگی کہ اس کا یہاں نہ موقع ہے اور نہ گنجائش، محض ان کی ایک اجمالی فہرست پیش کر رہا ہوں۔

﴿۱۔ فقہی اختلافات میں نقطہ عدل﴾

آپ کی کتابوں میں ایک بڑا ذخیرہ تالقات کا تو وہ ہے جن سے آپ کو مکروہ خانہ جنگی کو ختم کرانا مقصود ہے۔ جو پچھلے چند دنوں سے ہر مذہب کے متصلب و متعصب فقہاء کی بدولت

ملک میں شدت اختیار کرتی جا رہی تھی۔ اگرچہ یہ تو صحیح نہیں ہے جیسا کہ اس زمانہ میں مشہور کیا جا رہا ہے کہ مسلمانوں کی موجودہ زبوں حالیوں کی زیادہ تر ذمہ داری ان ہی فروعی اختلافات کی طرف عائد ہوتی ہے۔ سمجھایا جا رہا ہے کہ حنفیت، شافعییت، مالکییت و حنبلیت کے اختلافات کی نوعیت اسی قسم کی ہے۔ جیسے یورپ میں صدیوں کلیسا اور عوام کے باہمی مذہبی اختلافات کی رہی۔ حالانکہ ”چہ نسبت خاک را با عالم پاک“ کہاں یورپ کی وہ مذہبی خانہ جنگیاں جن میں کہا جاتا ہے کہ تقریباً دس لاکھ آدمی مختلف ظالمانہ طریقوں سے موت کے گھاٹ اتارے گئے۔ ہزاروں کو پھانسیاں دی گئیں، لاکھوں زندہ جلائے گئے۔ فرانس کے بار تھلمی ہنگامہ میں رومن کیتھولک والوں نے پروٹسٹنٹوں پر جو مظالم توڑے ہیں، ان کی داستان سن کر اس وقت تک انسانیت کا کلیجہ پھٹتا ہے۔ مسیح علیہ السلام کی ان مسکین بھیلروں نے زندہ بچوں کو ماؤں کے پیٹ سے چاک کر کے نکالا اور اپنے کتوں کو کھلایا۔ نودن تک پیرس کی گلیوں میں صرف خون بہتا رہا۔ دریائے سین کا پانی ان ہی کے لہو سے سرخ ہو گیا تھا۔ (القصہ بطولہا) یورپ اگر اپنے مذہب کے ان ہی نمونوں سے ڈر کر سرے سے مذہب ہی کے نام سے پناہ مانگنے لگا۔ تو واقعہ یہ ہے کہ شاید یہ کچھ بے جا بھی نہیں ہے اور موجودہ مغربی الحاد و زندقہ کی پیدائش میں مسکین سائنس اور بدنام کیمیا سے زیادہ دخل سچ پوچھے تو مذہبی نمائندوں کے ان ہی خونچکاں کارناموں کو ہے۔ اگرچہ مسلم عوام کو دھوکا دیا جا رہا ہے کہ سائنس نے یورپ میں مذہب کی چولیس ڈھیلی کر دیں۔ حالانکہ اس دھوکہ کے وہی شکار ہوتے ہیں اور ہو رہے ہیں جو نہ سائنس سے واقف ہیں اور نہ مذہب سے۔ ورنہ اہل بصیرت جانتے ہیں کہ یورپ کی موجودہ بے ایمانیوں یا ہٹ دھرمیوں کے پیچھے ان کے مذہب اور مذہبی پیشواؤں کی وہ چیرہ دستیائیں چھپی ہوئی ہیں۔ جن کے نیچے صدیوں یورپ کے عوام سسکتے رہے ہیں۔ کتنے افسوس کی بات ہے کہ یورپ کی ان ہی مذہبی خانہ جنگیوں کو بلا وجہ اسلام کے ان فروعی اختلافات پر منطبق کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ اسلام زمین کے کرہ پر آج چودہ صدیاں گزار چکا ہے۔ کیا کوئی بتا سکتا ہے کہ محض حنفی اور شافعی ہونے کے اختلافات نے ہر جگہ نہیں تو اسلامی ممالک کے کسی خاص خطہ میں بھی کبھی اس قسم کی خوفناک شکل اختیار کی ہے۔ زیادہ سے زیادہ شخص حملوں سے کبھی بڑھا ہے شیعیت اور

سہیت کے جھگڑوں سے اس وقت بحث نہیں کہ اس کا معاملہ ہی دوسرا ہے۔ میری گفتگو کا تعلق صرف ان فروغی اختلافات تک محدود ہے۔ جن کی حقیقت اور شافییت وغیرہ کے الفاظ سے تعبیر کی جاتی ہے۔ انشاء اللہ تعالیٰ اسلامی تاریخ کے اس طویل زمانہ میں کوئی ایسا اہم واقعہ ان اختلافات کی بنیاد پر پیش نہیں آیا ہے جسے یورپ کی ان خونی داستانوں کے مقابلہ میں سامنے لایا جاسکتا ہو۔

مگر جو کچھ بھی ہو اس میں شک نہیں کہ پچھلی صدیوں میں بعض خاص حالات خصوصاً اسلام کے اصلی سرچشموں یعنی قرآن و حدیث کی تعلیم سے اسلامی مدارس جس حد تک پیگانے ہوتے چلے گئے۔ بتدریج یہ اختلافات بہت غلط صورت اختیار کرتا چلا جاتا تھا۔ خصوصاً ماوراء النہر (ترکستان و خراسان) کے حنفی فقہاء کا غلو اس باب میں آہستہ آہستہ بہت آگے بڑھ گیا تھا اور ہندوستان میں وطن بنانے کیلئے اسلام جس راستہ سے آیا۔ چونکہ وہ ان ہی ممالک کا راستہ تھا۔ اس لئے قدرتا ہندوستانی مسلمانوں کی ذہنیت ان ہی ممالک کے علماء کی ذہنیت سے متاثر تھی۔ پھر جیسا کہ میں نے عرض کیا۔ نادری اور ابدالی حملوں نے جب اس ملک میں روہیلوں کے جدید عنصر کا اضافہ کر دیا تو تشدد و تصلب کی یہ شرارت دو آتشہ ہو چکی تھی۔

شاہ صاحب نے بڑی دانشمندی اور گہرے مطالعہ کے بعد فقہ اور اصول فقہ کی بنیادی سے پردہ ہٹایا۔ ائمہ مجتہدین اور ان کے اجتہادات کا جو صحیح مقام تھا۔ اسے واضح فرمایا۔ بعضوں کو تو شاہ صاحب سے شکایت ہے کہ ہندوستان میں غیر مقلدیت کی ابتدا آپ ہی سے ہوئی اور خود غیر مقلدوں کا طبقہ اس باب میں گو نہ آپ کو اپنا پیشوا مانتا ہے لیکن جاننے والے جانتے ہیں کہ اگر امت یا کم از کم ہندی مسلمانوں کے ہاتھ میں اس وقت وہ مملکات نہ ہوتے جنہیں شاہ ولی اللہ کی عرق ریزیوں نے وقف عام کیا ہے تو سرزمین نجد اور نجد سے آگے بڑھ کر حجاز میں جو تحریک ”وہابیت“ کے نام سے چل پڑی تھی اور یورپ والوں نے اپنے خاص اغراض کے تحت اس تحریک اور تحریک کے چلانے والوں کو مختلف طریقوں سے اچھالنا شروع کیا تھا واقعہ یہ ہے کہ غلامی کے ان دنوں میں جن میں ایسے کم ہیں جو اپنی زبان سے اپنی بات ادا کرتے ہوں اور اپنے دماغ سے اپنے خیالات سوچتے ہوں مشکل ہی سے غلام ہندوستان میں اس وقت

کوئی حنفی نظر آتا۔ اس میں شک نہیں کہ اندرونی طور پر مغربی دجل و کید نے جو دام بچھایا تھا اور ذم کی صورتوں میں اس تحریک کی مدح کا جو گیت مختلف لہجوں میں گایا جاتا تھا جس کا افسانہ طویل ہے اس میں بے چارے کچھ سادہ لوح ابتدا میں پھنس گئے۔ لیکن اہل علم کو معلوم ہے کہ شاہ ولی اللہ کی تحقیقی طرز عمل نے اس تحریک کو ہندوستان میں زیادہ پھلنے پھولنے نہیں دیا۔ ولی اللہ مکتب خیال کے علماء کی کوششوں کا آج یہ نتیجہ ہے کہ ”ہسنی من صدر قلیل“ کے سوا اب عمل بالحدیث کے مدعیوں کی آبادیاں اپنے اندر اور کچھ نہیں رکھتیں۔

اس سلسلہ میں حضرت کی کتابیں انصاف عقید الجید حجتہ اللہ البالغہ کے بعض ابواب، تفہیمات، ازالہ الخفاء کی بعض ضمنی چیزیں اور سب سے زیادہ موطا کی شرحوں نے حدیث فہمی کا معیار پیش کیا ہے اور فقہ و حدیث میں تطبیق کی جو راہیں اشاروں اشاروں میں شاہ صاحب نے اہل فہم کے سامنے کھول دیں۔ سچی بات یہ ہے کہ آج حنفیت ”علی بصیرۃ من ربہ“ ان ہی بنیادوں پر قائم ہے۔

ایک بڑی دانشمندی شاہ صاحب نے یہ بھی فرمائی کہ حنفی فقہ کے ساتھ ساتھ آپ نے درسی طور پر شافعی فقہ کے مطالعہ کو بھی ضروری قرار دیا ہے۔ اپنے مسلک کی تشریح میں ایک موقع پر اپنے ”الشافعی ورسا“ جو فرمایا ہے اس کا یہی مطلب ہے جو جانتے ہیں کہ حنفی اور مالکی فقہ کی حیثیت اسلامی قوانین کے سلسلہ میں تعمیری فقہ کی ہے اور شافعی و حنبلی فقہ کی زیادہ تر نوعیت ایک تنقیدی فقہ کی ہے۔ حنفیوں کی فقہ کو مشرق میں اور مالکیوں کی فقہ کو مغرب میں چونکہ عموماً حکومتوں کے دستور العمل کی حیثیت سے تقریباً ہزار سال سے زیادہ مدت تک استعمال کیا گیا اس لئے قدرتنا ان مکاتیب خیال کے علماء کی توجہ زیادہ تر جدید حوادث و جزئیات و تغریعات کے ادھیڑ بن میں مشغول رہی۔ بخلاف شوافع اور حنابلہ کے کہ بہ نسبت حکومت کے ان کا تعلق زیادہ تر تعلیم و تعلم، درس و تدریس اور تالیف و تصنیف سے رہا۔ اس لئے عموماً تحقیق و تنقید کا وقت ان کو زیادہ ملتا رہا۔ بہر حال یہ افسانہ تو دراز ہے۔ مجھے کہنا یہ ہے کہ فقہ اور اسلامی قوانین کا تعلق ان کے سر اس موقع پر ناظرین سے میں سفارش کروں گا۔ کہ جناب مفتی عبداللطیف رحمانی سابق صدر شعبہ دینیات جامع عثمانیہ مال صدر شعبہ اسلامیات جامعہ اسلامیہ علی گڑھ کی کتاب ”تذکرہ اعظم“ کا مطالعہ کریں۔ مفتی صاحب نے شاہ صاحب کی چیزوں کو اس میں بڑے سلیقہ سے جمع کر دیا ہے۔ ۱۲

چشموں یعنی کتاب و سنت سے ہے جو چاہتے ہیں کہ یہ تعلق مسلسل زیادہ تر و تازہ حالت میں رہے۔ ان کے لئے شاہ صاحب کا یہ طریقہ عمل کہ شوافع اور حنابلہ کی فقہ اور ان کے ادبیات کا بھی مطالعہ جاری رکھیں۔ بہت کچھ مفید ثابت ہو سکتا ہے یا کم از کم حدیث کے درس میں خصوصیت کے ساتھ فقہاء امصار کے خلاقیات اور ان کے وجود و دلائل کے بیان کرنے میں مسائل فقہ میں زندگی باقی رہتی ہے۔ ہر مذہب کا پیروان علل و اسباب سے واقف رہتا ہے جنکی روشنی میں اس کے امام نے اپنی رائے قائم فرمائی ہے۔ نیز چونکہ اس کے ساتھ دوسرے ائمہ مجتہدین کے دلائل و وجوہ بھی اس کے سامنے آتے رہتے ہیں۔ اس لئے قدرتی طور پر ”جاہلی حمیت“ کا زہران میں پیدا ہونے نہیں پاتا۔ عقد الجید“ میں شاہ صاحب نے ائمہ مجتہدین کے قیاسی نتائج کے متعلق بجائے اس نظریہ کے کہ حق ان میں سے ایک ہی ہو سکتا ہے۔ اس خیال کو جو ترجیح دی ہے کہ سب ہی حق پر ہیں تو فروغی اختلافات کی اہمیت کے سارے قصہ کو ختم فرما دیا ہے۔ اس باب میں شاہ صاحب کے مباحث قابل دید ہیں۔ جس قسم کا اجمال میرے پیش نظر ہے۔ اس کے لحاظ سے گنجائش نہیں ورنہ ان چیزوں کا ذکر کرنا چاہئے کہ لوگ اس کا عام طور پر مطالعہ کریں۔ اردو میں بھی اس کا ترجمہ ہو چکا ہے۔

﴿۲۔ صوفیا عصر اور تصوف کی اصلاح﴾

دوسرا ذخیرہ آپ کی کتابوں کا وہ ہے جس میں مشائخ زمانہ اور تصوف عصر کو آپ نے چونکانے کی کوشش کی ہے۔ تصوف کا کتنا ہی حصہ خالص اسلامی ہے اور زمانہ کی ضرورتوں سے جس طرح مشکلمین اسلام نے وقتاً فوقتاً غیروں کی چیزوں کو اپنی کتابوں میں شریک کر لیا تھا حتیٰ کہ شرح مقاصد و مواقف میں عنصریات و کائنات الجوتک مباحثہ درج ہو گئے ہیں۔ اسی طرح تصوف میں بھی اجنبی عناصر کا اضافہ مختلف وجوہ سے جو ہوتا رہا ہے اپنی مختلف کتابوں خصوصاً الطاف القدس، ہمعات مستطاعت (؟) وغیرہ میں اسی کی آپ نے تفصیل بیان فرمائی ہے۔ تصوف کے متعلق بھی بعض لوگوں کا خیال ہے کہ سب سے پہلے ہندوستان میں اس کے خلاف شاہ ولی اللہ ہی نے قلم بغاوت اٹھایا۔ حالانکہ معاملہ اس کے برعکس ہے۔ آج جب کہ یورپ

تحقیق و ریسرچ کے نام سے اسلامی چیزوں کو غیروں کی طرف مختلف شاطرا نہ چابک دستیوں سے منسوب کرنے میں منہمک ہے۔ اگر شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کی تحقیقی کتابیں اس وقت ہمارے پاس نہ ہوتیں تو کون کہہ سکتا ہے کہ اس دجالی ہنگامہ میں تصوف کا اسلام سے دور کا بھی رشتہ باقی رہ سکتا تھا؟

یورپ زدوں کا ایک بڑا گروہ باوجود اس کے بھی جاہلوں کو جو بہکا رہا ہے کہ اسلامی صوفیہ کے پاس اپنا کچھ نہیں ہے بلکہ مصرف اشراقیوں، عیسائیوں، صابیوں، ایرانیوں اور آخر میں ہندوستانی یوگیوں سے مختلف چیزیں لے لے کر مسلمان صوفیوں نے تصوف کی عمارت کھڑی کی ہے۔

خدا جزائے خیر دے شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کو مختلف کتابوں میں مختلف پیرایوں سے آپ نے اسلام کے حقیقی تصوف اور اجنبی اجزاء کو جدا کر کے دکھایا ہے اور اس سلسلہ میں تو آپ نے اتنا کام کیا ہے کہ جن جن چیزوں کا تصوف سے محض برائے نام تعلق تھا مثلاً جھاڑ پھونک تعویذ وغیرہ اس کے متعلق بھی آپ نے مستقل کتابیں تالیف فرمائیں۔ ”القول الجلیل“ اور ”حزب البحر“ کی شرح وغیرہ اسی سلسلہ کی چیزیں ہیں۔ اس طرز عمل کا ایک بڑا فائدہ یہ بھی ہوا کہ جس طرح نمبر ایک کی کتابوں سے حنفی و شافعی اختلافات کی شدت کم ہوتی ہے۔ ان کتابوں سے ملا اور صوفی کے جھگڑوں کا بشرطیکہ انصاف سے کام لیا جائے خاتمہ ہو جاتا ہے۔ شاہ ولی اللہ نے تصوف کے مسائل کو خالص اسلامی تعبیروں میں پیش کر کے ”مولویوں“ کی اس بھڑک کو مٹا دیا ہے جو ان بے چاروں میں صوفی و صوفیت کے متعلق پائی جاتی ہے۔

﴿۳۔ شیعہ سنی نزاع کے متعلق شاہ صاحب کا کام﴾

جیسا کہ میں نے عرض کیا ہے ہندوستان میں پہلے توراتی سنی پھر ایرانی شیعہ اور آخر میں متشد سنی روہیلوں کی شکل میں داخل ہوئے۔ ان تینوں عناصر کے امتزاج سے تسنن و تشیع کے سلسلہ میں عجب افراط و تفریط کی کیفیت پیدا ہو گئی تھی۔ شاہ صاحب نے اس سلسلہ میں بھی بڑا کام کیا۔ بڑی محنت سے ہزار ہا صفحات کو پڑھ کر آپ نے چاروں خلفاء کے واقعی حالات

”ازالۃ الخفاء“ میں ایسے دل نشین طریقہ سے مرتب فرمائے کہ اس کتاب کو پڑھنے کے بعد اگر شیعوں کی غلط فہمیوں کا ازالہ ہو جاتا ہے تو اسی کے ساتھ ان غالی سنیوں کی شدت و تیزی میں بھی کمی پیدا ہو جاتی ہے۔ جو محض اس لئے کہ شاہ عبدالعزیز نے تنہا حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے مناقب کیوں بیان کئے یا شاہ ولی اللہ نے شیعوں کی تکفیر میں فقہا حنفیہ کے اختلاف کو کیوں بیان کیا۔ ان پر بھی شیعیت کا فتویٰ صادر کر دیتے ہیں۔ اور اس کے بجائے مناظرے اور مجاذلے کے شاہ صاحب نے ایک ایسی راہ دریافت فرمائی۔ جس سے بہت سے فتنوں کا سد باب ہو گیا۔

﴿۴۔ یونانی فلسفہ کے بجائے ایمانی فلسفہ﴾

اسی سلسلہ میں شاہ صاحب نے اپنے زمانہ کے ان معقولی علماء کی اصلاح کو بھی پیش نظر رکھا ہے جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں کہ وہ لفظی گورکھ دھندوں میں مبتلا تھے آپ نے بجائے اوہا و خرافات کے قرآن و حدیث کے کلیات سے خود ایک فلسفہ تیار کیا اور جو لوگ ذہنی تمرین و تحسین کے لئے لائے یعنی خیالات میں وقت ضائع کرتے تھے۔ ان کے لئے شاہ صاحب نے فکر و غور کا ایک بڑا میدان پیش کر دیا۔ اس سلسلہ میں آپ کی سب سے بہتر کتاب ”الخیر الکثیر“ ہے۔ نیز حجتہ اللہ واللہ و البزور البازغہ کے اکثر مباحث کا رخ بھی اسی نصب العین کی طرف ہے۔ اس سلسلہ میں شاہ صاحب کے سامنے ہندوستان کی وہ مرعوب طبائع بھی ہیں جو میر باقر زاماد اور صدر شیرازی وغیرہ ایرانی لفاظوں کے بقبوقوں اور شفقوں سے متاثر ہو کر اپنی جگہ پر گویا کانپ رہے تھے۔ شاہ صاحب کی بعض کتابوں میں میر باقر وغیرہ کی عبارتوں کی جو جھلک نظر آتی ہے تو میں اس کو کوئی اتفاقی واقعہ نہیں سمجھتا۔ بلکہ میرا خیال ہے کہ آپ نے قصد اس طرز عمل کو اختیار کیا ہے اور مقصود وہی ہے جو میں نے عرض کیا۔

﴿۵۔ مغربی الحاد کے زہر کا تریاق اور امروزہ شبہات کا پیشگی جواب﴾

پانچویں چیز جو مجھے شاہ صاحب کے خدمات میں نظر آتی ہے۔ ممکن ہے کہ لوگوں کو اس بات میں مجھ سے اختلاف ہو۔ لیکن بہر حال میں یہ سمجھتا ہوں کہ انگریزی حکومت کے بعد

ہندوستان میں مذہب اور مذہبی امور کے متعلق شک وارتباب کا جو دور آنے والا تھا شاہ صاحب کے کاموں کا ایک بڑا حصہ اس سے بھی تعلق رکھتا ہے۔ خصوصاً حجتہ اللہ البالغہ اور البزؤ البازغہ میں آپ نے جو کچھ لکھا ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جو سوالات آئندہ پیدا ہونیوالے ہیں۔ ان کا جواب پہلے سے تیار کر کے ہندوستان بھی نہیں بلکہ دنیا کے مسلمانوں کو سپرد کر رہے ہیں۔ جیسا کہ میں خود لکھ چکا ہوں شاہ صاحب کے زمانہ تک انگریزی حکومت کا اثر دلی تک نہیں پہنچا تھا۔ لیکن جب بنگال اور مدراس میں ان کے قدم جم چکے تھے اور اپنے اسی اقتدار و اختیار کی قوت کو محسوس کر کے عیسائی مذہب کے پورا پورا بظاہر مغربی خیالات کو کسی نہ کسی شکل میں ملک میں پھیلانے کی تیاریاں کر رہے تھے۔ عوام کو ان کا احساس نہ ہوا ہو۔ لیکن کوئی تعجب نہیں کہ شاہ صاحب تک اس کی لہریں پہنچی ہوں۔ ماسوا اس کے جب حجتہ اللہ کے دیباچہ میں وہ خود یہ فرماتے ہیں۔

﴿بينا انا جالس ذات يوم بعد صلاة العصر متوجها الى الله از
ظهرت روح النبي صلى الله عليه وسلم وغشيتني من فوقى
بشي خيل الى انه ثوب القى على و نفث فى روعى فى تلك
الحالة انه اشار الى نوع بيان للذين و رجدت عند ذالك فى
صدرى نورالم يزل التفسيح كل حين.﴾

”کہ اس حال میں کہ ایک دن عصر کی نماز کے بعد اللہ تعالیٰ کی طرف توجہ کر کے بیٹھا ہوا تھا۔ اچانک نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی روح مبارک ظاہر ہوئی اور مجھے اوپر سے اس نے ڈھانک لیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گویا مجھ پر کوئی کپڑا اڑھا دیا گیا ہے۔ اسی کیفیت میں میرے اندر یہ بات پھونکی گئی کہ دین کی تشریح کے ایک خاص طریقہ کی طرف مجھے اشارہ کیا جا رہا ہے میں نے اپنے اندر اس حال میں ایک روشنی پائی جو لمحہ بہ لمحہ پھیلتی چلی جاتی تھی۔“

اور صرف یہی نہیں بلکہ اس کے بعد کا جو یہ فقرہ ہے کہ شاہ صاحب کہ یہ محسوس ہوا کہ۔

﴿ان الشريعة المصطفوية اشرفت فى هذا الزمان على ان

یتوزفی قمص ضالغۃ من البرہان ﴿

”مصطفوی شریعت کے لئے وقت آ گیا ہے کہ برہان اور دلیل کے پیراہنوں

میں ملبوس کر کے اسے میدان میں لایا جائے۔

آئندہ انگریزی عہد میں وسادس وادہام اوشکوک وشبہات کے جوسیہ بادل امنڈنے والے تھے۔ اگر ان کی طرف اس میں اشارہ نہیں ہے تو بتایا جائے کہ حجتہ اللہ کی تصنیف کے بعد انگریزی عہد کے سوا ایسا کون سا دور آیا جس میں ضرورت تھی کہ اسلامی شریعت کو ”دلیل و برہان“ کے پیراہنوں میں آراستہ کر کے پیش کیا جائے۔ بہر حال میرا خیال ہے اور یہ خیال شاہ صاحب کی کتابوں سے پیدا ہوا ہے کہ جو کچھ ہونے والا تھا اور مسلمانان ہند پر جو افتاد پیش آنے والی تھی۔ کسی نہ کسی ذریعہ سے شاہ صاحب کو اس کی اطلاع ہو چکی تھی اور اپنے تصنیفی کاروبار میں ان کے سامنے جہاں اور مقاصد و اغراض تھے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ آنیوالے خطرات کے انسداد کی بھی انہوں نے اپنی کتابوں میں پوری کوشش کی ہے اور میں سمجھتا ہوں وہ اپنی اس کوشش میں کامیاب ہوئے ہیں۔ جوں جوں نئی روشنی کی تاریکی بڑھتی چلی جا رہی ہے۔ حضرت شاہ ولی اللہ کی جلالتی ہوئی علمی شمع کی قیمت اسی نسبت سے بڑھ رہی ہے۔ مغربی الحاد و زندقہ کے زہر کا تریاق شاہ ولی اللہ کا کلام ہے۔ اب یہ ایک ایسی مسلم بات ہو گئی ہے کہ صرف ہندوستان ہی نہیں بلکہ مصر اور اب تو عرب و ترکی ایران و افغانستان سب ہی کو اس کا احساس ہو رہا ہے اور بحمد اللہ ان تمام اسلامی ممالک میں شاہ صاحب کی کتابیں کافی مقبولیت حاصل کر رہی ہیں چونکہ میں سردست صرف ولی اللہی کارناموں کی ایک اجمالی فہرست بتا رہا ہوں اس لئے مزید گفتگو کی گنجائش نہیں۔ انشاء اللہ اگر تفصیل کا موقعہ کبھی ملا تو یہ دکھایا جاسکتا ہے کہ آج جو کچھ پوچھا جا رہا ہے سب کے جواب سے ولی اللہ القطب الحکیم کا قلم مدت ہوئی کہ فارغ ہو چکا ہے۔

﴿۶۔ قرآن و حدیث کے تراجم کی بنیاد﴾

اور سب سے بڑا کام کم از کم میرے ناچیز خیال میں شاہ صاحب کا یہ ہے کہ سب سے پہلے ان ہی نے ہندوستان میں قرآن و حدیث کے ترجمہ کی بنیاد بڑی جرات اور ہمت سے کام لے

کر بالآخر ڈال دی تھی۔ اگرچہ خود انہوں نے فارسی میں قرآن کا بھی ترجمہ کیا۔ اور حدیث کی قدیم ترین کتاب موطا مالک کا بھی ترجمہ فارسی ہی میں کیا۔ کہ ان کے زمانہ تک غالباً اردو غام طور سے لکھنے پڑھنے کی زبان نہیں بنی تھی۔ جو بھی لکھنا پڑھنا جانتے تھے۔ وہ فارسی ہی میں لکھتے پڑھتے تھے لیکن جوں ہی کہ اردو نے قدم آگے بڑھایا اور اس راہ میں اس نے بڑی تیزی دکھائی۔ تو محض اس لئے کہ شاہ صاحب کا نمونہ فارسی میں موجود تھا۔ آپ کے صاحبزادوں میں سے حضرت شاہ عبدالقادر رحمۃ اللہ علیہ نے بامحاورہ اردو میں اور شاہ رفیع الدین صاحب نے لفظی ترجمہ کرنے کی سعادت حاصل فرمائی۔

یہ بات کہ ان حضرات کو ترجمہ کرنے کا خیال اپنے والد کے ترجمہ ہی کی بنیاد پر ہوا۔ موضع القرآن میں اس کے متعلق شاہ عبدالقادر فرماتے ہیں:-

”بندے عاجز عبدالقادر کے خیال میں آیا کہ جس طرح ہمارے بابا صاحب

بڑے حضرت شیخ ولی عبدالرحیم صاحب کے بیٹے سب حدیثیں جاننے والے

ہندوستان کے رہنے والے نے فارسی زبان میں قرآن معنی آسان کر کے

لکھے ہیں۔ اسی طرح اس عاجز نے ہندی زبان میں قرآن شریف کے معنی

لکھے۔“ ص ۲

اور ان دونوں حضرات کے بعد پھر اس وقت تک اردو میں قرآن بلکہ حدیث کے بھی جتنے ترجمے ہوئے یا آئندہ ہوں گے کم از کم ہندوستان کی حد تک اس سنت حسنہ کے تسنن کا سہرا حضرت شاہ ولی اللہ ہی کے سر بندھا ہے۔ قرآن و حدیث کے ترجمہ سے مسلمانوں کو خصوصاً ایسے زمانے میں جب اس سے ان کا وہ ملوکی اور حکومتی تعلق باقی نہیں رہا جس کی وجہ سے مسلمان تو مسلمان ماسلم بھی اسلامی زندگی کی اتباع میں فخر محسوس کرتا تھا۔ ایسے زمانہ میں ان ترجموں نے ہم مسلمانوں کے اسلام و ایمان کی حفاظت میں کیا کام کیا ہے۔ اس کا صحیح اندازہ کرنا آسان نہیں ہے اور خواہ میری یہ خوش اعتقادی قرار دی جائے یا جو کچھ بھی سمجھا جائے۔ میں تو ایسا سمجھتا ہوں کہ اس سلسلہ میں بھی شاہ صاحب کو اس مصیبت کا کسی نہ کسی حد تک اندازہ ہو چکا تھا۔ جس میں انقلاب حکومت کے بعد بیچارے مولوی اور مشائخ مبتلا ہونے والے تھے۔

میرا اشارہ اس طریقہ عمل کی طرف ہے جسے زمانہ کے ارباب تشکیک و ارتداد نے اسلام کے خلاف بڑی چالاکی سے اختیار کیا ہے وہ چاہتے ہیں کہ اسلام کی کسی تعلیم کا انکار کریں۔ لیکن ڈرتے ہیں کہ عام مسلمانوں میں سے اس سے برہمی پیدا ہوگی یا کم از کم صاف انکار اگر کر دیا جائے گا تو عوام ہمارے قبضہ سے نکل جائیں گے۔ اس لئے ”مولوی کا مذہب“ ایک لفظ تراشا گیا ہے اور ہر وہ چیز جو واقعی قرآن یا حدیث کی ہوتی ہے۔ مولوی کی طرف منسوب کر کے اس کا انکار کر دیا جاتا ہے۔ کہہ دیا جاتا ہے کہ ہم نے مولوی کے خیال کا انکار کیا ہے۔ قرآن کا انکار نہیں کیا ہے۔ حد یہ ہے کہ آج جنت و دوزخ، حور و ملائکہ، شیاطین وغیرہ ایسے حقائق کا علانیہ انکار کیا جا رہا ہے جن کے ذکر سے قرآن معمور ہے لیکن سادہ لوحوں کو کتنی دیدہ دلیری سے یہ باور کرا دیا جاتا ہے کہ ان چیزوں کا ثبوت کہیں بھی قرآن میں نہیں۔ بلکہ غبی کند فطرت مولوی ان کا قائل ہے۔ الغرض اس پردہ میں قرآن کے جس عقیدے سے چاہا جاتا ہے انکار کر دیا جاتا ہے۔

اور یہ واقعہ ہے کہ اگر اس وقت شاہ ولی اللہ قرآن و حدیث کے ترجمہ کی بنیاد ڈال کر نہ چلے جاتے اور اس وقت بھی قرآن عوام کی دسترس سے عربی زبان میں ہونے کی وجہ سے بالکل باہر ہی ہوتا تو بے چارہ ”مولوی“ اس مغالطہ کا کیا جواب دے سکتا تھا۔ صبر و سکون کے ساتھ الحاد و بے دینی کے ان طمانچوں کو برداشت کرتا رہتا اس کے لئے اس کے سوا چارہ کار ہی کیا تھا۔ لیکن بھم اللہ شاہ ولی اللہ ایک ایسا کام کر کے چلے گئے ہیں کہ جو نہیں سمجھنا چاہتے۔ ان سے تو بحث نہیں لیکن واقعی جو حقیقت کے طالب ہیں ان کے لئے..... ”مولوی کے مذہب“..... کا پرانا جال اب بیکار ہو چکا ہے۔ قرآن تمہاری زبان میں بہ شکل ترجمہ موجود ہے۔ خود پڑھ جاؤ۔ اور پڑھنے کے بعد خود انصاف کر سکتے ہو کہ مثلاً آج جس جنت و دوزخ، حور و غلمان، اشجار و انہار کا دار آخرت میں انکار کیا جا رہا ہے یہ کسی غریب مولوی کی بات کا انکار ہے یا براہ راست قرآن کا انکار ہے۔

غرض یہ ایک بڑی پر فریب و جالیت تھی جس کا قلع، قمع کم از کم انصاف پسندوں کی حد تک ہو چکا ہے اور سچ پوچھئے تو انحطاط و ناقدری کے اس زمانہ میں بے چارے مولویوں کے لئے بھی

قرآن و حدیث کے یہ تراجم آج اکسیر کا کام دے رہے ہیں۔ غربی مدارس میں ٹوٹی پھوٹی یہ ہمتوں والے طلبہ آج جو کچھ پڑھتے ہیں۔ یہ واقعہ ہے کہ ان میں ایسے بہت کم پیدا ہوتے ہیں جو بغیر ترجمہ کی مدد کے قرآن یا حدیث کا پورا مطلب خود سمجھ سکتے ہوں اگر یہ کہوں تو شاید مبالغہ نہ ہوگا کہ نوے ۹۰ فیصدی مولویوں کی آبرو محض ان ہی ترجموں کی بدولت بچی ہوئی ہے اور سچی بات یہ ہے کہ بعض زبان سے ناواقف ہونے کی وجہ سے اللہ کے بندے اپنے مالک کے براہ راست مخاطب بننے کی سعادت سے محروم تھے یا براہ راست اپنے رسول کے ملفوظات و ارشادات کے سمجھنے سے معذور تھے۔ اس نعمت کا کون اندازہ کر سکتا ہے کہ ان تراجم کی بدولت اب بھی وہ اپنے خدا کے سامنے کھڑے ہو گئے اور خود ان آنکھوں سے بغیر کسی مولوی عالم کے واسطے کے اپنے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرت طیبہ کا مطالعہ کر رہے ہیں اور جیسا کہ شاہ عبدالقادر صاحب نے لکھا ہے کہ۔

”بتانے والے بہتر بتائیں جیسا خدا تعالیٰ نے قرآن شریف میں آپ بتایا

”ہے۔ ویسا کوئی نہیں بتا سکتا اور جیسا اثر اور راہ پانا خدا کے کلام میں ہے۔

کسی کے کلام میں نہیں ہے۔

درحقیقت جو منافع ان کے تراجم کے پڑھنے سے پڑھنے والوں کو حاصل ہو سکتے ہیں اور ہو رہے ہیں۔ وہ لاکھ مولوی ملا کی زبان سے ہم نے سنیں کبھی حاصل نہیں ہو سکتے۔ بلکہ ترجمہ پڑھنے والے عوام میں ایسے کتنے ہیں جنہوں نے انہی ترجموں کی مزادلت سے آہستہ آہستہ عربی زبان سے ایسا لگاؤ پیدا کر لیا کہ براہ راست خود کلام اللہ ان کی سمجھ میں آ رہا ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ شاہ صاحب کے کارناموں میں ترجمہ کی خدمت کو میں سب سے بڑی خدمت قرار دیتا ہوں۔

اس وقت چونکہ سرسری فہرست کی حیثیت سے اس کا تذکرہ مقصود ہے۔ اس لئے بالفعل اسی پر بس کرتا ہوں۔ انشاء اللہ تعالیٰ آئندہ جیسا کہ عرض کر چکا ہوں آپ کی ان شش گانہ خدمات قیمہ پر الگ الگ مقالہ میں چاہتا ہوں کہ بحث کروں اور اس سلسلہ میں ایک مقالہ تراجم

کا بھی ہوگا۔ خود شاہ صاحب نے اپنے ترجمہ کے متعلق کیا ارتقا فرمایا ہے اور کن مقاصد کو پیش نظر رکھ کر اس کام کو آپ نے انجام دیا۔ نیز ترجمہ کے ساتھ قرآن کے حاشیہ پر برہان فارسی آپ نے مختصر لفظوں میں جو جواہر پارے بکھیرے ہیں اور ”الفوز الکبیر“ وغیرہ رسائل میں تفسیر کے جو اصول آپ نے وضع فرمائے ہیں۔ ان سب کا تذکرہ تراجم ہی کے اس مقالہ میں انشاء اللہ کیا جائے گا۔

﴿شاہ صاحب کے اُن شش جہتی کارناموں پر اجمالی نظر﴾

واقعہ یہ ہے کہ شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کی حیرت انگیز فقیدانہ نظر کوششوں کی جو نوعیت ان شش جہتی کارناموں میں نظر آتی ہے۔ ان میں ہر ایک بجائے خود ایک مستقل موضوع ہے کہ ایک کیا اگر علماء کی کوئی جماعت بھی ان سے عہدہ برآ ہونا چاہتی تو جتنی کامیابی حضرت شاہ صاحب کو ان میں سے ہر ایک شعبہ میں ہوئی ہے کسی ایک شعبہ میں بھی اتنا کامیاب ہونا آسان نہیں تھا۔ انہوں نے قرآنی آیات کی جن مشکلات کو حل کیا ہے قرآن نہیں کے متعلق جن کلیات کی انہوں نے خود تائیس فرمائی ہے۔ حدیث فقہ کے باہمی تعلقات کو صحیح تاریخی و شائق کی روشنی میں جس طرح انہوں نے حل فرمایا ہے پھر خصوصیت کے ساتھ ”علم اسرار الدین“ کے سلسلہ میں حدیث اور فقہ کے تقریباً تمام ابواب میں جن حقائق کو رموز کو انہوں نے بے نقاب کیا ہے۔ اس باب میں واقعہ یہ ہے کہ ان کے اس دعویٰ کی کوئی تردید نہیں کر سکتا کہ۔

﴿اسرار حدیث و مصالح احکام و ترغیبات و سائر آنچه حضرت پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم از خدائے تعالیٰ آدرده اند و تعلیم فرمودہ اند و آں فہمے است کہ پیش ازین فقیر مضبوط تر از خنن ایں فقیر کے آزرانہ کردہ است باوجود جلالت آں فن اگر کے رادریں حرف شبہ باشد گو کتاب قواعد بہ ہیں کہ شیخ عزیز الدین آنجا چہ جہد ہا کردہ بعشر عشر ایں فن فائز نشدہ۔﴾ (ص ۱۹۶) انفاس

”حدیث کے اسرار اور اسلامی احکام و قوانین کی مصلحتیں اور ترغیبات کی حکمت اور وہ ساری باتیں جو پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کی طرف سے لائے ہیں اور جن کی آپ نے تعلیم دی ہے ان سب کے اسرار و رموز کا بیان

کرنا دراصل ایک مستقل فن ہے۔ اس فقیر سے پہلے جتنی پختہ بات میں نے کہی ہے کسی سے یہ نہ بن آیا۔ اس فن کے بلندی مقام کے باوجود اگر کسی کو میرے بیان میں شبہ ہے تو چاہئے کہ کتاب ”قواعد“ کو دیکھے۔ شیخ عزیز الدین بن عبدالسلام نے اس میں کیا کچھ کوشش نہیں فرمائی ہے مگر اس فن کے عشرِ عشر تک ان کی رسائی نہ ہو سکی۔“

اسی طرح فنِ معارف و حقائق اور تصوف کے متعلق جن تحقیقی مباحث تک وہ پہنچے ہیں۔ نیز اہل سنت والجماعت کے عقائد کی تشریح اور تطبیق منقول بر معقول کے سلسلہ میں انہوں نے جو خدمتیں انجام دی ہیں جیسا کہ خود ارشاد فرماتے ہیں۔

﴿عقائد قدما اہل سنت بدلائل و حج اثبات کردوں آں را از خس و خاشاک معقولیاں پاک ساخت و بوجہ مقرر نمود کہ کل بحث نہ ماند۔﴾
 ”قدما اہل سنت کے عقائد کو دلائل و براہین کی روشنی میں جس طرح ثابت کیا گیا ہے اور معقولیوں کے خس و خاشاک بے جیسا ان کو پاک کیا ہے اور ایسے طریقہ سے ان کی بنیاد قائم کی ہے کہ اب بحثی و مباحثہ کی ان میں گنجائش ہی باقی نہ رہی۔“

ماسواء اس کے انہوں نے قرآنی نصوص اور نبوی ارشادات کی روشنی میں دو مستقل فن جو ایجاد کئے ہیں۔ جن کی تعبیر ان ہی کے الفاظ میں یہ ہے یعنی ایک تو ”علم کمالات اربعہ یعنی ابداع و خلق و تدبیر و تدلی با ایں عرض و طول۔“

”اور دوسرا علم ان ہی کی اصطلاح میں.....“

”علم استعداد نفوس انسانیہ بمجہا و کمال و مال ہر کسے۔“

شاہ صاحب کا ان دونوں علوم کے متعلق دعویٰ ہے اور بجا دعویٰ ہے کہ..... ایں ہر دو علم جلیل اند کہ پیش ازیں فقیر کسے برد گرداں نہ گشتہ۔“

نیز شاہ صاحب نے علم کلام اور تصوف کے نظری حصہ کے مباحث کو مخلوط کر کے ایک نیا ”فلسفہ“ تیار کیا اور ایسا فلسفہ جس کو ”فلسفہ“ قرار دینا میرے خیال میں اس کی تحقیر ہے کیونکہ اس

باب میں ان کی سب سے بڑی خصوصیت یہی ہے کہ ایسی کسی چیز کو اسلامی کلام اور اسلامی تصوف میں وہ دیکھنا نہیں چاہتے جس کی تائید قرآن و حدیث اور آثار صحابہ و سلف صالح کی شہادتوں سے نہ ہوتی ہو۔ خود فرماتے ہیں کہ اس قسم کے تمام مسائل میں حق تعالیٰ نے ان کو

﴿توفیق تشید آں بہ کتاب و سنت و آثار صحابہ و اوند و برتیز آںچہ علم دین ست منقول از حضرت پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم و آنچہ مدخوان است و مخرفو آنچہ سنت است و آنچہ ہر فرقہ بدعت کردہ است افادہ ساختند﴾ (انفاس)

”اس بات کی توفیق دی کہ کتاب و سنت و آثار صحابہ سے اس کی بنیادوں کو مستحکم کریں نیز وہ علم دین جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے منقول ہے اور جو دین میں باہر سے چیزیں داخل ہو گئی ہیں ان دنوں میں تمیز کا جو سلیقہ اور یہ کہ ان میں کون سی باتیں تحریفی ہیں کون کونسی چیز سنت ہے اور اسلام کے مختلف فرقوں نے کن نئی بدعتوں کو شریک کیا (ان تمام امور کا انکشاف جیسا شاہ صاحب نے کیا شاید ہی کسی نے کیا ہو۔)

الغرض اس قسم کے مختلف الاطراف و الجوانب مباحث مہمہ کو انہوں نے اپنی چھوٹی بڑی کتابوں اور رسالوں میں جو جمع کیا ہے جن کی تعداد ”حیات ولی“ کے مصنف نے (راہ) بتائی ہے اگرچہ اسی کے ساتھ یہ بھی لکھ دیا ہے۔

”آپ کی تالیفات کے سلسلہ میں اور بھی بہت سی کتابیں ہیں جو قدیم کتب خانوں میں موجود ہیں مگر ہم نے صرف ان ہی کتابوں کا ذکر کیا ہے جو مطبوع ہو کر شرق سے غرب تک نہایت وقعت کے ساتھ مشہور ہو چکی ہیں۔“

﴿شاہ صاحب کے طرز انشاء میں زبان نبوت کی جھلک﴾

اور پھر یہی نہیں کہ ان کی توجہ اپنی ان کتابوں میں محض معنی پر رہی ہے۔ بلکہ عربی زبان میں انہوں نے جتنی کتابیں لکھیں ہیں۔ ان میں ایک خاص قسم کی انشاء کی جو ان کا مخصوص اسلوب ہے پوری پابندی کی ہے شاہ صاحب نے عربی انشاء و ادب کا جو نیا قالب تیار کیا ہے یہی نہیں کہ ہندوستانی مصنفین میں اس کی نظر نہیں پائی جاتی بلکہ جہاں تک میری محدود رسائی کا تعلق ہے

میں نہیں جانتا کہ آغاز اسلام سے اس وقت تک کسی اسلامی علاقہ کے ارباب تصنیف نے اس کو اختیار کیا ہے۔ شاہ صاحب کے اس ”اسلوب بدیع“ کی کیا خصوصیتیں ہیں اس کے لئے بھی اشک مستقل مضمون کی ضرورت ہے لیکن مختصر لفظوں میں شاید یہ کہا جاسکتا ہے کہ شاہ ولی اللہ پہلے آدمی ہیں جنہوں نے اپنی عبارتوں میں زیادہ تر صاحب ”جوامع الکلم النبی الخاتم“ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے طرز گفتگو کی پیروی کی ہے۔ حتیٰ الوسع وہ اس کی کوشش کرتے ہیں کہ اپنے مدعا کا اظہار ان ہی لغات اور ان ہی محاوروں میں کریں جو لسان نبوت اور زبان رسالت سے خاص تعلق رکھتے ہیں اور اس میں خدا نے ان کو خاص مہارت عطا فرمائی ہے۔ ان سے پہلے تو کسی کو عبارت کے اس ڈھنگ کی طرف توجہ ہی نہیں ہوئی لیکن ان کے بعد بھی اس کی تقلید آسان نہیں ہے۔ حدیث کے بعد ان کی عبارت میں قرآنی طرز تکلم کا بھی اثر ہے۔ لیکن قرآن سے زیادہ اس باب میں وہ حدیث ہی کے متبع نظر آتے ہیں اور اسی چیز نے ان کی کتابوں کے رنگ کو عربی زبان کے تمام دوسرے مصنفین سے ممتاز کر دیا ہے۔ فارسی میں شاہ صاحب نے اگرچہ کم لکھا ہے لیکن جو کچھ لکھا ہے کم از کم اس میں ان علماء کے لئے درس عبرت ہے جو اپنے زمانہ کی عام طریقہ انشاء و کتابت میں لکھنے پڑھنے کو اپنی علمی شان سے ایک نری ہوئی بات خیال کرتے ہیں۔ شاہ ولی اللہ شاہ عبدالعزیز کی کتابوں کو پڑھئے اور اس زمانہ کے بڑے بڑے ارباب انشاء کی کتابوں کا بھی مطالعہ کیجئے۔ مشکل ہی سے ان حضرات کی عبارات ان سے دب سکتی ہیں۔

﴿شاہ صاحب کے اس سارے کام کی مدت﴾

لیکن یہ سارا کام کتنی مدت میں انجام پایا شاید ہی کسی نے اس پر غور کیا ہو واقعہ یہ ہے کہ شاہ صاحب کی عمر کا ایک بڑا حصہ یعنی سفر حج سے پہلے کا جو حصہ ہے اس میں تصنیف و تالیف کا بظاہر آپ نے کچھ کام نہیں کیا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت آپ کو اس کا خیال بھی نہ تھا۔ والد ماجد یعنی حضرت شاہ عبدالرحیم صاحب کی وفات کے وقت آپ سترہ سال کے تھے۔ اسی عمر میں علوم متداولہ سے فارغ ہو چکے تھے۔ ان کی وفات کے بعد اپنے والد کے پرانے مدرسہ رحیمہ میں درس و تدریس کا کام تقریباً ایک قرن تک انجام دیتے رہے خود فرماتے

ہیں کہ :-

﴿بعد از وفات حضرت ایٹاں دوازده سال کی بیش بدرس کتب دینیہ و عقلیہ
نمودہ و در ہر علمے خوش واقع شد۔﴾ (انفاس)

”حضرت والد کے انتقال کے بعد کم و بیش بارہ سال تک دینی اور عقلی علوم کی
کتابوں کا درس دیتا رہا اور ہر علم میں غور و فکر کا مذاق پیدا ہوا۔“

جس کے معنی یہی ہوئے کہ قریب قریب اسی سال کی عمر تک شاہ صاحب کا بجائے
تالیف و تصنیف زیادہ تر درس و تدریس سے ہی تعلق رہا۔ اسی زمانہ میں ایک سفر حجاز کا سودا ہر
میں سما فرماتے ہیں۔

﴿بعد از اں دوازده سال شوق زیارت حرمین محترمین و سرافتاد۔﴾

”اس بارہ سال کے بعد حرمین محترمین کی زیارت کا شوق سر میں سما۔“

۱۱۴۳ھ ۱۱۴۴ھ ۱۱۴۵ھ یہ تین سال اسی سفر کی نذر ہوئے۔ جس میں تقریباً چودہ مہینے
حرمین شریفین میں قیام کا موقعہ میسر آیا۔ شاہ عبدالعزیز کا بیان گزر چکا ہے کہ :-

﴿والد ماجد چہارده ماه در حرمین بووند﴾ (ملفوظات ص ۹۳)

”والد ماجد چودہ مہینے حرمین میں رہے۔“

اور باقی مدت آمد و رفت میں صرف ہوئی۔ اس سلسلہ میں شاہ صاحب کو دو حج ملے۔ ایک
اس وقت جب حجاز پہنچے اور دوسرا اس وقت جب واپسی کے قصد سے عرب سے روانہ ہونے
والے تھے۔

اس حساب سے حضرت کی عمر کے بتیس (۳۳) چونتیس (۳۴) سال ان ہی مشغلوں
میں ختم ہو گئے۔ آپ کی پوری عمر کتنی ہوئی۔ اس میں اگرچہ تھوڑا سا اختلاف ہے۔ ”حیات ولی“
کے مصنف نے گویہ لکھا ہے کہ۔

﴿شاہ صاحب کی عمر کے بارے میں اختلاف﴾

”جناب شاہ ولی اللہ عمر کے تریسٹھ سال مرحلے طے کر چکے تو چند روزہ خفیف سی بیماری میں

بتلا ہو کر ۱۱۷۱ء میں عازم سفر آخرت ہوئے۔“ ص ۳۱۸

لیکن اس کے برخلاف ملفوظات عزیز یہ کے جامع نے حضرت شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کا یہ قول نقل کیا ہے۔

﴿شاہ صاحب کی ولادت و وفات شاہ عبدالعزیز کی زبانی﴾

عمر شریف شصت (۶۱) و یک سال و چار ماہ شد چہارم شوال تولد گشت در در بست و نہم محرم وفات یافت تاریخ تولد چہارم ماہ شوال چہار شنبہ ۱۱۱۲ھ بود۔ تاریخ وفات ”ار بود امام اعظم دیں۔“ و دیگر تاریخ۔

﴿ہائے دل روزگار رفت بست نہم محرم وقت ظہر﴾ (ملفوظات عزیز یہ ص ۴۰)
تاریخوں کے ملانے سے جیسا کہ ہونا بھی چاہیے۔ شاہ عبدالعزیز ہی کے بیان کی توثیق ہوتی ہے۔ بہر کیف میرا مقصد تو یہ ہے کہ شاہ ولی اللہ کی عمر جب کل اکٹھ سال چار مہینے مانی جائے تو اس کا صاف مطلب یہی ہے کہ اس اکٹھ میں سے تقریباً تئیس (۳۳) چونتیس (۳۴) ان ہی مشغولیتوں میں بسر ہو گئی۔ اب کل ستائیس اٹھائیس سال کی مدت رہ جاتی ہے جس میں وہ سارا کام انجام پایا ہے۔ جسے دنیا شاہ ولی اللہ کا کام سمجھتی ہے بلکہ اسی کے ساتھ مرحوم حضرت امیر شاہ خاں صاحب جود اللہی خانوادہ کے گویا ”روایہ“ تھے۔ اگر ان کے اس بیان کا بھی اضافہ کر لیا جائے کہ۔

”دہلی میں نجف علی خاں کا تسلط تھا جس نے شاہ ولی اللہ صاحب کے پہنچے

اتروا کر ہاتھ بیکار کر دیئے تھے تاکہ وہ کوئی کتاب یا مضمون نہ تحریر کر سکیں۔“

(اسرار الروایات ص ۴۴)

اگرچہ اب تک اس واقعہ کی تاریخی شہادت مجھے میسر نہیں آئی لیکن امیر شاہ کا بیان کم از کم میرے نزدیک خود ایک زندہ شہادت ہے۔ پھر چونکہ یہ نہیں معلوم کہ ناگوار سانحہ حضرت کے ساتھ کس وقت پیش آیا اس لئے کوئی معین مدت تو مقرر نہیں کی جاسکتی۔ لیکن بقیہ ستائیس اٹھائیس سال والی مدت لامحالہ اس بنیاد پر اور گھٹ کر رہ جاتی ہے۔

اتنی قلیل مدت میں ایسے عجیب و غریب گونا گوں کام کیسے شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے بن آئے؟ یہ یقیناً محل حیرت ہے۔ کوئی شبہ نہیں کہ اس میں بہت کچھ دخل ان کے خداداد فطرت اور خاص دل و دماغ کو بھی ہے۔ بھلا جس شخص کی ختنہ اور جس کا ختم قرآن ساتھ ساتھ ہوا ہو۔ جیسا کہ خود فرماتے ہیں۔

﴿در سال ہفتم حضرت والد بزرگوار بہ نماز ایستادہ کردند و بروزہ دانشن فرمودند و تطہر نیز در ہمیں سال واقع شد و چنان در خاطر ماندہ کہ آخر ہمیں سال قرآن عظیم ختم کردم۔﴾ (انفاس ص ۱۹۴)

”عمر کے ساتویں سال میں والد بزرگوار نے مجھے نماز پر کھڑا کیا اور روزہ رکھنے کا حکم دیا اور ختنہ بھی اسی سال میں واقع ہوئی اور خیال ایسا ہوتا ہے کہ اسی سال کے آخر میں قرآن مجید بھی میں نے ختم کیا۔“

اور دس سال کی عمر میں جو شرح ملا تک پہنچ گیا ہو اور کس طرح پہنچا ہوا کہ مطالعہ کی قوت بھی پیدا ہو چکی ہو۔ فرماتے ہیں۔

﴿در سال دہم شرح ملا می خواندم و راہ مطالعہ فی الجملہ کشادہ شد۔﴾
”میں دسویں سال شرح ملا پڑھ چکا تھا۔ فی الجملہ اسی وقت سے مطالعہ کی راہ مجھ پر کھلی۔“

اور ٹھیک عمر کے پندرہویں سال میں باضابطہ دستار فضیلت جس کے سر پر بندھ گئی ہو۔ جیسا کہ ان ہی کا بیان ہے کہ۔

﴿بالجملہ از فنون متعارفہ بحسب رسم ایں دیار پانزویں فراغ حاصل شد﴾
”خلاصہ یہ ہے کہ تمام متداول علوم اس کے درس میں جن کا رواج ہے ان سے پندرہویں سال فراغت حاصل ہو گئی۔“

ان علوم متداولہ میں صرف درس نظامیہ کی کتابیں ہی داخل نہیں ہیں۔ بلکہ ان عام کتابوں کے سوا طب اور تصوف کی ایک نہیں متعدد کتابیں چھوٹی بڑی بھی شریک ہیں بلکہ شاید علم خواص الاسماء وغیرہ کے طرز کی بعض چیزیں بھی اپنے والد سے آپ نے پڑھ لی تھیں اور پھر سترہ سال

کی عمر سے ہر قسم کے علوم و فنون عقلی کا درس دینا شروع کر دیا تھا۔ ظاہر ہے کہ یہ باتیں ان کی خاص دماغی اور ذہنی قابلیت پر دلالت کرتی ہیں۔

عرب بھی جو وہ گئے تو اس میں شک نہیں کہ وہاں کے علم و فضل کی صحتوں سے کافی فائدہ ان کو پہونچا اور سب سے بڑی چیز جو وہاں سے لائے وہ حدیث کی سند تھی۔ کیونکہ گو ہندوستان میں بھی قبل سفر حجاز کے اپنے والد سے پوری مشکوٰۃ اور بخاری کا کچھ حصہ پڑھ چکے تھے لیکن صحاح اور صحاح کے سوا دوسری حدیث کی کتابوں کی سند آپ کو عرب ہی سے حاصل ہوئی۔ لیکن خود ان کے بعض جلیل القدر اساتذہ بلکہ آپ کے سب سے بڑے استاذ حدیث علامہ طاہر بن اہیم کردی ہی فرماتے تھے۔

﴿یسند عنی اللفظ رکنیت اصمغ المعنی منہ﴾ (الیانح الحنی)

”مجھ سے وہ لفظوں کی سند لیتے ہیں اور میں ان سے حدیث کے معنی کی تصحیح کرتا

ہوں۔“

بلاشبہ یہ ساری باتیں ان کی فطری ذہانت و ذکاوت پر دلالت کرتی ہیں اور شاہ عبدالعزیز صاحب سے منقول بھی ہے۔ فرمایا کرتے تھے ”مثل والد ماجد شخصے کم نظر آئند۔“ حافظہ کے متعلق ان ہی کی شہادت یہ ہے کہ ”مثل والد ماجد حافظہ ندیدہ ام“ ص ۱۱

ایک اور خاص بات شاہ عبدالعزیز ان کے متعلق یہ بھی بیان کی ہے کہ..... ”مریض ہم کم می شدند۔“ ص ۴۰ بہر حال اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ شاہ صاحب کی ان علمی خدمات و مجتہدات میں ان کی فطری خصوصیتوں کو بھی بہت زیادہ دخل ہے۔

لیکن جو کام جتنی قلیل مدت میں ان سے بن پڑا ہے اور ایسا کام جس کے اکثر حصہ کے وہ موجد ہیں۔ ان کی کتابوں سے اگر ان ”باکورات“ و ”بذائع“ کا انتخاب کیا جائے جن کے ابتداء و ابتکار کا فخر صرف ان کے نوک خامہ کو حاصل ہے تو بلا مبالغہ ہزار ہا ہزار سے وہ متجاوز ہو سکتے ہیں تو کیا شاہ صاحب کی اس عبقریت اور نابغیت میں صرف ان کے دل و دماغ کو دخل ہے۔ ممکن ہے کہ لوگ ایسا ہی خیال کرتے ہوں۔ خصوصاً اس زمانہ میں ”جینیس“ کا ایک لفظ تراش لیا گیا ہے اور جب کسی شخص کے کام کے متعلق اس قسم کی مدہوش کن اور حیرت انگیز عجوبہ

طراز یوں کا تجربہ ہوتا ہے تو کہہ دیا جاتا ہے کہ اس ”فن“ کا فلاں شخص ”جینیس“ ہے اگر شاہ صاحب کے متعلق کوئی وثقیہ مجھے نہ ملا ہوتا تو شاید میں بھی کچھ اسی قسم کی بات کہہ کر یہ سن کر چپ ہو جاتا۔ لیکن الحمد للہ کہ سفر حجاز سے پہلے اور سفر حجاز کے بعد کی شاہ صاحب کی دونوں زندگیوں اور ان کے کارناموں میں جو نمایاں فرق پیدا ہو گیا ہے۔ اسی کو تہہ میں جو حقیقی سبب کار فرما ہے وہ اس سے بہت زیادہ بلند ہے جو سمجھا جاتا ہے۔

جیسا کہ میں نے ابتدا مضمون میں عرض کیا تھا کہ جاز پہنچ کر شاہ صاحب نے ایک خواب دیکھا تھا اور ایسا خواب کہ اگر اس کی تعبیر پوری نہ ہوتی تو آج ہندوستان کی تاریخ وہ نہ ہوتی جو اس وقت ہے تفصیل سے بتا چکا ہوں کہ اس خواب میں شاہ صاحب کو حضرت السلطان الغازی الابدالی اور ان کی فیصلہ کن جنگ جو مرہٹوں سے ہوئی اس کا نقشہ دکھایا گیا تھا۔

﴿شاہ صاحب کی اُن محیر العقول علمی خدمات کا اصل راز﴾

ساری دنیا جانتی ہے کہ ”پانی پت“ کے میدان میں اگر اس دن قدرت ابدالی کے حق میں فیصلہ نہ کرتی تو یقیناً ہندوستان میں مرہٹوں کی حکومت قائم ہو چکی ہوتی اور مرہٹوں کی حکومت قائم ہو جانے کے بعد اس ملک میں مسلمانوں کا جو ہنjar ہوتا وہ یوں بھی ظاہر ہے پیشتر اس قوم کے جن نصب العینوں کا تھوڑا بہت ذکر آچکا ہے ان سے بھی اس کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ لوگ کچھ ہی خیال کریں لیکن میں تو سمجھتا ہوں کہ ان ہی مرہٹوں کے مظالم سے تنگ آ کر جو حجاز بھاگا تھا اس کو اس فتنہ کے قلع قمع کی بشارت اس خواب کے ذریعہ سے دی گئی تھی اور جس طرح کفر کے اس استیصال کی خبر سے وہ مبشر ہوئے ٹھیک اسی سفر میں ان کو ایک اور مرثدہ اور کامیابی کی خوش خبری سے سرفراز فرمایا گیا تھا جس کا ذکر شاہ صاحب نے حالانکہ اپنی ایک نہیں بلکہ متعدد کتابوں میں کیا ہے۔ لیکن لوگ اس کو پڑھتے ہیں اور گزر جاتے ہیں۔ حالانکہ جہاں تک میں خیال کرتا ہوں۔ شاہ صاحب کی ساری انقلابی زندگی اور حجاز سے واپسی کے بعد ان سے اسلام کی جو عظیم خدمتیں بن آئیں ان سب کا قصہ اسی وقت ختم کر دیا گیا تھا۔ واقعہ اسی وقت ہو چکا تھا صرف اس کا ظہور ہندوستان آ کر ہوا۔ میرا اشارہ شاہ صاحب کے اس مشہور خواب کی طرف

ہے جس کا ذکر حجۃ اللہ البالغہ کے دیباچہ میں بھی کیا گیا ہے۔ اور فیوض الحرمین و درثین دونوں کتابوں میں بھی ہے میں پہلے اس خواب کو درثین سے بحثہ ان ہی کے الفاظ میں نقل کرتا ہوں فرماتے ہیں۔

﴿كَانَ الْحُسَيْنَ وَالْحَسَنَ عَلَيْهِمُ السَّلَامُ نَزَلَ فِي بَيْتِي وَبِيدِ الْحَسَنِ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَلَمٌ قَدْ انْكَسَرَ لِسَانُهُ وَبَسَطَ اتِي يَدُهُ لِيُعْطِيَنِي وَقَالَ هَذَا قَلَمُ جَدِّي رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَآلِهِ وَسَلَّمَ ثُمَّ قَالَ جَتِي يَصْلَحُهُ الْحُسَيْنُ فَلَيْسَ مَا أَصْلَحُهُ الْحُسَيْنُ كَمَا لَمْ يَصْلَحُهُ فَأَخَذَهُ الْحُسَيْنُ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى مِنْهُ وَأَصْلَحَهُ ثُمَّ نَادَلِيْنَهُ فَسَرَدَتْ بِهِ ثُمَّ جَعَى بِرَوَاءٍ مَخْطُوطٍ فِيهِ خُطٌّ اخْضَرُ وَخُطٌّ أَبْيَضُ فَوَضَعَ بَيْنَ يَدَيْهِمَا نَرَفَعَهُ حِينَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ وَقَالَ هَذَا رَوَا جَدِّي رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ثُمَّ النَّبِيُّ فَرَضَعَهُ عَلَيَّ رَأْسِي تَعْظِيمًا رَحِمَتِ اللَّهُ تَعَالَى﴾

”گویا حسین اور حسن علیہما السلام میرے گھر تشریف لائے ہیں اور حسن علیہ السلام کے دست مبارک میں ایک قلم ہے جس کی زبان (نوک) ٹوٹی ہوئی ہے۔ حضرت حسن رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنا ہاتھ بڑھایا۔ تاکہ وہ قلم مجھے عطا فرمائیں اور فرمایا کہ یہ قلم میرے نانا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ہے مگر پھر آپ بولے کہ حسین اسے درست کر لیں (تب دوں گا) اور فرمایا کہ حسین جیسا درست کر سکتے ہیں کوئی دوسرا اتنا درست نہیں کر سکتا۔ پھر حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس قلم کو لے لیا اور درست فرمایا۔ میں اس (انعام) سے بہت مسرور ہوا۔ پھر ایک چادر لائی گئی جس پر دھاریاں بنی ہوئی تھیں۔ ایک دھاری سبز ایک سفید پہلے یہ چادر ان دونوں حضرات کے سامنے رکھی گئی پھر حضرت حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اسے اٹھایا اور فرمایا کہ یہ چادر میرے نانا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ہے پھر وہ چادر مجھے اڑھادی گئی تب

میں نے تعظیماً اس کو اپنے سر پر رکھ لیا اور حق تعالیٰ کا شکر ادا کیا۔“

﴿شاہ صاحب کے اس خواب کی تشریح اور تعبیر﴾

شاہ صاحب نے یہ کیا خواب دیکھا ظاہر ہے کہ اس خواب میں چند اجزا ہیں (۱) حسنین رضی اللہ عنہما تشریف لانا۔ (۲) حسن علیہ السلام کے ہاتھ میں ایک ایسے قلم کا ہونا جس کی نوک ٹوٹی ہوئی ہے۔ (۳) شاہ صاحب کو دینے کا ارادہ فرمانا مگر پھر حضرت حسین علیہ السلام سے اس قلم کو بنوانا (۴) اور یہ فرمانا کہ ”فلیس ما اصلحه الحسین کمالو یصلحه“ یعنی جیسا قلم حسین علیہ السلام بنا سکتے ہیں وہ قلم اور جوان کا درست کیا ہوا نہ ہو برابر نہیں ہو سکے وہ بن جانے کے بعد اس قلم کو شاہ صاحب کے سپرد فرمانا (۶) اس قلم کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف منسوب فرمانا۔ (۷) پھر شاہ صاحب کو ایک چادر جو ”بردیمانی“ کے صفات سے موصوف ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف منسوب ہے عطا فرمانا (۸) اس کو اڑھا دینا۔

﴿حضرات حسنینؑ کی زندگیوں کا انطباق شاہ صاحب کی زندگی پر﴾

میں نے ہر جز کو الگ الگ کر کے اس نے لکھ دیا ہے تاکہ غور کرنے میں آسانی ہو۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ اس خواب سے میری سمجھ میں جو کچھ آیا ہے وہی اس کی واقعی تعبیر بھی ہے لیکن بہر حال میرا ذہن اس خواب سے جن امور کی طرف منتقل ہوا ہے اب اسے عرض کرتا ہوں۔

حضرت حسنین علیہ السلام کی اصل خصوصیت یہی ہے کہ ملت اسلامیہ جب شدید نزعہ آئی تو ان میں بڑے صاحب نے اپنی صلح کی روش سے اور چھوٹے صاحب نے مقابلہ اور مقاتلہ کے طریقہ سے اس فتنہ کا مقابلہ کیا۔ پھر کیوں نہ سمجھا جائے کہ اس وقت ہندوستان میں اسلام جن نزعوں میں گھر گیا تھا۔ اسی کے مقابلہ کے لئے شاہ صاحب کا انتخاب کیا گیا۔ اشارہ ادھر تھا کہ شاہ صاحب سے جس مقابلہ کا کام لیا جائے گا۔ اس میں صلح و جنگ دونوں طریقوں کو دخل ہوگا۔ شاہ ولی اللہ نے آنے والے خطرات کے مقابلہ میں مذکورہ بالا جن شش جہتی کارناموں کو پیش کیا۔ بہ ظاہر تو اس کی صورت جنگ کی نہیں بلکہ ایک مضلحانہ مقابلہ کی تھی کیونکہ

یہ تلوار سے نہیں بلکہ قلم کی جنگ تھی۔ لیکن اس جہاد میں شاہ صاحب اور ان کے خاندان والوں کو دشمنوں کی جانب سے جواذیتیں برداشت کرنی پڑیں۔ کون کہہ سکتا ہے کہ اس میں کربلائی قربانیوں کے نشانات نہ تھے۔ ابھی گزر چکا کہ نجف خاں نے شاہ صاحب کے پہونچے اتر وادے تھے صاحب الیائے علامہ محسن البہاری رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ جس وقت شاہ صاحب نے فقہ و حدیث کے صحیح تعلقات کی تنقیح فرما کر کتابیں شائع کیں۔ جن میں ظاہر ہے کہ ”اس تقلید جامد“ کی مخالفت کی گئی تھی۔ جس میں عموماً سرحدی پٹھان اور روہیلے مبتلا تھے۔ تو قدرتنا ان پر شاہ صاحب کی باتیں سخت شاق گزرتی تھیں۔ دلی اس وقت ان ہی لوگوں سے بھری ہوئی تھی۔ بقول مولانا محسن لے کے کہ ”غنم کلب“ کے بالوں سے زیادہ ان کی تعداد تھی یہ لوگ ہر طرح سے شاہ صاحب کے درپے آزاد ہوئے وہ لکھتے ہیں۔

﴿لَمْ يَصْدَهُ شَيْءٌ مِنْ ذَلِكَ مِمَّا كَانَ عَلَيْهِ مِنْ تَرْجِيحِ مَا وَافَقَ

مِنْ أَقْرَالِ الْفُقَهَاءِ ظَوَاهِرِ السُّنَنِ وَالْأَثَارِ مِنْ بَيَانِ مَا صَفَا مَوْرَدَهُ

مِنْ ذَلِكَ عَمَّا تَزْنُقُ فَكَانَ يَصْرَحُ بِهَا بَيْنَ ظَهَرِ أَيْنَهُمْ نَصْحًا

الْأَمَةِ رَوْنَاءَ بَعْدِ اللَّهِ الَّذِي وَاثَقَ بِهِ الْعُلَمَاءُ﴾ (الیائے)

”ان لوگوں کی مخالفتیں شاہ صاحب کو اس طرز عمل سے نہ روک سکیں جو ظاہر

سنن و آثار کے مطابق فقہاء کے اقوال کو ترجیح دینے کا تھا اور اس سلسلہ میں جو

مسلك صاف سہرا تھا اس کو ملکہ طریقہ سے وہ جدا کرتے تھے شاہ ولی اللہ ان

متصلب سخت پٹھانوں کے درمیان علاقہ اپنے اس مسلك کا اظہار فرماتے

تھے۔ مقصد امت کی بھی خواہی تھی اور خدا کے اس عہد کو پورا کرنا تھا جس کا علما

سے وعدہ لیا گیا ہے۔“

فتح پوری کی مسجد میں قتل کے ارادہ سے شاہ صاحب کا جو محاصرہ کیا گیا اس کا ذکر بھی گزر

یہ مولانا محسن بہار کے شمالی حصہ تربہت کے رہنے والے تھے۔ خضر چک ضلع موگیہ میں ان کا عجیب کتب خانہ اب

تک موجود ہے۔ اگرچہ بڑا حصہ اس کا بقرعید کی قربانی کے جھگڑے میں ہندوؤں کے ہاتھ برباد ہو گیا۔ مولانا

محسن نے ہندوستان میں تحصیل علم کے بعد عاز اور دوسرے اسلامی ممالک میں بھی کچھ پڑھا تھا خاکسار کو آپ

سے اور آپ کے خاندان سے قرابت قریبہ کے تعلقات ہیں۔

چکا۔ پھر اس کے بعد آپ کے خاندان پر جو مظالم توڑے گئے اس کا اندازہ شاہ عبدالعزیز کی بعض روایتوں سے ہوتا ہے۔ مثلاً ملفوظات میں ہے۔

﴿چوں در شہر کہنہ بودم بسیار از رفعتنا و فساق و برادران حسود و تکلیفہا می کشیدم﴾
 ”جب ہم پرانی دلی میں تھے۔ تو رافضیوں اور فاسقوں اور حسد کرنے والے
 بھائیوں سے بہت تکلیفیں میں نے اٹھائیں۔

پھر ان ”تکلیفہا“ میں سے ایک تکلیف کا ذکر ان الفاظ میں فرماتے ہیں۔
 ﴿بعضے قریب خانہ ماتعزیہ بر سقف می کروند و تبر اوسب شتم می نمودند﴾
 بعض لوگ میرے گھر کے پاس اپنے کوٹھے اور بالا خانوں پر تعزیہ رکھتے اور
 تبر اکتے (اور خلفا ثلاثہ کو) گالیاں دیتے اور اس طرح مجھے ایذا پہنچاتے۔
 یہ تو خیر شیعوں کا سلوک تھا۔ ”فساق“ کا برتاؤ کیا تھا اس کی مثال یہ ہے کہ۔
 ﴿روزے فاجرہ شراب خوردہ در وقت تراویح در عین قرأت قرآن شعر حافظ
 شیراز﴾

”ایک دن ایک فاحشہ عورت نے شراب پی کر تراویح کے وقت عین قرأت
 قرآن کے درمیان حافظ شیرازی کا یہ شعر گانا شروع کر دیا۔“

در کوئے نیک نامی مارا گذرند اوند در کوئے نیک نامی مارا گذرند اوند
 گر تو نمی پسندی تیغیر کن قصارا گر تو نمی پسندی تیغیر کن قصارا
 خواند و بعضے و فہاد کہ قرأت مشتبہ نشود آواز ہائے نمی زند۔

اور بعض لوگ ڈھول تاشے بجاتے اور شور پکار بلند کرتے تاکہ میری قرأت میں گڑبڑ پیدا ہو۔

﴿شاہ صاحب کے خاندان پر کربلائی مصائب﴾

اور یہ تو خیر معمولی باتیں ہیں حضرت قبلہ امیر شاہ خاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے تو جس
 واقع کا ذکر فرمایا ہے سن کر کلیجہ دہل جاتا ہے فرماتے ہیں کہ وہی نجف خاں صاحب نے شاہ ولی اللہ

مغل دربار کا آخری امیر تھا۔ جس کے بعد بی لال قلعہ پر غیروں کا قبضہ ہو گیا۔ دراصل یہ شروع میں نواب وزیر
 اور دھکی وزارت کا دلی میں نائب تھا لیکن بعد کو خود مستقل بن بیٹھا اور آخری ہانڈی حکومت کے سر پھولی۔ ۱۲

کے پہنچے اتروائے تھے اسی نے

”شاہ عبدالعزیز“ شاہ رفیق الدین کو اپنے قلمرو سے نکال دیا تھا اور یہ ہر دو

صاحبان معہ عورتوں کے شاہدرہ تک پیدل آئے تھے“

سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کی مستورات کے ساتھ میدان کر بلا میں جو فاضحات ناگفتہ بہ

پیش آئے تھے کیا اس کی جھلک اس واقعہ میں نہیں پائی جا رہی ہے۔ شاہ ولی اللہ کی بہوئیں اور

پوتیاں اس بے سرو سامانی کے ساتھ دلی سے پیادہ پا آئی ہیں۔ پھر انہی کا بیان ہے کہ شاہدرہ سے

عورتوں کی سواری کا نظم تو حضرت مولانا فخر الدین رحمۃ اللہ علیہ کی سفارش سے ہو گیا لیکن۔

”شاہ عبدالعزیز اور شاہ رفیع الدین کو سواری بھی نہ ملی تھی اور شاہ رفیع الدین

صاحب تو پیدل لکھنؤ چلے گئے تھے اور شاہ عبدالعزیز صاحب پیدل جون

پور چلے گئے۔“

سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کے صاحبزادے امام زین العابدین ”بیار“ کے ساتھ جو برتاؤ کیا

گیا تھا کیا اسی کا ظل ولی اللہ کے بیمار صاحبزادے شاہ عبدالعزیز صاحب میں نہیں ہے ملفوظات

میں ہے کہ شاہ صاحب کو بائیس قسم کی بیماریاں تھیں۔ لیکن ظالموں نے رحم نہیں کیا اور دلی سے

پیدل جون پور دوڑا دیا۔ دونوں بھائی سفر میں ساتھ ہوتے تو شاید گونہ تسلی ہوتی۔ لیکن امیر شاہ

خاں صاحب کا بیان ہے کہ

”ان دونوں کو نہ سوار ہونے کا حکم تھا اور نہ ساتھ رہنے کا۔“

خاں صاحب نے اسی سلسلہ میں یہ بھی بیان کیا ہے کہ۔

”دو دفعہ روانہ ہونے لگا شاہ عبدالعزیز صاحب کو زہر دیا تھا اور چھکلی کا ابٹن ملوایا

دیا تھا جس سے شاہ صاحب کو برص کا مرض ہو گیا تھا۔“

مجھے یاد آتا ہے کہ امیر شاہ خاں صاحب ہی سے میں نے یہ بھی سنا تھا کہ جس وقت شاہ

عبدالعزیز پیدل جونپور پہنچے گئے۔ یہ موسم ٹھیک جیٹھ کا تھا سخت لو کے دن تھے امیر الروایات میں

دارالعلوم دیوبند کے متوسلین میں شاید ہی کوئی ہوگا۔ جو حضرت امیر شاہ خاں سے واقف نہ ہوگا۔ خاکسار پر بڑی

نظر عنایت تھی بلکہ ولی اللہ خاندان سے خاص نیاز خاں صاحب ہی کی بدولت ابتدا میں حاصل ہوا اور حضرت

شیخ الہند کی غلامی و بیعت سے سرفرازی بھی انہی کی بدولت حاصل ہوئی۔ ۱۲

بھی اتنا موجود ہے کہ۔

”جو پور کے سفر میں شاہ صاحب کو لو بھی لگ گئی تھی۔ جس سے مزاج میں سخت

حدت پیدا ہو گئی تھی اور جوانی ہی میں بینائی جاتی رہی تھی اور ہمیشہ سخت بے

چین رہتے تھے۔“ ص ۴۳

اور آخر میں تو شاہ ولی اللہ کے پوتے مولانا اسماعیل صاحب اور اسی خاندان کے تربیت

یافتہ بزرگ حضرت سید احمد بریلوی رحمۃ اللہ علیہ نے بالاکوٹ میں جس واقعہ کی تصویر پیش کی۔

اس پر تو کر بلا کی ظلیت کا خاتمہ ہی ہو جاتا ہے۔

بہر حال اس خواب میں حسنین علیہما السلام کے دیدار سے شاہ صاحب کا مشرف ہونا۔ محض

اتفاقی واقعہ نہ تھا۔ اس کے بعد حضرت حسن علیہ السلام کے دست مبارک میں ٹوٹے ہوئے قلم کا

ہونا جہاں تک میں سمجھتا ہوں اس طرف اشارہ معلوم ہوتا ہے کہ ایک مدت سے ہندوستان ہ میں

نہیں بلکہ تمام دنیا میں ہی بھی قابل ذکر مصنف پیدا نہیں ہوا تھا۔ تصنیف کا ذوق و شوق تو باقی تھا

لیکن کتابوں میں صرف لفظوں کی بھرمار ہوتی تھی۔ انتہا یہ تھی کہ تاریخ جس کا سرمایہ صرف

واقعات ہیں اس کی کتابوں میں بھی ادھر دو تین صدیوں سے یہ آفت آئی ہوئی تھی کہ محض

لفظوں کی دھڑا بندی کی جاتی تھی۔ علماء اسلام کے جو تذکرے ادھر تیار ہوئے ان میں دیکھے۔

”بقول نواب علامہ مولانا حبیب الرحمن شروانی سوئے“ البحر العلام والبحر القمقام“ کے ہم قافیہ

الفاظ کے سوانح حالات کی ایک سطر نہیں ملتی۔ بے مانگی میں یہی حال دوسرے علوم و فنون کی

کتابوں کا بھی تھا۔ تو میرے خیال میں گویا اسی کی طرف ٹوٹے ہوئے قلم سے اشارہ کیا گیا تھا

اور اب یہ ”قلم“ شاہ ولی اللہ کے سپرد ہو رہا تھا لیکن جیسا کہ میں نے عرض کیا اصلاح کی راہ میں

شاہ صاحب کو جو قلم دیا جا رہا تھا اس میں اشارہ کر دیا گیا تھا کہ حسنی رنگ کے ساتھ ساتھ حسینی

واقعات کے تجربے پیش آئیں گے اور یہ جو امام حسن علیہ السلام نے فرمایا ہے کہ ”حسین جیسا

بناتے ہیں ویسا دوسرا نہیں بنا سکتا“ تو اس میں گویا اشارہ تھا کہ ہر چیز سے بے پروا ہو کر صرف

حق کی حمایت میں میدان میں کود جانا چاہئے۔ اور میں بیان کر چکا کہ شاہ صاحب نے اس

راہ میں کیسی جرأت دکھائی۔ اپنی تصوف کی کتابوں میں جب مشائخ عصر پر وہ تنقید فرماتے

ہیں۔ جانتے ہیں کہ ملک ان ہی لوگوں کے زیر اثر ہے ان کا ایک اشارہ فتنہ کی آگ کو روشن کر دینے کیلئے کافی ہے لیکن متعدد مقامات پر یہ ارقام فرماتے جاتے ہیں۔

﴿ہر چند اس سخن بر بسیارے از صوفیاں زماں دشوار خواہد بود اما مرا کارے

فرمودہ اند بر حسب آں می گویم بازید و عمر و کارے نیست﴾ (وصیت نامہ ص ۸)

”ہر چند میری یہ بات اس زمانہ کے صوفیوں پر گراں گزرے گی لیکن مجھے ایک کام کا

حکم دیا گیا ہے اس کے مطابق کہہ رہا ہوں مجھے زید و عمرو سے کوئی سروکار نہیں۔“

آخر میں شاہ صاحب کو بردیمانی کے نیچے دونوں حضرات لے آئے ہیں یعنی یہ فرماتے

ہوئے کہ۔

﴿هذا رداء جدی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم﴾

”یہ میرے نانا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی چادر ہے۔“

وہ چادر حضرت شاہ ولی اللہ کو اڑھا دیتے ہیں۔ غالباً یہ ادھر اشارہ تھا کہ سب کچھ ہوگا۔

مخالفین بھی ہوں گے دشمن ستائیں گے بھی۔ لیکن زیر سایہ عاطفت نبوت کبریٰ علمی صاحب الف

سلام و تحیہ چونکہ شاہ صاحب کی زندگی گزرے گی۔ اس لئے ردائے محمدی کے سایہ میں پناہ لینے

والوں پر انشاء اللہ مخالفین کی کچھ پیش نہ جائے گی اور ان کو خائب و خاسر ہو کر واپس ہونا پڑے گا

اور شاہ صاحب کے قلمی آثار کو دنیا میں فروغ ہوگا۔ بلکہ ”ٹوٹے ہوئے قلم“ کے بعد اسلامی دنیا

میں ایک نیا دور تصنیف و تالیف کا شروع ہوگا۔ جیسا کہ سب جانتے ہیں کہ یہی ہوا خود شاہ ولی

اللہ صاحب نے درمبین میں جہاں اس خواب کو نقل فرمایا ہے اس کے بعد آخر میں فرماتے ہیں۔

﴿فمن یوسد انشرح صدری التصنیف فی العلوم

الشرعیہ﴾ (ص ۲۰)

”اسی دن سے میرا سینہ شرعی علوم میں تصنیف کے لئے کھل گیا۔“

جس کا صاف اور کھلا ہوا مطلب یہی ہے کہ شاہ صاحب کی آئندہ زندگی میں تصنیفی

کوششوں کا جو سلسلہ شروع ہوا۔ اور وہ بڑھا اور اس حد تک بڑھا کہ اب نہ صرف ہندوستان بلکہ

مصر، ترکی، حجاز اور کابل تک کے جامعات و مدارس میں آپ کی کتابیں داخل درس ہیں اور ان ہی

ممالک کے مطالبے سے آپ کی کتابیں چھپ چھپ کر ہندوستان آرہی ہیں ان تمام کوششوں

کی تہہ میں ”حقیقی موثر“ غیب کی یہی قوت تھی۔

﴿شاہ صاحب کے تجدیدی کارناموں میں فیض روح القدس کا دخل﴾
 ”بے شک شاہ صاحب بچپن ہی سے غیر معمولی طبیعت و فطرت کے مالک تھے۔ لیکن آپ کی ان حکیمانہ و مجددانہ کارناموں میں صرف آپ کی طبیعت ہی کو دخل نہیں ہے اور نہ آپ کے والد ماجد و دیگر اساتذہ کی تعلیم و تربیت ہی کا اس کو نتیجہ کہا جاسکتا ہے بلکہ کسی کی نگاہ انتخاب نے اب شاہ ولی اللہ کو وہ ولی اللہ باقی نہیں رکھا تھا اب شاہ صاحب کی زبان پر کوئی اور بول رہا تھا اور ان کی انگلیوں میں اب کسی اور کا قلم چل رہا تھا۔“

ع سائلے کہ نکوست از بہارش پیدا است

حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب ایک دن اپنے والد کے اس خواب کا تذکرہ فرما رہے تھے۔ جامع ملفوظات نے لکھا ہے کہ آخر میں شاہ صاحب نے فرمایا کہ اس واقعہ کے بعد ﴿حال نسبت و علم تقریر دیگر گوں شد﴾

”والد کی نسبت باطنی اور علم و تقریر ساری باتوں کی حالت کچھ اور ہی ہو گئی۔“
 شاہ ولی اللہ کا رنگ اس کے بعد اتنا بدل گیا تھا کہ شاہ عبدالعزیز فرماتے ہیں کہ ان کے والد کے جو پرانے شاگرد تھے وہ سفر حجاز سے واپسی کے بعد آپ کی حالت کو دیکھ کر یہ محسوس کرتے تھے کہ پہلی بات ان کی باقی نہیں رہتی ہے شاہ عبدالعزیز کے اپنے الفاظ یہ ہیں۔

﴿چنانچہ مستفیضان سابق ہرگز نسبت سابق نمی کروند﴾
 ”چنانچہ جن لوگوں نے شاہ صاحب سے پہلے فیض پایا تھا۔ (یعنی شاگرد و مرید) وہ پہلی نسبت کا آپ میں بالکل احساس نہیں کرتے تھے۔“

خلاصہ یہ ہے کہ ہندوستان کا ایک مصیبت زدہ مسافر حجاز پہونچا تھا۔ اخلاص و صداقت کے ساتھ پہونچا تھا جو رنگ لا کر رہا۔ خود شاہ ولی اللہ کا بیان ہے کہ جب مدینہ منورہ کی حاضری کی سعادت نصیب ہوئی تو۔

﴿دران میاں بروضہ منورہ حضرات سید البشر علیہ افضل الصلوات و اتم التحیات متوجہ شد و فیضہا یافت۔﴾ (انفاس)
 ”اس عرصہ میں حضرت سید البشر (علیہ افضل الصلوات و اتم التحیات) کے روضہ

منورہ کی طرف متوجہ رہتا تھا اور اس سے بڑے بڑے فیض حاصل کئے۔“

ان ہی ”فیضہا“ کی شرح و تفصیل میں شاہ صاحب نے ایک مستقل کتاب ”فیوض الحرمین“ ارقام فرمائی ہے شاہ صاحب کے ساتھ کیا کیا نوازشیں ہوئی ہیں۔ ان کی تفصیل اسی کتاب میں پڑنا چاہیے مجھے تو اس وقت صرف یہ کہنا ہے کہ مرہٹوں کے فتنہ کا ازالہ اور آئندہ ہندوستان کے مسلمانوں کے متعلق جو سوالات پیدا ہوئے تھے اور پیدا ہونے والے تھے ان کے جو جوابات اور ان مشکلات کا جو حل شاہ ولی اللہ کے قلم نے پیش کیا یہ درحقیقت انہی مدنی ”فیضہا“ کا کرشمہ تھا۔۔۔ اور شاہ صاحب نے اسی فیض الحرمین ہی میں اپنے متعلق جو یہ دعویٰ کیا کہ۔

﴿سَلَكَنِي رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَرَبَانِي

بَيِّدُهُ فَإِنَّا أَوْيَسْمِيهِ وَتَلْمِيزُهُ بِلَا وَاسِطَةٍ بَيْنِي وَبَيْنَهُ﴾

(فیوض الحرمین ص ۴۴)

”مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خود سلوک کا راستہ طے کرایا اور اپنے دست مبارک سے میری تربیت فرمائی۔ اس لئے میں آپ کا ادیسی ہوں اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا بالواسطہ شاگرد ہوں۔ تو اس کی حقیقت بھی ان فیوض پر غور کرنے سے کھل جاتی ہے۔“

﴿سفر حجاز کے بعد شاہ صاحب کی زندگی کا خاص دور﴾

بہر حال شاہ صاحب میں جو نشہ حجاز میں بھرا گیا تھا۔ اس سے مست ہو کر جب وہ ہندوستان واپس ہونے لگے ہیں۔ اس وقت ان کے دل میں کن کن ولولوں کا زور تھا اور کن حوصلوں کو لے کر چلے تھے۔ انفاس العارفین کے ایک واقعہ سے اس کا اندازہ ہوتا ہے۔ اپنے سب سے بڑے شیخ الحدیث علامہ ابوطاہر محمد بن ابراہیم الکروی المدنی سے جب آخری دفعہ رخصت ہونے کے لئے ملنے تشریف لے گئے تو خود فرماتے ہیں۔

﴿اِسْ فَقِيرٌ بَرَاءٌ وَدَاعٌ نَزْدِيكَ شَيْخُ ابِوطَاهِرٍ رَفَّتْ اِیْسُ بَيْتِ بَرْخَوَانْدَم۔﴾

”فقیر رخصت ہوتے وقت شیخ ابوطاہر کے پاس حاضر ہوا اور یہ شعر میں نے پڑھا۔“

نسیت کل طریق کنت اعرفه

الا طریقاً یو دینی الی ربکم

”ہر راہ میں بھول گیا بجز اس راہ کے جو تمہارے گھر تک مجھے پہنچائے کسی ایسے حال سے

معمور ہو کر شاہ صاحب نے یہ شعر پڑھا کہ۔“

﴿بہ مجر و شنیدن آں بکا بر شیخ غالب آمد و بغایت متاثر شد۔﴾

”سننے کے ساتھ پر گریہ طاری ہوا اور بہت زیادہ متاثر ہوئے۔“

الغرض ہر چیز سے دست بردار ہو کر صرف ایک ”نصب العین“ کو سامنے رکھ کر انہوں

نے ہندوستان کی زمین پر قدم رکھا وہ سالہا سال کا پرانا اور موڑوٹی ذوق درس و تدریس قطعاً

غائب ہو چکا تھا۔ مدرسہ چونکہ باقی تھا اور اس کو باقی رکھنا چاہتے تھے۔ آپ کے نام پر طلبہ آیا

کرتے تھے لیکن اب جو کام پیش نظر تھا اس کے ساتھ ”معلم الصبیانی“ کی زق زق بق بق کی

گنجائش نہ تھی۔ شاہ عبدالعزیز صاحب فرماتے ہیں کہ بجائے خود پڑھانے کے

﴿حضرت والد ماجد از ہر یک فن شخصے تیار کردہ بودند و طالب ہر فن باوے می سپرند﴾

”والد ماجد نے ہر فن کیلئے ایک شخص تیار کر لیا تھا۔ جس فن کا جو طلب ہوتا اس

کو اسی فن کے استاد کے سپرد فرما دیتے۔“

غالباً ”دوازوہ سالہ تدریس“ کے یہ تیار کئے ہوئے لوگ تھے اب مدرسہ ان ہی کے سپرد تھا

اور خود اپنے لئے کہا مشغلہ باقی رکھا تھا کل تین چیزیں جیسا کہ شاہ عبدالعزیز کا بیان ہے۔

﴿خود مشغول معارف گوئی و نویسی بودند۔ حدیث می خوانیدند۔﴾

”خود معارف کے بیان کرنے اور لکھنے کا کام کرتے اور صرف حدیث

پڑھاتے۔“

کسی ذوق، کسی شوق، کسی اہتمام و استغراق کے ساتھ حجاز سے واپسی کے بعد ان تین

مشغلوں میں شاہ صاحب نے زندگی گزاری۔ اس کے متعلق بھی شاہ عبدالعزیز صاحب کی

عجیب و غریب شہادت ہے۔ فرماتے ہیں۔

﴿بعد اشراق کہی نشست تا دو پہر زانو بدل نمی کرد و خارش نمی نمود و آب دہن

نمی انداخت﴾ (ص ۴۳)

”اشراق کے بعد جو بیٹھ جاتے۔ تو دو پہر تک نہ زانو بدلتے نہ کھجالتے نہ دہن

مبارک سے تھوک پھینکتے۔“

﴿ولی اللہ فیوض کی وسعت و نوعیت﴾

شاہ صاحب ۱۱۴۶ھ میں حجاز سے ہندوستان واپس ہوئے اور اپنے کام میں مشغول ہوئے۔ ٹھیک چار سال بعد دلی کی زمین پر نادر گری کا وہ آسمان ٹوٹا۔ جس کے خونی انسانوں سے اب تک ملک کے کوچہ و بزرگ معمور ہیں۔ لیکن شاہ صاحب پر جو دھن سوار تھی اس حادثہ کا بھی ان پر کوئی اثر نہیں پڑا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نادر ہی کے چلے جانے کے بعد محمد شاہ نے طلباء کے ہجوم و کثرت یا کسی اور سبب سے بجائے پرانی دلی کے نئے شہر میں خود بلا کر مدرسہ کے لئے وہ حویلی عطا کی جس کا ذکر پہلے گزر چکا ہے اور اسی مدرسہ سے علم کا وہ سیل جوار جاری ہوا کہ آج عرب و عجم میں کم از کم علم حدیث کا جو زور و شور ہے بالواسطہ یا بلاواسطہ اس کی انتہا حضرت شاہ ولی اللہ ہی کے مخلصانہ مجاہدوں پر ختم ہوتی ہے۔ مولانا محمد قاسم رحمۃ اللہ علیہ سے امیر شاہ خاں نے ایک واقعہ نقل کیا ہے کہ سفر حج میں حضرت کا جہاز یمن کے ساحل کے کسی بندرگاہ پر ٹھہر گیا۔ معلوم ہوا کہ ابھی چند دن رکا رہے گا حضرت نانوتوی کو کسی نے خبر دی کہ اس بندرگاہ کے شہر میں ایک کہنہ سال معمر بزرگ محدث رہتے ہیں۔ ان کی ملاقات کو حضرت تشریف لے گئے۔ مل کر مولانا نانوتوی ان کے علم سے بہت متاثر ہوئے اور درخواست کی کہ حدیث کی سند اجازت ہو۔ اس پر محدث صاحب نے پوچھا تم کس کے شاگرد ہو؟ انہوں نے اپنے استاد مولانا عبدالغنی مجددی کا نام لیا محدث صاحب ناواقف تھے۔ پوچھا عبدالغنی کس کے شاگرد تھے؟ جواب ملا شاہ اسحاق کے۔ شاہ اسحاق سے بھی وہ ناواقف تھے۔ پوچھا وہ کس کے شاگرد تھے؟ کہا شاہ عبدالعزیز صاحب کے شاہ عبدالعزیز کا نام سن کر محدث صاحب رکے۔ بولے ان کو میں جانتا ہوں اور اسکے بعد فرمایا۔

﴿ایک یمنی محدث کی شہادت﴾

شاہ ولی اللہ طوبیٰ کا درخت ہے جس طرح جہاں جہاں طوبیٰ کی شاخیں ہیں وہاں جنت ہے اور جہاں اس کی شاخیں نہیں وہاں جنت نہیں ہے۔ یوں ہی جہاں شاہ ولی اللہ کا سلسلہ ہے وہاں جنت ہے اور جہاں ان کا سلسلہ نہیں ہے وہاں جنت نہیں ہے۔“ (ص ۱۵۰)

اور یہ تو یمن کے ایک گم نام محدث کی شہادت ہے اس موقع پر جی چاہتا ہے کہ پھر الازہر

کے ہم وطن علامہ رشید رضا مصری مرحوم کا قول ذرا زیادہ تفصیل سے نقل کر رہے ہیں اس کا بھی اندازہ ہوگا کہ حضرت حسن علیہ السلام کے دست مبارک میں جو ٹوٹا ہوا قلم تھا اس کا کیا مطلب تھا علم خصوصاً علم نبوت کی حالت اسلامی ممالک میں کیا ہو رہی تھی۔

علامہ رشید رضا مصری کا بیان ہے کہ اس زمانہ میں علم حدیث صرف ہندوستانی علماء کی توجہ سے زندہ ہے۔

﴿وَلَرَعْنَا يَتَبَخَّرُنَا عَلَمَاءُ الْجَنْدِ بِعِلْمِهِمَا الْحَدِيثِ فِي هَذَا
لِعَصْرِ تَقْضَىٰ عَلَيْهَا بِالزَّوَالِ مِنْ أَمْصَارِ الشَّرْقِ فَقَدْ ضَعُفَتْ فِي
مِصْرَ وَالشَّامِ وَالْعِرَاقِ وَالْحِجَازِ مِنْذَ الْقَرَاءِ الْعَاشِرِ لِلْهِجْرَةِ حَتَّى
بَلَغَتْ مِنتَهَى الضَّعْفِ أَيْ أَوَائِلَ هَذَا الْقُرْآنِ الرَّابِعِ عَشَرَ وَأَنْتَى
لَمَّا هَاجَرْتَ إِلَى مِصْرَ ١٣١٥ هـ (أَيْتَ خُطْبَاءِ مَا جَدَّ الْآزْهَرِ
وغيره يذكرون الاحاديث في خطبهم غير منخرجه ومنها
الضعيف والنكر والموضوع و مثلهم في هذه الرعلظ و الهد
رسون و مصنفوا الكتب فكنت انكر ذلك عليهم كما بدت
بنكار مثله على اهل بلدى طرابلس قبلهم﴾

”ہمارے ہندوستانی بھائیوں میں جو علماء ہیں اگر حدیث کے علوم کے ساتھ اس زمانہ میں ان کی توجہ نہ ہوتی تو مشرقی ممالک سے یہ علم ختم ہو چکا ہوتا کیونکہ مصر، شام، عراق، حجاز میں دسویں صدی ہجری سے یہ علم ضعف کا شکار ہو چکا تھا اور چودھری صدی کے اوائل تک ضعف کی آخری منزل پر پہنچ گیا تھا میں نے جب ۱۳۱۵ھ ہجری میں مصر ہجرت کی تو اہر کی مسجدوں کے خطیبوں کو اور دوسری مسجدوں کے خطیبوں کو دیکھا۔ کہ اپنے خطبوں میں ایسی حدیثیں پڑھتے ہیں جن کا پتہ نہیں۔ ان میں ضعیف، منکر اور موضوع جعلی روایتیں بھی

ہوتی ہیں اور یہی حال دواعظوں، مصنفوں، مدرسوں سب کا تھا۔ میں ان کو ٹوکتا تھا جیسا کہ اپنے وطن طرابلس میں بھی یہی کرتا“ (مقدمہ مفتاح کنوز اسدیتہ)

یہ مصر کے ایک فاضل جلیل اور چودھویں صدی کے ایک ناقد بصیر کی گواہی ہے جس سے ثابت ہو رہا ہے کہ کسی ایک ملک میں نہیں بلکہ مصر، شام، عراق، حجاز جو اسلام کے گہوارے ہیں ان سب میں دسویں صدی سے مسلمانوں کا یہی حال ہو گیا تھا اور کسی ایک طبقہ ہی میں جہل کی حکومت قائم نہیں تھی بلکہ دین و علم کے جو جو گروہ خادم تھے یعنی واعظ، خطیب، مدرسین و معلمین حتیٰ کہ مصنفین و مؤلفین سب ہی کے متعلق لکھتے ہیں کہ وہ نبوت کے علم سے بے پروا ہو چکے تھے۔ غلط سلط غیر معتبر اور گڑھی ہوئی حدیثوں پر لوگوں کا داز و مدار رہ گیا تھا شاہ ولی اللہ صاحب کو علم نبوت (حدیث) کے اسی حال کا تمثیل اگر ایسے قلم کی شکل میں ہوا جس کی نوک ٹوٹی ہوئی تھی۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اس سے بہتر مثال اور کیا ہو سکتی تھی۔ اور جب مصر و حجاز، عراق و شام جیسے ممالک علم حدیث سے دسویں صدی ہجری تک بے تعلق سے ہو گئے تھے تو پھر خراسان، ترکستان، ایران وغیرہ جہاں ایک مدت سے اس ”علم“ کا چرچا مٹ چکا تھا ان کی جو حالت ہوگی وہ ظاہر ہے۔

علامہ رشید کا یہ اقرار کہ ”اگر علماء ہند کی توجہ اس علم کی طرف نہ ہوتی تو اس علم کا مشرقی ممالک میں خاتمہ ہو جاتا۔“ سب جانتے ہیں کہ یہ علماء ہند کی نہیں بلکہ براہ راست حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت کا اعتراف ہے۔ اس لئے کہ ہندوستان میں حدیث کا جو کچھ بھی چرچا پچھلے دنوں ہوا سب کی انتہا بالا خر حضرت شاہ صاحب ہی کے وجود باوجود پر ہوتی ہے۔ گویا شاہ صاحب کو حسین علیہا السلام نے جو قلم عطا فرمایا تھا یہ دراصل اسی قلم کے کارناموں کا اقرار ہے کیونکہ شاہ صاحب کے وہ سارے علمی مجاہدات جن کے اثر سے بالآخر اس ملک میں حدیث کے فن کو اتنی اہمیت حاصل ہو گئی ان کا تعلق اسی قلم سے ہے۔ انہوں نے اس سلسلہ میں جو کچھ کیا اسی قلم کے ملنے کے بعد کیا۔ بلکہ عوام تو شاید خواب کے اس قم کو خواب و خیال والا قلم خیال

کرتے ہوں گے لیکن جس شخص کا خود ذاتی مشاہدہ تھا کہ ان کے والد حضرت شاہ عبدالرحیم کو خواب ہی میں دربار رسالت پتا ہی سے محاسن (ڈاڑھی مبارک) کے دو بال عطا ہوئے تھے۔ شاہ ولی اللہ کا بیان ہے کہ حالت بیداری میں یہ دونوں موئے مبارک ان کے والد کو ملے جو ایک مدت تک خود ان ہی کے پاس رہے اور جب تبرکات تقسیم ہونے لگے تو

﴿یکے ازاں دو موئے بکاتب حروف عنایت فرمودند۔﴾ (انفاس ص ۴۱)
 ”تو ان دو موئے مبارک میں سے ایک موئے مبارک کاتب حروف کو عنایت فرمایا۔“

حضرت شاہ ولی اللہ کی تصنیف کی ایک خاص خصوصیت ان کے صاحبزادے شاہ عبدالعزیز نے جو یہ بیان فرمائی کہ۔

﴿بعد مراقبہ ہرچہ بکشف می رسیدی نگاشتند﴾ (ملفوظات ص ۴۰)
 ”کہ مراقبہ کے بعد جو چیز کشفی طور پر آپ کو معلوم ہوتی ہے اسے ارقام فرماتے تھے۔“

”کون کہہ سکتا ہے کہ“ اس مراقبہ میں شاہ صاحب کا رخ کس طرف ہوتا تھا اور اس سے کیا مقصود تھا۔ ان تصانیف کے لئے آپ کو جس مقام سے قلم ملا تھا۔ اسی طرف توجہ کر کے بیٹھ جاتے یا خواب والے قلم کو پھر اپنے اندر بیدار کرتے تھے یا اس کے سوا کوئی اور چیز آپ کے پیش نظر تھی۔ بہر حال اس سے اتنا تو ضرور معلوم ہوتا ہے کہ شاہ صاحب کی کتابوں کا ڈھنگ جو نرا لا معلوم ہوتا ہے اس میں ان کی تصنیف و تالیف کی ان خاص خصوصیتوں کو بھی ضرور دخل ہے بلکہ شاہ صاحب کی عبارت میں جیسا کہ عرض کر چکا ہوں۔ ”جوامع الکلم“ کی جھلک جو نظر آتی ہے اس میں بھی قصد سے زیادہ ان کے اسی طریقہ عمل کو شاید دخل ہو۔

الغرض سفر حجاز سے واپس ہونے کے بعد جیسا کہ اپنے استاد سے رخصت ہوتے وقت فرمایا تھا اور غالباً اسی کا ترجمہ شاہ عبدالعزیز نے یہ فرمایا ہے جو ان کے ملفوظات میں منقول ہے

کہ:-

﴿پدر من وقت رخصت از مدینہ از استاد خود عرض کرو وادخوش می شد کہ ہرچہ خواندہ بودم فراموش کردم الا علم دین یعنی حدیث﴾ (ص ۹۳)
 ”کہ میرے والد نے مدینہ منورہ سے رخصت ہوتے ہوئے اپنے استاد سے عرض کیا اور استاد اس سے بہت خوش ہوئے کہ میں نے جو کچھ پڑھا تھا بجز علم دین یعنی حدیث کے بھلا دیا۔“

من آنچہ خاندہ ایم فراموش کردہ ایم۔

الاحدیث یار کہ تکرار می کنیم

گویا..... ”جو لکھا پڑھا تھا نیاز نے سو وہ ایک دم میں بھلا دیا۔ اب ان کا مشغلہ صرف یہی رہ گیا تھا کہ متوسلین و تلامذہ کے سامنے اسرار و حقائق پر تقریر فرماتے رہتے تھے یا حدیث کا درس دیا کرتے تھے یا لکھتے رہتے اور اس شان کے ساتھ لکھتے رہتے تھے کہ ہر مسئلہ ”مراقبہ“ کے بعد درج کتاب ہوتا ہے حدیث کے ساتھ ساتھ شاہ صاحب کے درس کا ایک جز اور بھی تھا۔ جس کا ذکر شاہ عبدالعزیزی نے دوسرے مقام پر فرمایا ہے۔ فرماتے ہیں کہ۔

﴿معمول والد ماجد آں بود کہ بعد ختم قرآن حدیث می شد ص ۷﴾

”والد ماجد کا معمول یہ تھا کہ ختم قرآن کے بعد حدیث کا دورہ شروع

کراتے۔“

جس سے یہ ظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ صحاح کا درس جس کا نام اس زمانہ میں ”دورہ حدیث“ پڑ گیا ہے۔ اس سے پہلے شاہ صاحب قرآن کا دورہ بھی کرا لیا کرتے تھے اور بغیر تفسیر کے مجر متن قرآن پڑھانے کی تردیح کم از کم ہندوستان میں شاہ ولی اللہ ہی کی ایجاد ہے۔ اگرچہ افسوس ہے کہ اب مدارس خصوصاً دلی الہی مدارس میں بھی یہ طریقہ ترک کر دیا گیا اور محض ان حلقوں تک جن میں (یہ تردیح) باقی رہ گئی ہے آپ نے وصیت نامہ میں طریقہ تعلیم کے متعلق جو ایک ”نظام

نامہ ”مرتب فرمایا ہے اس میں فرماتے ہیں کہ۔

﴿متن قرآن کے درس کے متعلق شاہ صاحب کی ہدایت﴾

﴿قرآن عظیم درس گوئند باں صفت کہ صرف قرآن بخواند بغیر تفسیر و ترجمہ گوید و در آنچہ مشکل باشد در نحو یا در شان نزول متوقف شود و بحث نماید۔ بعد فراغ از درس تفسیر جلالین را بقدر درس بخواند دریں طریقت فیض ہاست﴾

”قرآن عظیم کا درس دینا چاہیے اس طریقہ سے کہ صرف قرآن پڑھا جائے یعنی تفسیر کے بغیر صرف متن قرآن اور ترجمہ پڑھا جائے۔ پھر قرآن کے متن کے متعلق جو دشواری پیش آئے مثلاً نحو کے متعلق یا شان نزول کے متعلق تو رک جانا چاہیے کہ اس کی تحقیق کی جائے پھر جب قرآن ختم ہو جائے تب نصاب تک جلالین پڑھائی جائے اس طریقہ میں بڑے بڑے فیض ہیں۔“

واقعہ ہے کہ آج جتنا زور عربی مدارس کے قدیم سلسلوں میں حمد اللہ اور میرزا ہد کی عبارتوں کے حل پر دیا جاتا ہے یا نئے مدرسوں میں ادب و انشاء وغریہ میں سرمارا جاتا ہے اگر اسی وقت کو قرآنی آیات کے حل ہی میں صرف کیا جائے تو جو کتاب صرف مغز ہی مغز ہے اس سے علماء اور طلباء کو کیسے کچھ فیض پہنچ سکتے ہیں۔ تفسیروں کے درس میں عموماً آدمی حق تعالیٰ کے کلام سے ہٹ کر پھر اپنے ہی جیسے انسانوں کی تعبیروں میں الجھ جاتا ہے اور اسی کے مشکلات میں اتنا وقت صرف ہو جاتا ہے کہ قرآنی آیات کی طرف توجہ کرنے کا موقعہ ہی نہیں ملتا۔ صرف قرآن کے پڑھانے سے آدمی پر عجیب و غریب حقائق کا انکشاف ہوتا ہے شاہ عبدالعزیز صاحب نے اس کے متعلق بڑے تجربہ کی بات فرمائی ہے کہ۔

﴿مرر ماں چنانچہ در قرآن متلذذ می شوند در حدیث نہ۔ و ما را ہم چنانچہ در قرآن معنی ہائے عجیب و غریب دست می دهد آدمی باشد در حدیث نہ۔ در حدیث موافق کتب بیان می کنم﴾ (ص ۷)

”لوگ جتنا قرآن سے لذت گیر ہوتے ہیں اتنی لذت ان کو حدیث میں نہیں ملتی اور خود ہمارا حال بھی یہی ہے کہ جتنے عجیب و غریب مطالب قرآن میں ہاتھ آتے ہیں اور اس میں آمد معلوم ہوتی ہے۔ حدیث میں یہ بات حاصل

نہیں ہوتی۔ حدیث کے درس میں تو وہی بیان کرتا ہوں جو کتابوں میں ہے۔“
جس کا مطلب یہی ہوا کہ قرآن میں جب تذکرہ کیا جاتا ہے تو بغیر کتابی امداد کے خود بخود مطالب کے دروازے کھلتے چلے جاتے ہیں۔ بخلاف حدیث یا کسی دوسرے فن کے کہ اس کے درس میں عموماً شرح و حواشی کی ہی ریزہ چینی ہوتی ہے۔

﴿شاہ صاحب کے باقیات صالحات﴾

حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق جو کچھ میں لکھنا چاہتا تھا خدا کا شکر ہے کہ وہ لکھا جا چکا۔ اب آپ کے ”باقیات صالحات“ اولاد امجاد کے مختصر تذکرہ پر اس سلسلہ کو ختم کرنا چاہتا ہوں۔ سب ہی کو معلوم ہوگا کہ شاہ صاحب قدس سرہ کو حق تعالیٰ نے علاوہ اس اولاد کے جو صغیر سی ہی میں وفات پا کر آپ کے لئے ”اجرو زخر“ بن چکی تھی چار فرزند عطا فرمائے تھے جو فرزند ہی نے علاوہ آپ کے صحیح جانشین بھی تھے۔ یعنی شاہ عبدالعزیز شاہ رفیع الدین شاہ عبدالقادر شاہ عبدالغنی۔

﴿وفات سے پہلے چاروں صاحبزادوں کی خلافت﴾

شاہ صاحب نے اس دنیا سے جاتے وقت باضابطہ طور پر بھی ان چاروں حضرات کو اپنا جانشین (خليفة) بنایا تھا۔ شاہ عبدالعزیز کے ملفوظات ہی میں ہے کہ وفات سے تھوڑی دیر پہلے۔
﴿حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی برسر ہر چہار فرزند ان نہادہ ابوہند۔﴾
”آپ نے چاروں فرزندوں کے سروں پر دستار مبارک رکھ دی تھی یا باندھ دی تھی۔“

جس کا مطلب یہی ہوا کہ حضرت نے اپنے چاروں صاحبزادوں کو اپنا خلیفہ و جانشین قرار دیا۔ یہاں سوچنے بلکہ عبرت کی ایک چیز ہے کہ اسی دلی میں ایک دیندار بادشاہ نے اپنے چند بیٹوں کو اسی طرح دنیا میں اپنا جانشین قرار دیا تھا جیسا کہ مورخ فرید آبادی رقمطراز ہیں کہ۔
”اورنگ زیب نے اپنی زندگی میں بڑے بیٹے محمد معظم کو شمالی ہند اور کابل کی حکومت سونپ دی تھی وسط ہند گجرات باپ کے چہیتے بیٹے محمد اعظم کے زیر انتظام تھے اور جنوبی ہندوستان شہزادہ کام بخش کے حوالہ کر دیا گیا تھا۔“

فرید آبادی اس کے بعد اپنی رائے کا اظہار ان الفاظ میں کرتے ہیں کہ:-

”اسی انتظام کے مطابق وہ سلطنت کو اپنے بیٹوں میں تقسیم کرنا چاہتا تھا۔“

لیکن دنیا کے ان تین بادشاہوں نے ہندوستان اور کابل جیسے وسیع و عریض علاقوں میں اپنے لئے گنجائش نہ پائی اور اس کے بعد جو کچھ ہوا۔

﴿شاہ صاحب کے چاروں صاحبزادوں کے باہمی تعلقات﴾

لیکن اسی دلی میں دین کا ایک سردار اپنے تین نہیں بلکہ چار بیٹوں کے سر پر خلافت کی دستار باندھتا ہے پھر دین کے ان چار شہزادوں نے زندگی کس طرح گزاری اس کا اندازہ ان تعلقات سے ہو سکتا ہے جو ان چاروں بھائیوں میں آخر عمر تک باقی رہے! امیر شاہ خاں کا بیان ہے کہ:-

شاہ عبدالقادر کا کھانا اکبری مسجد روزانہ شاہ عبدالعزیز ہی کے گھر سے جاتا تھا۔ وہی اپنے اس متوکل بھائی کے کپڑے بنا دیا کرتے تھے۔ شاہ عبدالعزیز باوجود بڑے ہونے کے شاہ عبدالقادر کی ولایت کے کس حد تک قائل تھے۔ اس کے متعلق وہی مشہور بات کہ عید کا چاند تیس کا ہو گا یا انتیس کا۔ اس کا پتہ چلانے کے لئے ہمیشہ حضرت شاہ عبدالعزیز رمضان کی پہلی تاریخ کو آدمی بھیج کر دریافت کراتے کہ:-

”میاں عبدالقادر نے آج کے سپارے پڑھے ہیں؟ اگر آدمی یہ آ کر کہتا کہ

آج دو پڑھے ہیں تو شاہ صاحب فرماتے کہ عید کا چاند تو انتیس ہی کا ہو گا۔

یہ بات دوسری ہے کہ ابر و غیرہ کی وجہ سے دکھائی نہ دے اور حجت شرعی نہ

ہونے کی وجہ سے ہم رویت کا حکم نہ لگا سکیں۔“ (امیر الروایات ص ۱۰۵)

علی ہذا شاہ رفیع الدین رحمۃ اللہ علیہ سے شاہ عبدالعزیز کو جو دلی تعلق تھا اس کا اندازہ بھی اس واقعہ سے ہو سکتا ہے کہ جب شاہ رفیع الدین کو لوگ دفن کر کے فارغ ہوئے اس وقت حضرت شاہ عبدالعزیز نے ایک خاص کیفیت کے ساتھ ارشاد فرمایا کہ:-

﴿میرا چار رشتہ بود یکے برادر حقیقی و دم قبلہ گا ہی (حضرت شاہ ولی اللہ) مرابہ

تقریبے دادند کہ فرزند تست سیومی شیردایہ من نوشیدہ چہارم شاگرد﴾

”رفیع الدین سے میرا چار طرح رشتہ تھا ایک تو حقیقی بھائی تھے دوسرے یہ کہ

قبلہ گا ہی (والد ماجد) نے ایک تقریب سے انہیں میرے سپرد کر کے کہا کہ یہ

تمہارا لڑکا ہے۔ تیسرے ہم نے اور انہوں نے ایک ہی دائی کا دودھ پیا تھا۔
چوتھے وہ میرے شاگرد تھے۔“

کسی نے اس سلسلہ میں عرض کیا کہ شاہ رفیع الدین سے اس خاندان کی بڑی علمی عزت تھی۔ شاہ عبدالعزیز نے اس وقت جو جملہ فرمایا وہ سچی اور خالص محبت کی کتنی اچھی تعبیر ہے فرمایا۔
﴿اگر جاہل ہم ہو وند مرا ہم چتاں در بورے﴾
”اگر وہ جاہل بھی ہوتے تو مجھے ان کا اسی قدر درد ہوتا۔“

جامع ملفوفات نے مولانا رفیع الدین کے جنازے کی کیفیت اور شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کا باوجود نابینا ہونے کے ان کی چار پائی اٹھانکی کوشش اور انتہائی ضبط کی کوشش کے باوجود بار بار بلبلا اٹھنا اور فرمانا کہ ”چہ گو ہم من طاقے ندارم“ ایک ایسے دردناک پیرایہ میں ان حالات کو بیان کیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ دونوں بھائیوں میں مودت و اخلاص کے کیسے مراسم تھے یہ عجیب بات ہے کہ ان چاروں بھائیوں کی وفات عجیب ترتیب سے ہوئی شاہ عبدالعزیز ہی قول جامع ملفوفات نے یہ نقل کیا ہے کہ۔

﴿چاروں صاحبزادوں کی وفات میں عکسی ترتیب﴾

﴿ترتیب منعکہ در رحلت برادران واقع شد یعنی اول مولوی عبدالغنی کہ خورد
تریں ہمہ باو بووند بغداد از اں مولوی عبدالقادر از و شان بعد مولوی رفیع الدین
کلاں سال از و شان ہستم باری ماست۔﴾
”الٹی ترتیب بھائیوں کی وفات میں واقع ہوئی اول مولوی عبدالغنی کہ سب
سے چھوٹے تھے اس کے بعد مولوی عبدالقادر اور ان کے بعد مولوی رفیع

الدین سب سے بڑا میں ہوں۔ اب میری باری ہے۔“

واقعہ یہ ہے کہ اپنے اپنے دائرہ عمل میں حضرت شاہ ولی اللہ کے ان چاروں صاحبزادوں نے بڑے باپ کے بیٹے ہونے کی شان کو بوجہ کمال آخر عمر تک باقی رکھا۔ شاہ عبدالغنی چھوٹے صاحب نے تو کم عمر پائی لیکن ان کی تلافی قدرت نے ان کے ”بجل رشید“ حضرت شہید رحمۃ اللہ علیہ سے فرمادی۔ ناظرین ”الفرقان“ جن کے حالات سے شہید نمبر کے ذریعے سے واقف ہو چکے ہیں ادھر یوں بھی علم دین کے دائرہ کا ایسا کون ہے جو ان سے اور ان کے محیر

العقول (مدہوش کارناموں سے تھوڑا بہت واقف نہیں ہے۔ شاہ عبدالقادرؒ نے اپنی زندگی کا اکثر حصہ اگرچہ عزلت میں گزار دیا لیکن صرف امیر شاہ صاحب کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کی ایک صاحبزادی تھیں۔ کل جائیداد زندگی ہی میں ان کی صاحبزادی اور دوسرے بھائیوں پر تقسیم فرما کر اکبر آبادی مسجد کی ایک سہ ذری میں اپنی زندگی بسر کر دی۔ شاہ رفیع الدین رحمۃ اللہ علیہ اور شاہ عبدالعزیزؒ دونوں مقابل ہوئے جن میں شاہ عبدالعزیزؒ کی کوئی زینہ اولاد نہ ہوئی۔ صرف تین صاحبزادیاں تھیں اور شاہ رفیع الدین کے چار لڑکے مولوی موسیٰ، مولوی عیسیٰ مولوی مخصوص اللہ مولوی حسن جان ہوئے۔ ان میں سے مولوی عیسیٰ صاحب کی شادی شاہ عبدالعزیزؒ کی ایک صاحبزادی سے ہوئی اور بقیہ صاحبزادیوں میں سے ایک مولوی افضل صاحب اور دوسری مشہور رفیق شہید مولانا عبداللہ الخلیف المجاد سے ہوئی تھی۔ مولوی افضل ہی کے دو صاحبزادے یعنی شاہ محمد اسحاق ولد شاہ محمد یعقوب صاحب ولی اللہی خاندان کے آخری یادگار دلی میں رہ گئے تھے جب مسلمانوں کی دلی دلی ہونے کی خصوصیت کو قطعی طور پر کھو چکی تو دونوں بھائی ۱۲۵۰ھ میں اپنے اہل و عیال کے ساتھ حجاز ہجرت کر گئے اور اسی سرزمین پاک میں ہندوستان کے یہ علمی خزانے مدفون ہیں۔ شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے مدرسہ کا کچھ حاصل پہلے گزر چکا ہے۔ آخر میں چاہتا ہوں کہ دلی ہی کے ایک چشم دید گواہ کے بیان کو جو اس خاندان اور اس مدرسہ کے متعلق ہے۔ درج کر کے اس مقابلہ کو ختم کر دوں گا۔ کہ ان فی ذالک لعیبرۃ۔

قنانک من ذکر حبیب و منزل

﴿شاہ ولی اللہ کے مدرسہ کا حال اور عذر میں اس کی بربادی﴾

دلی کے اس عجیب و غریب علمی و دینی خاندان اور اس خاندان کے دارالعلوم کا آخری انجام وہی ہوا جو ہر اس چیز کا ہے جس کا تعلق اس عبوری دور کی ابتدائی زندگی سے ہے۔ دہلی کے آثار اور مقامات کے ذاتی تجربہ کار مولوی بشیر احمد مرحوم اپنی کتاب دارالحکومت دہلی ہی میں لکھتے ہیں۔

جب شاہ (شاہ ولی اللہ) کے صاحبزادوں میں کوئی نہ رہا تو مولانا محمد اسحاق صاحب نے مدرسہ کی خدمت اپنے ڈھلی ۱۲۵۶ھ میں آپ نے ہجرت کی تو مولانا مخصوص اللہ صاحب اور مولانا موسیٰ صاحب خلف مولانا رفیع صاحب

مولانا رفیع الدین صاحب اس کی نگرانی فرمانے لگے ان حضرات نے بھی ۱۸۵۶ء میں انتقال فرمایا تو صرف مولانا محمد موسیٰ کے ایک صاحبزادے میاں عبدالسلام صاحب بہت صغیر سن رہے اور ایک صاحبزادی رہ گئیں خاندان بھر میں کوئی ایسا نہ تھا جو عبدالسلام صاحب کو لکھاتا پڑھاتا غرض یہ سلسلہ جو کئی پشت سے اس خاندان میں جاری تھا بند ہو گیا۔ غدر میں مکانات لوٹ لئے گئے گرا دیئے گئے کڑی تختے تک اٹھالے گئے خانہ خالی رادیومی گیر و ایک شریف گروہی تھی کہ الہی توبہ جس کی لاشی اس کی بھینس جس کا جس پر قابو چلا قابض ہو گیا۔ اب متفرق لوگوں کے مکان اس جگہ بن گئے ہیں مگر محلہ شاہ عبدالعزیز کے مدرسہ کے نام سے آج تک پکارا جاتا ہے اس خاندان میں سوائے ایک آدھ خاتون عصمت کے اور کوئی نام لیوا اور پانی دینے والا نہ رہا۔

مولوی بشیر مرحوم نے اس سے بھی زیادہ دردناک واقعہ ایک دوسری جگہ یہ درج کیا ہے کہ شاہ عبدالعزیز صاحب اپنی زندگی میں اپنے نواسوں مولانا محمد اسحاق اور مولانا یعقوب کو جو مکان بنوا کر دیئے تھے اور شاہ اسحاق صاحب نے ان میں کچھ دن درس دیا تھا۔ اب اس مدرسہ میں چھوٹے چھوٹے مکانات بن گئے ہیں۔ چوہان کسان وغیرہ غریب لوگ رہتے ہیں۔ یہیں ایک چھوٹی سی مسجد آپ ہی کے نام سے مشہور ہے جس میں آپ نماز پڑھتے تھے۔ اب چونکہ یہ کل جائیداد رائے بہادر لالہ شیو پرشاد صاحب کی ہے۔ اس لئے مولوی بشیر مرحوم نے اس کے بعد جو فقرہ لکھا ہے قلم اس کے لکھنے سے کانپتا ہے لکھتے ہیں کہ اس لئے۔

﴿دلی الہی دارالعلوم پر مدرسہ رائے بہادر لالہ رام کشن داس کا تختہ﴾

”اس گلی پر مدرسہ رائے بہادر لالہ رام کشن داس کا تختہ لگا دیا گیا ہے۔“ ج ۲ ص ۱۶۷
مسلمانان ہند کے لئے عموماً اور مسلمانان دہلی کیلئے خصوصاً اگرچہ یہ ایک شرمناک حادثہ ہے کہ ”مدرسہ مولانا محمد اسحاق“ پر مدرسہ رائے بہادر لالہ رام کشن داس کا تختہ لگا دیا گیا ہے۔“
لیکن خدا کی وہ بات کہ اللہ کی راہ میں مرنے والے مرتے نہیں (بل اخیاء ولكن لا تشعرون)

اب بھی پوی ہو رہی ہے شمال سے جنوب تک آج ہندوستان میں حدیث اور دارالحدیث کا جوچہ چا پھیلا ہوا ہے کوئی شبہ نہیں کہ ان ہی چند عشق بازوں کی عشق بازی کا نتیجہ ہے۔ و نعم ما قیل

از صدائے سخن عشق ندیدم خوش تر یادگارے کہ دریں گنبد دوار بہ ماند

﴿شاہ عبدالقادر کی سکونت گاہ اکبر آبادی مسجد﴾

حضرت شاہ مولانا عبدالقادر کی سکونت گاہ کے سلسلہ میں اکبر آبادی مسجد کا بھی ذکر آیا تھا جی چاہتا ہے کہ اس کا حال بھی کچھ اس کتاب سے اخذ کر کے آخر میں درج کر دوں انہی مولوی بشیر مرحوم کا بیان ہے کہ یہ مسجد فیض بنیاد اعزاز النساء بیگم محل شاہجہاں بادشاہ نے ۱۰۶۰ھ مطابق ۲۳ جلوس میں بنائی ہے۔ ان بیگم کا خطاب اکبر آبادی محل تھا اسی سبب سے یہ مسجد بھی اکبر آبادی محل تھا۔ اسی سبب سے یہ مسجد بھی اکبر آبادی مشہور ہو گئی۔ اس مسجد کے تین گنبد اور سات در ہیں مسجد کی عمارت ۶۳ گز طول میں اور سترہ گز عرض میں نری سنگ سرخ کی اور اس کا پیش طاق سنگ مرمر کا پچھلین کار ہے اور اس کے آگے ایک چبوترہ ۶۳ گز طول ستاون گز عرض اور تین گز اونچا اس پر سنگ سرخ کا کٹھرا لگا ہوا ہے اور اس کے آگے ایک حوض ۱۲ x ۱۲ گز کا چشمہ آفتاب و ماہتاب پر شرف لے جاتا ہے اور نہر کا پانی اس میں آتا ہے اس کے گرد حجرے بنے ہوئے ہیں۔ ۱۵۳ x ۱۰۴ گز اور ہر حجرے کے آگے ایک ایوان ہے اور اس کے سامنے سرتاسر چار گز عرض کا چبوترہ اور اس مسجد کے دو مینار بلند منجملہ ان کے شمالی مینار بجلی کے صدمے سے ٹوٹ گئی ہے۔“

معلوم نہیں مولوی بشیر مرحوم نے یہ عبارت کس کتاب سے نقل کی ہے غالباً ”آثار الصنا دید سید احمد خاں سے ماخوذ ہے۔ اس لئے کہ خود مولوی بشیر مرحوم کے زمانہ میں اس مسجد کا جو حال ہے اس کے متعلق وہی رقم طراز ہیں۔

”فیض بازار ہی میں یہ مسجد تھی جو غدر کے بعد ڈھایا ڈھوئی کی نذر ہوئی۔“

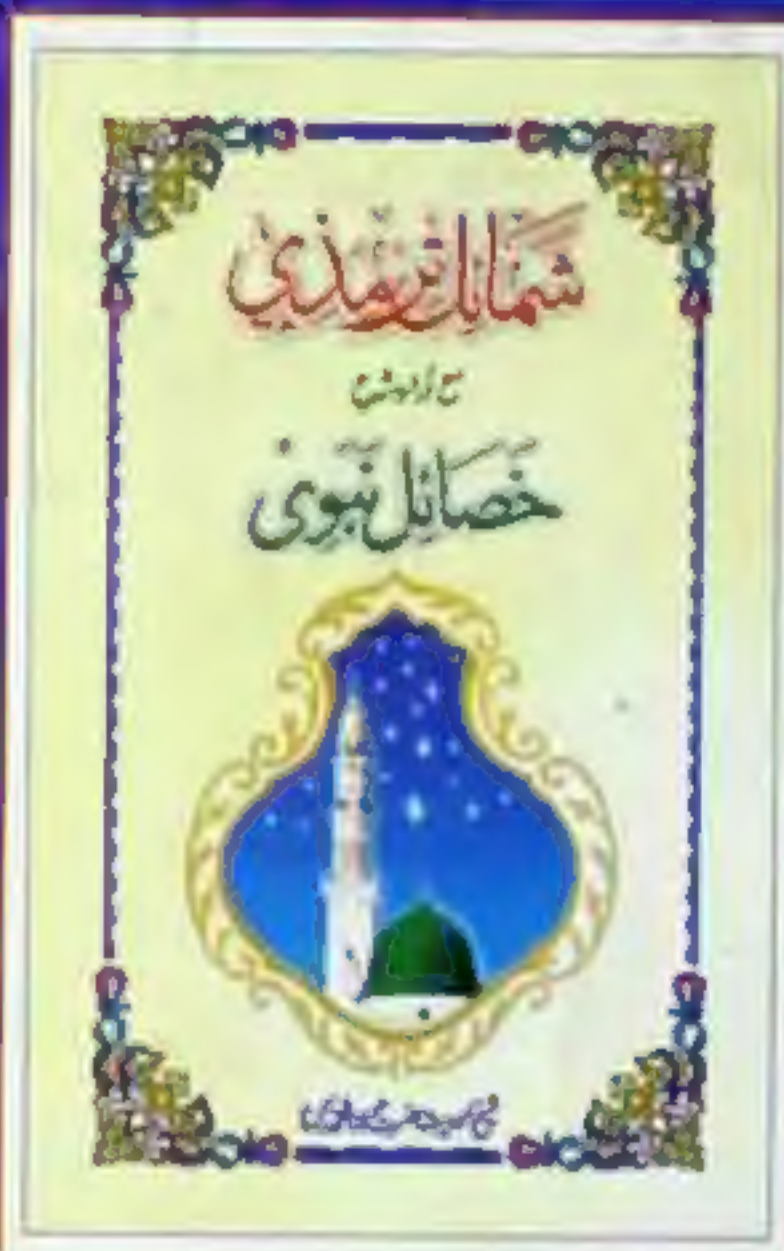
اور اب اس جلعے ہوئے ”دل“ کو کس خاک میں ڈھونڈنا چاہیے فرماتے ہیں۔ ”محل وقوع اس کا موجودہ ایڈورڈ پارک ہے۔“

آگے لکھتے ہیں ”جس وقت اس کے لئے زمین ہموار کی جانے لگی تو مسجد کا چبوترہ اور

بنیادیں جوں کی توں مثل گنج نہاں کے زمین میں مدفون تھیں ویسے ہی ڈھک دی گئی اور ہمیشہ ہمیشہ کے لئے خانہ خدا اور یہ بے نظیر عمارت نظروں سے پوشیدہ ہو گئی۔ انا للہ وانا علیہ راجعون۔ شاید کہنے والے نے اسی کے متعلق کہا تھا۔

جلا ہے جسم جہاں دل میں جل گیا ہو
کریدتے ہو اب راہ جستجو کیا ہے

ہماری اہم مطبوعات



Design by : M. Abid
Mobile : 0300-4338698

نورانی پبلشرز
اردو بازار، لاہور